پناہ گاہ

افسانے

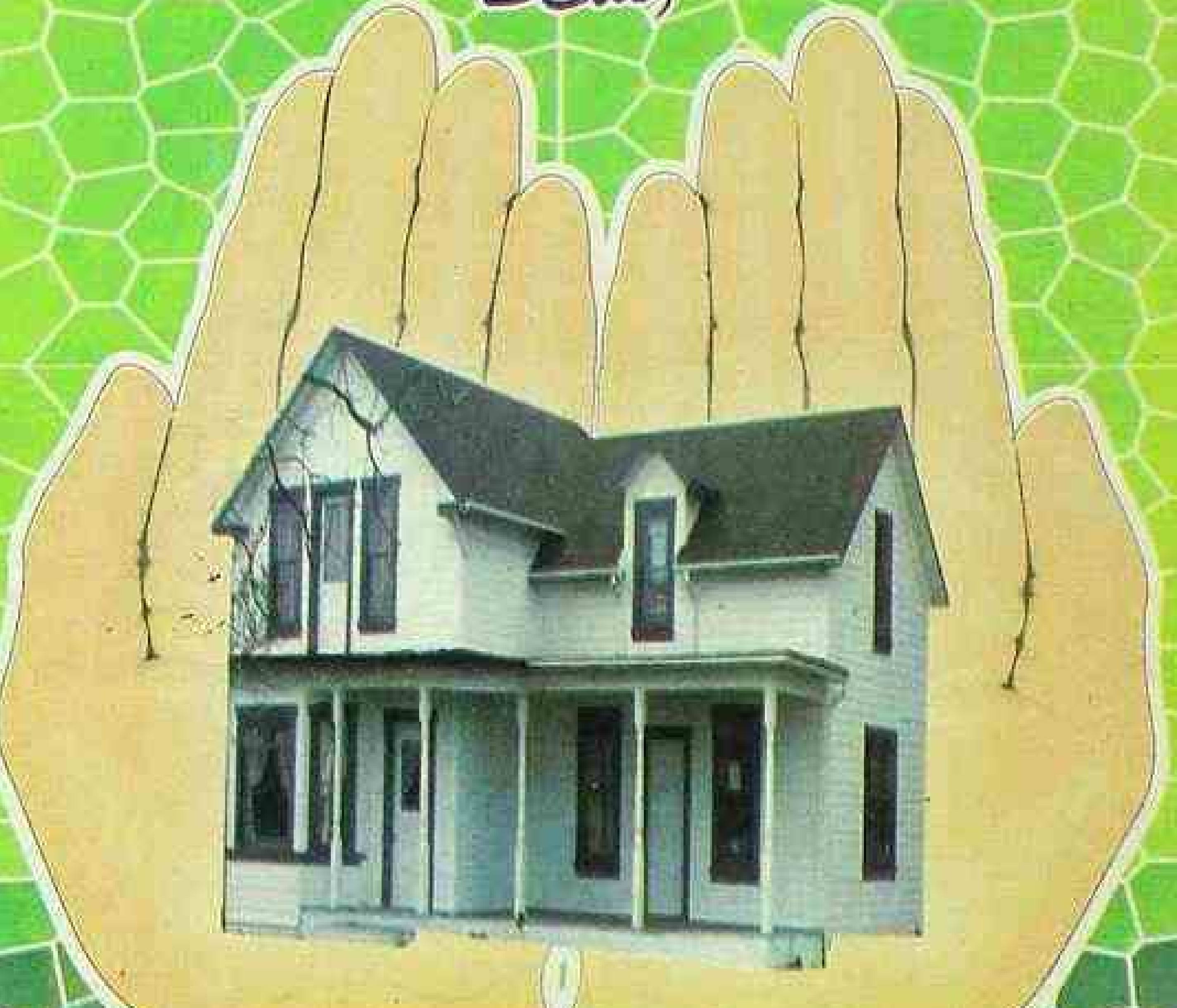

رتن سنگھ

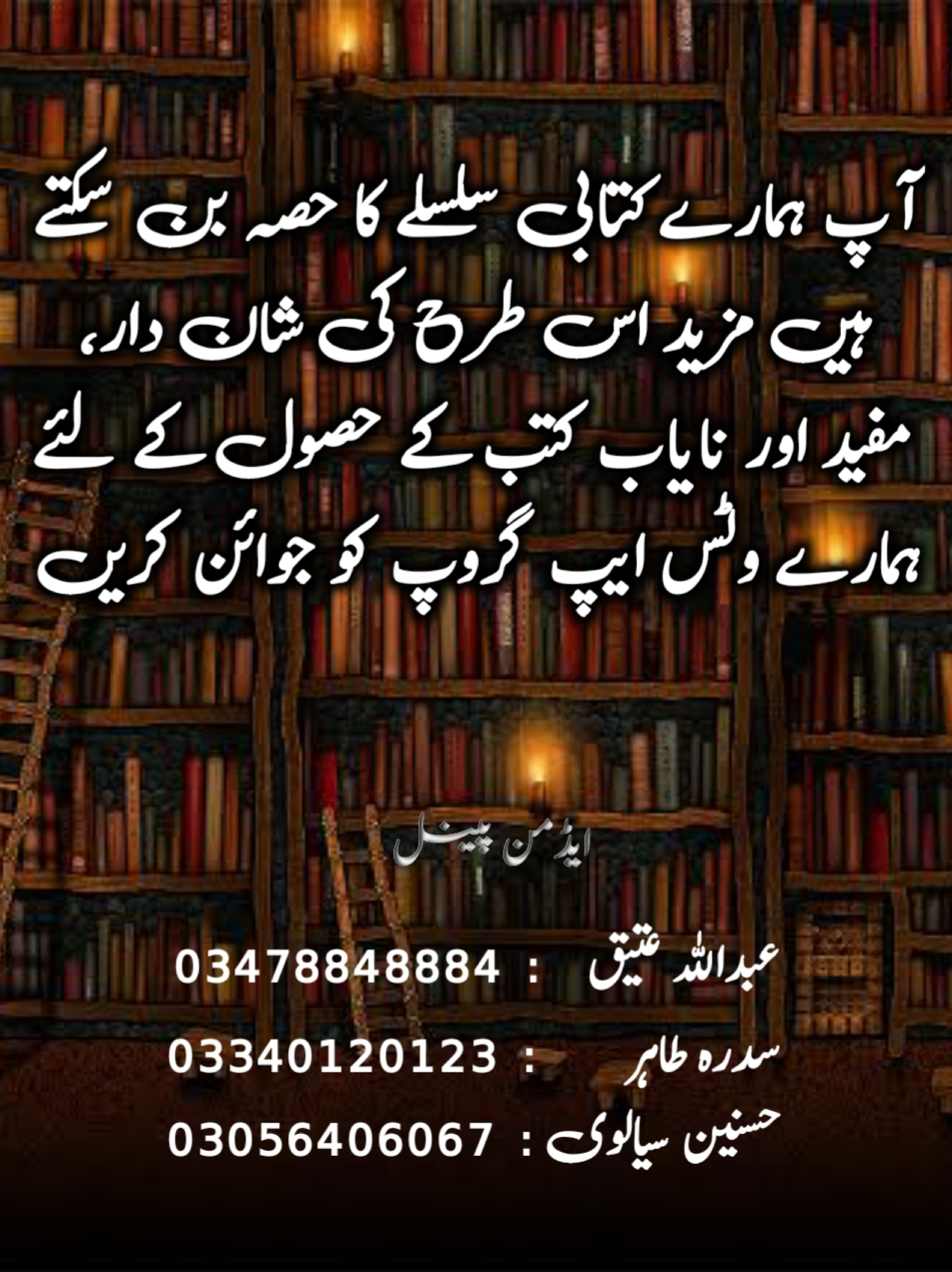
آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں
ایڈمن پینل
عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

HaSnain Sialvi

پناہ گاہ

افسانے

رتن سنگھ

نام : پناہ گاہ (افسانے)

ناشر / مصنف : رتن سنگھ

قیمت : ۱۵۰/روپے

تعداد : ۵۰۰

کمپوزنگ : ذہین کمپیوٹر، نئی دہلی۔ ۲۵

تقسیم کار : موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹-اے، گولا مارکیٹ، دریاگنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

یہ کتاب قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے

PANAH GAH (SHORT STORIES) .Year : 2000

By Price : 150/=

RATAN SINGH

22-Adarsh Nagar, Narbada Road

JABAL PUR

DISTRIBUTOR

9 A, Gola Market, Darya Ganj, New Delhi-110 002

انتساب

خدا

کے نام

جو سب سے بڑا

کہانی کار

ہے

HaSnain Sialvi

افسانے

۱۔ پناہ گاہ ۱۳
۲۔ سب غلط ہو گیا ۲۰
۳۔ غیروں کی بستی ۲۴
۴۔ ایک لمحے کا خدا ۲۹
۵۔ لہو لہو راستے ۳۳
۶۔ ایک گا تھا ۳۸
۷۔ سم ترم ۵۰
۸۔ جنگل اداس ہے ۵۷
۹۔ ایک مجذوب کی کہانی ۶۴
۱۰۔ تلاش ایک بالی کی ۶۹
۱۱۔ سیال کوٹ کا لاڑا ۷۵

HaSnain Sialvi

۱۲۔ نئی دوستی ۸۵
۱۳۔ چلتی چرخی ۸۹
۱۴۔ گڑیا کی ڈالی ۹۷
۱۵۔ سنی سنائی بات ۱۰۶
۱۶۔ حد سے گذر جانے کے بعد ۱۱۱
۱۷۔ سپنا در سپنا ۱۱۵
۱۸۔ حالات کے قیدی ۱۲۰
۱۹۔ عمر کا حسن ۱۲۶
۲۰۔ انجان وادی ۱۳۰
۲۱۔ دیوار ۱۳۶
۲۲۔ ایک تلخ حقیقت ۱۴۲
۲۳۔ بیسویں صدی کا صدر بازار ۱۴۹
۲۴۔ روپ متی کی گپھائیں ۱۵۳
۲۵۔ پچھلے جنم کی بات ۱۶۳
۲۶۔ رُلدو پاتشاہ ۱۶۸
۲۷۔ مت جاؤ ۱۷۶
۲۸۔ ہسپتال بیمار ہے ۱۸۲
۲۹۔ ناگ دیوتا ۱۸۷
۳۰۔ داستان ۱۹۱
۳۱۔ ذرا سی بات ۱۹۶
۳۲۔ آؤ لاہور چلیں ۲۰۳
۳۳۔ نیا سویرا ۲۰۹

۳۴۔ بیتے وقت کی ایک کہانی ۲۱۴

۳۵۔ پیار کا ہار ۲۱۹

۳۶۔ ٹھہرا ہوا لمحہ ۲۲۵

۳۷۔ گھبرائے ہے جیا ۲۳۱

۳۸۔ خوشیوں کے بنجارے ۲۳۹

۳۹۔ لوک گیت کے آنسو ۲۴۶

۴۰۔ لاجو ۲۵۱

۴۱۔ داستاں در داستاں ۲۵۶

۴۲۔ دودھ کی گنگا ۲۶۴

۴۳۔ جھوٹی بھی اور سچی بھی ۲۷۱

۴۴۔ چھوٹی سی خوشی ۲۸۱

۴۵۔ سوگ ۲۸۵

۴۶۔ دنت کتھا ۲۹۲

۴۷۔ تیری میری سب کی بات ۲۹۸

۴۸۔ پیار کی جیت ۳۰۹

۴۹۔ پکشی نہیں لوٹا ۳۱۷

۵۰۔ چھلنی کے چھید ۳۲۳

۵۱۔ نور محمد کی بہشت ۳۳۲

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

افسانے

HaSnain Sialvi

"پناہ گاہ"

رات کو سویا تو میں اپنے کمرے میں تھا، اپنے پلنگ پر، لیکن صبح جب جاگا تو میں نے اپنے آپ کو اس اندھیرے کمرے میں پایا جسے میں پاکستان بنتے وقت اپنے ساتھ ہندوستان اٹھا لایا تھا۔

اس اندھیرے کمرے میں بچھے ہوئے پلنگ پر لیٹا ہوا میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ موت کی وادی سے نکل کر محفوظ جگہ پر پہنچ گیا ہوں۔ رات کے آخری پہر میں، میں نے بڑا ہی بھیانک سپنا دیکھا تھا جس میں خوفناک جانور مجھ پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ سپنے میں ان بھیانک جانوروں سے بچنے کے لئے میں نے ہمیشہ کی طرح اس کمرے میں پناہ لی تھی۔

سپنا ٹوٹ گیا تھا۔ میں پوری طرح جاگ رہا تھا۔ دل اب بھی دھک دھک کر رہا تھا لیکن اس کمرے کی فضا میں ایک لطیف سی گرمی تھی جو خوف سے ٹھٹھرتے ہوئے میرے جسم کو راحت بخش رہی تھی۔ اس کمرے کی بوباس میں ایسی خوشبو تھی جو میری سانسوں کے ذریعہ میرے وجود میں تحلیل ہو کر دل و جان کو سکون عطا کر رہی تھی اور اس کمرے کی

چاروں دیواروں نے جیسے باہیں پھیلا کر میرے زخمی وجود کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا اور مجھے اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کمرے کی چاروں دیواروں نے میری ساری کائنات کو احاطے میں کر لیا ہو اور اس احاطے میں کوئی خوف نہ رہا ہو، کوئی دکھ نہ رہا ہو اور ان دیواروں پر ٹکی ہوئی چھت مہربان آسمان کی طرح مسکرا رہی تھی۔

اس اندھیرے کمرے کو پاکستان سے اٹھا لانے کا قصہ یوں ہے کہ جب وقت کا وہ ظالم لمحہ قریب آیا جس کے ایک ہی وار نے صدیوں پرانے رشتوں کو کاٹ کر رکھ دیا تھا تو گھر میں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ گاؤں کا لمبا تڑنگا نمبر دار مراد علی آنگن میں کھڑا ہم سب کے گھر سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے آتے ہی کہا تھا ”جلدی چلو۔ تڑپھڑ۔ سارے ہندو بازار میں اکٹھا ہو رہے ہیں۔ وہاں سے فوراً ہی چل دینا ہے۔ راوی پار کرنے کیلئے“۔

اس وقت میری دادی آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس نے آٹا وہیں کا وہیں چھوڑ دیا۔ ہاتھ دھو کر جلدی سے دوپٹہ بدلنے کسی کمرے میں گئی۔ اس افراتفری کے عالم میں، کسی کو کیا سوجھ سکتا تھا کہ کیا اٹھائے۔ پھر بھی جیسے سارا گھر اس لمحے کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ میرے بڑے بھائی کے ہاتھوں میں اس کے اسکول کالج کے سرٹیفیکٹ تھے۔ میرے باپ کے ہاتھوں میں زمینوں کی ملکیت کے کاغذات تھے۔ چھوٹے اوتار نے سب کی دیکھا دیکھی اپنا اسکول کا بستہ اٹھا لیا تھا اور میری دادی کے ہاتھوں میں چاندی کے زیوروں اور برتنوں کی خاصی بڑی پوٹلی تھی، جو صرف اس لئے تیار کی گئی تھی کہ لوٹنے والوں کی نظر ہمارے سونے کے ان زیورات کی طرف نہ جائے جو ہم نے جوتوں کے تلووں اور جسم کے دوسرے حصوں میں چھپا رکھے تھے۔

جب دادی دوپٹہ اوڑھ کر باہر آئیں تو ان کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی چاندی والی پوٹلی نمبردار نے لے کر اپنی بغل میں دبا لی اور پھر وہ میرے والد کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کاغذات دیکھنے لگا کہ کہیں ان میں نوٹ تو نہیں چھپائے ہیں۔

میں چھت کے اوپر سے گھبراہٹ کے عالم میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔ دل کرتا تھا کہ

ایک اینٹ دیوار سے اکھاڑ کر نمبردار کو اس طرح کھینچ کر ماروں کہ اسکی طرے دار پگڑی کے نیچے چھپا ہوا سر ودپھاڑ ہو جائے لیکن ہمارے گھر کی دیواریں بڑی مضبوط تھیں۔ ویسے بھی اس وقت اینٹ اٹھا کر مارنا نہ تو ممکن ہی تھا اور نہ ہی عقلمندی۔

اس لئے مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی اور میں گھبرایا ہوا سارے مکان میں پاگلوں کی طرح گھومنے لگا۔ اس کمرے سے اس کمرے تک دالان سے رسوئی تک۔

مجھے کوئی بھی ایسی چیز سمجھ میں نہیں آرہی تھی جسے نمبردار کی تیکھی نظروں سے چھپا کر ساتھ لے جایا جاسکے اور پھر وقت کہاں تھا؟

وقت تو موت کا روپ دھار کر مراد علی کی شکل میں گھر کے آنگن میں آکر کھڑا ہو گیا تھا اور گھر سے نکلنے والے ایک ایک شخص کی تلاشی لے رہا تھا۔ ایسی حالت میں بھلا میں اس گھر سے چلتے وقت کیا اٹھا سکتا تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں گھبرایا ہوا اس اندھیرے کمرے میں گیا۔ اس کمرے میں بچھے ہوئے پلنگ پر ایک پل کے لئے لیٹا۔ اس کی بو باس کو اپنے وجود میں رچایا۔ اس کی دیواروں کو اپنے گرد کھڑا کیا اور پھر چھت سمیت اسے اٹھا کر جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگا کیونکہ مراد علی اونچی آواز میں مجھے پکار رہا تھا کہ جلدی آؤ چلنے کا وقت ہو گیا ہے۔

اس وقت اتنے سال گذر جانے کے بعد اگر آپ اس کمرے کا صحیح حدود اربعہ دیکھنا چاہیں تو لاہور سے نارووال جانے والی گاڑی پر بیٹھئے۔ نارووال سے پہلے ایک سٹیشن پڑتا ہے پیجووالی۔ اس سٹیشن پر اتر کر آپ کو دو میل پیدل چلنا ہو گا، داؤد نام کے گاؤں پہنچنے کے لئے جو دریائے راوی کے کنارے بسا ہوا ہے۔ گاؤں کے باہر ہی سائیں جھنڈے شاہ کا ڈیرہ ہے۔ اس ڈیرے کے پیچھے شری مول چند کی بیٹھک کے سامنے ایک تنگ سی گلی ہے چھوٹی سی۔ اس کے عین سرے پر ہمارا مکان ہے، جہاز نما، بڑا سا۔

اس وقت اس گھر میں دو خاندان رہتے تھے۔ ہمارا اور ہمارے چچا کا۔ لیکن گاؤں والوں کے لئے یہ ایک ہی گھر تھا۔ ایک ہی خاندان۔ وجہ یہ کہ نہ تو ان دونوں

خاندانوں کے درمیان زمین کا بٹوارہ ہوا تھا اور نہ ہی گھر کے اندر تقسیم کی دیواریں اٹھی تھیں۔ کھیتوں کی فصل ایک ساتھ گھر میں آتی تھی۔ اور پھر باہر کی ڈیوڑھی کا دروازہ بند کرنے کے بعد آدھا اناج چچا کے کمروں میں چلا جاتا اور باقی آدھا ہمارے کمرے میں۔ اس پر لطف یہ کہ باہر سے آنے والے مہمان گھر میں دو دو مہینے رہ جاتے اور کسی کو یہ پتہ نہ چلتا کہ دستر خوان پر رکھا ہوا کھانے کا سامان دو رسوئیوں سے، دو گھروں سے بن کر آیا ہے۔ وہ سب یہی سمجھتے کہ دونوں بھائی بڑی محبت سے مل جل کر رہ رہے ہیں۔

ہاں تو اسی گھر میں وہ اندھیرا کمرا ہے، جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اس میں پہنچنے کے لئے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر جائیں گے تو آنگن سے گذرنے کے بعد ایک بہت بڑا دالان ملے گا۔ اس دالان کے ایک، دو، تین چار ہاں پانچ دروازے تھے اور سامنے کی طرف دس روشندان تھے۔ نہیں آٹھ تھے۔ کیونکہ اس دالان کے دوسرے سرے پر چچا کی بہت بڑی رسوئی تھی اور وہاں پر کوئی روشندان نہیں تھا۔ دالان کے پیچھے دو کمرے تھے۔ دائیں طرف والا چچا کا اور بائیں طرف ہمارا۔

ہمارے اس پچھلے کمرے میں چونکہ باہر کی طرف کوئی روشندان یا کھڑکی نہیں تھی اس لئے اس میں قدرے اندھیرا رہتا تھا۔ دالان کے سامنے والے دروازے کھول دینے پر جتنی روشنی آجائے۔ آجائے، اس کے علاوہ روشنی کا کوئی گذر اس میں نہیں تھا۔ اسی لئے اس کمرے کے طاق میں ایک سرسوں کا دیا رکھا رہتا تھا جو ضرورت کے وقت جلا لیا جاتا، اس کی مدھم سی پیلے رنگ کی روشنی میں یہ کمرا اور بھی خوبصورت ہو جاتا تھا۔

ویسے تو مجھے بچپن میں اندھیرے سے بہت ڈر لگتا تھا اور نچلی منزل پر اس کمرے کے نیچے جو کمرے ہیں انمیں جاتے ہوئے بھی گھبراتا تھا لیکن بچپن سے ہوش سنبھالتے ہی پتہ نہیں کیوں میں نے اس کمرے کو اپنی پناہ گاہ بنا لیا تھا۔

گرمی کے دنوں میں دادی صبح اٹھتے وقت مجھے بھی کچی نیند سے جگا دیتیں تو چھت سے اتر کر میں اسی کمرے میں چھپ کر سو رہتا تھا۔ اور چھت پر صبح کی خنکی کے بعد اس

کمرے کی گرم گود میں بڑی میٹھی نیند آتی تھی۔

پھر یہ تھا کہ گرمیوں کی کے بعد جب ہلکے جاڑے پڑنے شروع ہوتے تو ہمارے گھر کے نچلے حصے کی پچھلی اندھیری کوٹھریوں سے کبھی کبھی سانپ نکل آتا تھا۔ وہ سانپ چاہے مار ہی دیا جاتا لیکن اسکی دہشت مجھ پر اس قدر طاری ہوتی تھی کہ مجھے گھر کے نچلے حصے سے ڈر لگنے لگتا تھا۔ میں ڈیوڑھی میں داخل ہونے کے فوراً بعد سیڑھیوں کے راستے چھت پر پہنچ جاتا اور جب تک اس پچھلے کمرے میں نہ پہنچ جاتا مجھے ایسے لگتا جیسے ہر قدم پر سانپ میرا پیچھا کر رہا ہو اور اگر جلدی نہ کی تو وہ میری راہ روک لے گا یا ٹانگوں سے لپٹ جائے گا۔

یہ کمرا ایک اور وجہ سے بھی میرے لئے دوست کا کام کرتا تھا۔ میری اپنی دادی بڑی سخت مزاج عورت تھی۔ بچپن میں ذرا ذرا سی غلطی پر ایسی سخت سزا دیتی تھی کہ روئی کی طرح طوم کر رکھ دیتی تھی۔ دادی سے مار کھانے کے بعد جب روتا روتا میں اس کمرے میں بچھے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹتا تو اس کمرے کی بو باس جیسے میری چوٹوں پر مرہم پٹی کا کام کرتی۔ اس کمرے کی دیواروں کی خنکی میرے دل کو ٹھنڈک پہنچاتی اور ایسے موقعوں پر اسی کمرے میں میری دوسری دادی یعنی چاچا کی ماں، میری دادی سے چوری چوری مجھے دودھ کا گلاس پلا دیتی۔ دودھ کا گلاس جس کا چوتھائی حصہ بالائی سے بھرا ہوتا۔

گھر کے اندر پیدا ہونے والے خوف اور ڈر کے وقت تو یہ کمرہ پناہ گاہ کا کام دیتا ہی تھا لیکن گھر کے باہر بھی جتنے خطرے آتے تھے ان سے بھاگ کر مجھے اسی کمرے میں چین پڑتا تھا۔

ہمارے گاؤں میں دوسرے تیسرے سال باڑھ آجاتی تھی۔ راوی کا پانی، اپنے کناروں کو توڑ کر ہمارے گاؤں کو جب کالے ناگ کی طرح گھیرتا تو ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا۔ ہماری گلی کے سامنے جو چوڑا راستہ جاتا ہے وہاں تو گھٹنوں گھٹنوں پانی ہوتا لیکن ذرا آگے بڑھو تو یہی پانی گلے سے بھی اوپر ہو جاتا۔ ایسی باڑھ کے وقت پانی کی تیز دھاروں کی شائیں شائیں سے سارے گاؤں پر دہشت چھا جاتی۔ ہر شخص گھبرایا ہوا ہوتا۔

میں یہ ہولناک منظر دیکھ کر گھر لوٹتا تو اس کمرے میں چھپ جاتا جیسے مجھے یقین تھا کہ باڑھ کا پانی اس کمرے کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب میرے دل کو ذرا سی ڈھیرج بندھتی تو ایسے موقعوں پر میں سوچتا کہ کاش اس کمرے کی دیواریں اتنی بڑی ہو جائیں اتنی بڑی ہو جائیں کہ سارا گاؤں اس میں سمٹ جائے۔ باڑھ کی زد میں آکر لہلہاتی فصلوں والے کھیت برباد ہو جاتے تھے اور کچی دیواروں والے بھنگیوں اور کمہاروں کے مکان اکثر باڑھ کی وجہ سے گر جایا کرتے تھے۔ اس لئے میرے دل میں آیا کرتا کہ یہ سب اسی کمرے میں آکر سما جائیں یا یہ کمرا ہی اتنا بڑا ہو جائے کہ سارے مکان، سارے کھیت، اس کے اندر آکر باڑھ سے محفوظ ہو جائیں۔

اب تو آپ کو تھوڑا بہت اندازہ ہو ہی گیا ہو گا کہ اس کمرے کی میرے لئے کیا اہمیت ہے اور میں اسے پاکستان سے اٹھا کر کیوں لایا تھا۔

اس نئی دھرتی پر چونکہ ابھی تک کہیں میرے قدم جم نہیں پائے اس لئے میں شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح لڑھکتا پھرتا ہوں۔ حوادث کی ہوا جب میری مرضی کے خلاف مجھے دھکیل کر انجانی سمتوں میں لے جاتی ہے اور انجان راہوں پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے جب میرا وجود لہو لہان ہو جاتا ہے تو میں خود بخود اس کمرے میں پہنچ جاتا ہوں چند لمحوں کے لئے۔ اور اس کے طاق میں رکھے ہوئے دئے کو میں جیسے ہی روشن کرتا ہوں، اسکی پیلی روشنی میں میری تڑپتی ہوئی روح کو قرار آنے لگتا ہے۔

یا یوں کہئے کہ جب حقیقی زندگی کے خوف میرے گرد پھیلے ہوئے اندھیروں سے نکل کر کالے ناگ کی طرح پھن پھیلا کر میرا راستہ روک لیتے ہیں یا میرے قدموں سے لپٹ لپٹ جاتے ہیں۔ یا پھر دکھوں اور غموں کی باڑھ اپنی ساری حدوں کو توڑ کر جب میری ہستی کو اس طرح گھیر لیتی ہے جیسے راوی ہماری ساری بستی کو گھیر لیا کرتی تھی اور جب میرے وجود کے گرد کی کچی دیواریں وقت کی بے رحم لہروں کی زد میں آکر گرنے لگتی ہیں تو میں اپنے آپ کو بچانے کے لئے اسی کمرے میں پناہ لیتا ہوں۔ اس کمرے میں جو میں پاکستان سے اٹھا کر اپنے

ساتھ ہندوستان لے آیا تھا۔ جب موت مراد علی کا روپ دھار کر میری زندگی کی چاندی چھیننے آتی ہے تو میں ڈر کے مارے سہما ہوا پاگلوں کی طرح چاروں طرف گھومتا ہوں اور پھر اسی کمرے میں دبک کر چند لمحے سکون پاتا ہوں۔

ایسے موقعوں پر اس کمرے کی بو باس میرے زخموں پر مرہم کا پھاہا رکھتی ہے۔ میری سانسوں کے ذریعہ جسم کے اندر داخل ہو کر دل کو دھیرج دیتی ہے اور اس کمرے کی چاروں دیواریں مجھے اپنی آغوش میں لے کر زندہ رہنے کا حوصلہ بخشتی ہیں اور کمرے کی چھت مہربان آسمان کی طرح رحمت کی بارش کرنے لگتی ہے۔

جب کبھی باڑھ آتی تھی تو اپنے بچپن میں، اس کمرے میں لیٹا ہوا میں یہ دعائیں مانگا کرتا تھا کہ یہ کمرا سارے گاؤں ساری بستی کی پناہ گاہ بن جائے اور اب بڑا ہو کر میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر اس کمرے کی دیواریں ساری دنیا کو اپنے احاطے میں لے لیں تو ہو سکتا ہے کہ اس کی مہربان چھت کے نیچے اس دکھی دنیا کو چند لمحوں کے لئے سکون میسر ہو جائے۔

اسی مقصد کے حصول کے لئے میں اکثر اس اندھیرے کمرے میں پہنچ کر اس کے طاق میں رکھے ہوئے دیئے کو روشن کرتا ہوں اور اس کی جلتی ہوئی لو کی طرف دیکھتا رہتا ہوں اِک ٹک اور سوچتا ہوں کہ اس کی لو کو کیسے اور تیز کیا جائے کہ اس کی پیلی روشنی پھیلتی پھیلتی ساری دنیا کو اپنی آغوش میں لے لے۔

✓

سب غلط ہو گیا

میں اور خورشید مل کر ایک گھروندہ بنا رہے تھے۔

چاروں دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ ان میں ایک دروازہ اور دو کھڑکیاں بھی لگا دی گئیں۔ چھت ڈال رہے تھے کہ اچانک اڑا اڑا دھم، چھت نیچے گر گئی اور اس کے ساتھ ہی چاروں دیواریں بھی ڈھے گئیں اور اب ہمارے سامنے ایک گھر کے بجائے ایک مٹی کا ڈھیر پڑا تھا جس کے نیچے دروازہ اور کھڑکیاں ہماری امیدوں کی طرح دب کر رہ گئے تھے۔

''سب غلط ہو گیا'' ہم دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا اور ہم مایوسی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ دُور افق پر سورج غروب ہو رہا تھا اور آسمان پر جیسے کسی نے خون کا چھڑکاؤ کر دیا تھا۔ ہمارے ارمانوں کے خون کا۔ اس پس منظر میں خورشید کے چہرے کا رنگ اور لال ہو گیا تھا۔ اور وہ بار بار اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پلکوں میں پھنسے ہوئے ایک آنسو پر سورج کی کرن پڑ رہی تھی اور اس میں لالی جھلک رہی تھی۔ تبھی خورشید نے اپنے

دونوں ہاتھ بڑھا کر میری چھلکتی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لی اور میں نے اس کی آنکھوں پر چھلکتی ہوئی دولت سے اپنی مٹھیاں بھر لیں۔

اور اسی دولت کو اپنی اپنی مٹھیوں میں بھر کر ہم اس رات کے اندھیرے میں اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

بات آئی گئی ہو گئی اور ہم یہ بھول گئے کہ کبھی ہمارا گھروندہ اڑا اڑا دھم گر کر ڈھے گیا تھا۔ پھر زندگی کی ایک دوپہر کو جب سورج آسمان سے آگ اگل رہا تھا اور سب بڑے آدمی برگد کے پیڑ کے نیچے آرام کر رہے تھے۔ مجھے اور خورشید کو بے حد پیاس لگی۔ ہم چپکے چپکے سائیں جھنڈے شاہ کی مٹی کی گھڑی لے کر جس کے ساتھ ڈور بندھی ہوئی تھی، کنوئیں پر گئے اور چرکھڑی کے سہارے ہم دونوں نے گھڑا کنوئیں کے اندر ڈال دیا۔ میں ڈوری کو پکڑے رہا۔ اور خورشید کنوئیں کی منڈیر پر کھڑی یہ دیکھتی رہی کہ گھڑا پانی تک پہنچ گیا ہے یا نہیں۔ جب گھڑا پانی سے بھر گیا تو وہ خوشی سے چہکتی ہوئی تالیاں بجاتی ہوئی اور آنکھوں میں ہنستی ہوئی میرے پاس آئی اور پھر ہم نے مل کر گھڑے کو کھینچنا شروع کیا۔

پانی کا بھرا ہوا گھڑا بھاری تھا۔ ہمیں اسے کھینچنے میں بڑی دقت ہو رہی تھی۔ ہم اسے اوپر تک کھینچ تو لائے۔ لیکن اسے منڈیر پر کیسے رکھیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ڈوری ڈھیلی کرتے تھے تو گھڑا کنوئیں کے اندر چلا جاتا تھا۔ ایک آدمی گھڑے کے پاس جاتا تھا۔ تو دوسرے کے پاؤں اکھڑ اکھڑ جاتے تھے۔ اسی کوشش میں ڈوری ہم لوگوں کے ہاتھ سے پھسل گئی اور پانی کا گھڑا ڈوری کے ساتھ کنوئیں میں جا گرا۔ ہم دونوں نے گھبرائے ہوئے کنوئیں کے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں پانی کی سطح پر جیسے طوفان آیا ہوا تھا۔ وہاں پانی میں ہم دونوں کے عکس ڈول رہے تھے۔ ہمارے چہروں کے عکس پانی میں ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کرتے اور پھر الگ ہو جاتے۔

پانی کی سطح پر اپنے چہروں کے عکس ملتے نہ دیکھ کر ہم اپنی پیاس بھی بھول بیٹھے اور منڈیر سے اترتے ہوئے ہم دونوں نے کہا، سب غلط ہو گیا۔

بات پھر آئی گئی ہو گئی اور ہم یہ بھول گئے کہ کبھی ہمارے ہاتھوں سے ڈوری پھسل کر گھڑے سمیت کنوئیں میں گر گئی تھی اور ہم پیاسے رہ گئے تھے۔

ایسے ہی ایک مرتبہ ہم دونوں کا آم کھانے کا من ہوا۔ میں تیزی سے آم پر چڑھ گیا اور خورشید نیچے جھولی بنا کر کھڑی ہو گئی۔ میں اچھے پکے ہوئے آموں کی تلاش میں آم کی سب سے اوپری شاخ پر پہنچ گیا اور پیشتر اس کے کہ میں آم توڑ کر نیچے پھینک سکوں، وہ شاخ تنے سے ٹوٹنا شروع ہوئی اور میں اس کے ساتھ ہی نیچے کی طرف لڑھک گیا۔ وہ تو غنیمت یہ ہوئی کہ ٹوٹتی ہوئی شاخ میرے ہاتھ سے نہیں چھوٹی اور دوسری طرف شاخ کا چھلکا کافی دیر تک تنے کے ساتھ ساتھ چھلتا گیا، جس کی وجہ سے شاخ کے پوری طرح پیڑ سے الگ ہوتے ہوتے میں کافی نیچے آ گیا تھا۔ پھر بھی آٹھ دس فٹ کی اونچائی سے میں نے چھلانگ لگائی اور ساتھ ہی آم کی ٹہنی میرے اوپر گر پڑی۔

مجھے تو جو چوٹ آنی تھی آئی ہی لیکن میرے جھولنے کے ساتھ ہی خورشید ان لمحوں میں پھانسی پر لٹک گئی۔ اور پھر مجھے درد سے کراہتے ہوئے دیکھ کر وہ بلک پڑی اور بولی ,,سب غلط ہو گیا،،

بات آئی گئی ہو گئی اور پھر ہم بھول گئے کہ کبھی آم کی ٹہنی ٹوٹ جانے سے مرتے مرتے بچا تھا اور مجھے اور خورشید کو آم نہیں مل پائے تھے۔ لیکن اس کے بعد سب غلط ہوتا چلا گیا۔

خورشید اور میں جوانی کے چوراہے پر آ کر ایک دوسرے سے ایسے بچھڑے کہ پھر کبھی نہ مل سکے۔

اور پھر عمر کی سونی ڈگر پر چلتے ہوئے میں نے ہر شخص میں خورشید کو ڈھونڈھنا چاہا۔ خورشید جو میرے ساتھ آبدیدہ ہوتی تھی تو میرے آنسوؤں کے موتیوں کو دولت کی طرح اپنی ہتھیلیوں میں سمیٹ لیتی تھی۔ میری آنکھیں آج بھی ان نرم ہاتھوں کے لمس کو ترستی ہیں اور میری ناک ان ہاتھوں کی خوشبو کو پہچانتی ہے۔ لیکن خورشید تو کیا اس کا پرتو بھی

دکھائی نہیں دیتا تو آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں۔ پلکیں ان ہاتھوں کے انتظار میں کچھ دیر تک آنسوؤں کے قطروں کو روکے رکھتی ہیں لیکن آخر وہ آنسو خاک میں مل کر خاک ہو جاتے ہیں۔

اور اب عالم یہ ہے کہ زندگی کی مسافت طے کرتے ہوئے جب ارمانوں کا گھروندہ اڑا اڑا دھم ڈھے کر مٹی کا ڈھیر بن جاتا ہے یا جب امید کی ڈوری میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر پانی کے گھڑے سمیت ناامیدی کے گہرے کنویں میں گر پڑتی ہے اور تصور کی اونچی شاخ سے گرتا ہوا میں ہوا میں معلق رہ کر حالات کی سنگ لاخ زمین پر آ کر گرتا ہوں تو اس وقت میرے وجود میں چھپے ہوئے کرب اور درد کو کوئی نہیں دیکھ پاتا۔

ایسے موقعوں پر وہ لوگ جو دوست احباب اور رشتے دار ہونے کا دم بھرتے ہیں۔ جب رسمی طور سے پوچھتے ہیں۔ ”کہیے مزاج کیسا ہے؟“ تو اس وقت اپنے اندر کے درد کو دبا کر اور چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ لا کر یہ کہنا پڑتا ہے۔ ”سب خیریت ہے“۔

ایسا کہتے ہوئے میرے اندر کا درد پھر جاگ اٹھتا ہے اور آنکھیں پلکوں کے پیچھے آنسو چھپائے خورشید کو تلاش کرنے لگتی ہیں جس کے ساتھ مل کر اونچی آواز میں یہ کہا جا سکے کہ ”سب غلط ہو گیا“۔

غیروں کی بستی

"ہمارے چاروں طرف غیر بستے ہیں"

اس خاندان نے سوچا تھا۔

"ہمارے بیچ یہ غیر کون آکر بس گئے"

اس خاندان کے چاروں طرف رہنے والے لوگوں نے اپنے اپنے گھروں میں کھسر پھسر کی تھی۔

نئے خاندان کو مکان خریدنے کے فوراً بعد ہی احساس ہو گیا تھا کہ غلطی ہو گئی ہے، لیکن پھر بھی انہوں نے سوچا کہ آج کل اپنے کون سے اپنے ہوتے ہیں۔ غیروں سے میل جول سے رہیں گے تو ایک روز وہ بھی اپنے ہو جائیں گے۔

ویسے ان کا اس طرح سوچنا واجب بھی تھا اور مجبوری بھی۔ واجب اس لئے کہ وہ واقعی ایک شریف خاندان تھا اور ہر شریف آدمی پیار محبت اور میل جول میں یقین رکھتا ہے اور مجبوری اس لئے کہ ایک اچھی خاصی رقم انہوں نے اس مکان کو خریدنے میں صرف کر

دی تھی۔ اور مکان خریدنے کے بعد وہاں رہنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور چارہ نہیں رہ گیا تھا۔

اب چونکہ ابتدا ہی شبہات اور خدشات کے ماحول میں ہوئی تھی اس لئے اپنے مزاج اور ضرورتوں کے مطابق جو تبدیلیاں وہ لوگ اپنے مکان میں کرنا چاہتے تھے، انہیں ملتوی کر دیا گیا تھا، یہاں تک کہ باہر آنگن میں جو عارضی غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ اس کی ایک دیوار ہی نہیں تھی۔ اور آڑ کرنے کے لیے دو ٹوٹے ہوئے ٹین کھڑے کئے گئے تھے۔ اس چھوٹی سی دیوار کے نہ ہونے کی وجہ سے بڑی بے پردگی تھی لیکن انھوں نے اس کا بنوانا بھی ملتوی کر رکھا تھا۔ مکان میں صرف سفیدی کروائی تھی اور منتقل ہو گئے تھے۔

دو مہینوں تک بالکل ٹھیک ٹھاک چلتا رہا۔

بچوں نے محلے کے بچوں سے دوستی کر لی۔ ایک آدھ بار تو وہ ایک دو گھروں میں ہو بھی آئے تھے۔

اسی طرح عورتوں کی بھی جان پہچان بڑھی۔ گھر کے آنگن میں کھڑے کھڑے اگر اپنی چھت پر کھڑی یا کھڑکی سے جھانکتی پڑوسن سے آنکھیں چار ہوتیں تو مسکراہٹوں کے تبادلے سے اجنبیت کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی۔

مردوں نے گلی میں آتے جاتے ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھنا شروع کیا جیسے نظروں ہی نظروں میں پہچان کر ایک دوسرے کو کہہ رہے ہوں۔ ہاں ہم جانتے ہیں کہ آپ اسی محلے میں رہتے ہیں۔"

لیکن یہ سب جان پہچان کچھ ایسی ہی تھی، جیسے قصائی بکرا خریدنے سے پہلے اسے اچھی طرح ٹٹول ٹٹول کر دیکھ لیتا ہے۔

پھر بھی کل ملا کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ آہستہ آہستہ غیریت کی جگہ اپنائیت لے رہی تھی۔ نئے خاندان والوں کو گھر کی دیواریں اپنی سی لگنے لگی تھیں۔ یہاں تک کہ پڑوسن کی دیوار پر جو پھولوں کے گملے رکھے تھے، اس کی ہری پتیاں اور پھول بھی اپنے لگنے لگے تھے۔

کیونکہ اس بات کا انہیں یقین ہو چلا تھا کہ پڑوسن کے گملے سے پھول ٹوٹ کر گھر کے آنگن میں خود بخود بھی گر سکتے ہیں۔ اور ممکن ہے خود پڑوسن ہی اپنی مسکراہٹ کے ساتھ دو چار پھول خود توڑ کر کسی دن نئی پڑوسن کی جھولی میں پھینک دے۔

لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔

ہوا کا رخ اچانک بدل گیا۔

باہر کہیں دو فرقوں میں جھگڑا ہوا تھا۔

نئے گھر میں بسنے والا جب سہما اور گھبرایا ہوا گھر داخل ہوا تو اسے لگا تھا جیسے محلے والے واقعی غیر بن کر اس کا پیچھا کر رہے ہوں۔ اس لئے گھر میں داخل ہوتے ہی اس خاندان نے سارے کواڑ بند کر لیے تھے اچھی طرح سے یہ بھی اطمینان کر لیا تھا کہ سب بچے گھر پر ہیں۔ ایسے ماحول میں جہاں باہر افراتفری مچی تھی وہاں خود تو باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بچوں کو بھی منع کر دیا تھا کہ وہ بھی کسی حالت میں گھر سے باہر نہ نکلیں۔

نیا خاندان گھر میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے غیروں کے گھروں میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ جاننے کے لئے وہ لوگ بار بار دروازوں کی دراڑوں سے جھانکنے کی کوشش کرتے۔ جس طرف کوئی آواز سنائی دیتی، کان اسی طرف لگ جاتے۔ خوف کے مارے ان کی ٹانگیں بار بار کانپنے لگتیں۔ دل رہ رہ کر دھڑکتا۔ اور چہروں کے رنگ تو پھیکے پڑ ہی گئے تھے۔

اس گھبراہٹ کے عالم میں بیوی نے کہا۔ ”بھاڑ میں جائے یہ مکان ہم یہاں نہیں رہیں گے۔“

شوہر نے کہا۔ ”لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔“

بچے الگ سہمے ہوئے تھے۔ وہ یہ تو نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ انہیں باہر جانے سے کیوں منع کر دیا گیا ہے لیکن کسی قسم کے خطرے کا احساس انہیں بھی تھا۔ آخر وہ مشکل گھڑی بھی آ پہنچی جس کا انہیں خطرہ تھا۔

اچانک ان کے گھر پر چاروں طرف سے اینٹیں برسنے لگیں۔ سارا خاندان گھبرایا ہوا گھر کے آنگن کی طرف دیکھنے لگا۔

اینٹیں ان کے آنگن میں گر رہی تھیں۔

ان کے پھولوں کے گملے نشانہ بنے اور ٹوٹ گئے۔

ان کے غسل خانے کی ٹوٹی ہوئی ٹینوں پر اینٹیں پڑیں اور وہ گر گئیں۔

آنگن میں بنا ہوا مٹی کا چولہا ٹوٹا۔

کچھ کھانے کے برتن ٹوٹے۔

یہ نقصان تو خیر بے حد معمولی تھا۔ جو اصلی نقصان ہوا۔ وہ یہ تھا کہ غیروں کے محلے میں رہتے رہتے ان کے دلوں میں غیروں کے لیے اپنائیت کا جو احساس جاگا تھا اس کو ٹھیس پہنچی اور وہ ٹوٹ کر چکنا چور ہو کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔

دو چار ہفتے بعد حالات پھر معمول پر آگئے۔

زندگی پھر رواں دواں ہو گئی۔ نئے خاندان نے اپنے آنگن میں گری ہوئی انٹیں اکٹھی کر کے ایک جگہ ڈھیر کر دیں۔

ٹوٹے ہوئے گملے اٹھا کر پھینک دیئے۔

برتنوں کی کرچیں سمیٹ کر کوڑے پر پھینک دیں۔

غسل خانے کے گرے ہوئے ٹین اٹھا کر پھر پردے کے طور پر کھڑے کرتے ہوئے شوہر کو خیال آیا کہ کیوں نہ غیروں کی پھینکی ہوئی اینٹوں سے غسل خانے کی دیوار اٹھا دی جائے۔ اور ٹین ہٹا دیئے جائیں۔

بیوی اس تجویز کو سن کر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ لیکن شوہر اپنی تجویز پر عمل کرنے کے لیے معمار کو بلا لایا۔

دیوار اٹھنا شروع ہوئی۔ بیوی اور بچے غور سے دیوار اٹھتی دیکھتے رہے۔

آدھ گھنٹے میں ہی معمار کے ہاتھ رُک گئے۔

دیوار ابھی تین حصے ہی بن پائی تھی۔ چوتھائی حصہ باقی تھا کہ اینٹیں ختم ہو گئیں۔

معمار نے شوہر کی طرف دیکھا۔

شوہر نے بیوی کی طرف۔

وہ ایک مرتبہ پھر زور سے کھلکھلا کر ہنسی اور بولی۔

''میں نا کہتی تھی کہ غیروں کے محلے میں مکان نہ خریدو اب دیکھ لیا نہ کہ غیروں نے اینٹیں بھی پھینکیں تو دیوار بھر کی نہیں پھینکیں۔

✓

ایک لمحے کا خدا

اس لمحے میرے اندر کی ساری خوبصورتی باہر امڈی پڑ رہی تھی۔ جیسے پھوارے کے اندر سے نکل کر پانی اوپر کی طرف اچھلتا ہے، اور پھر قوس قزح بناتا ہوا چاروں طرف بکھرنے لگتا ہے اور نیچے حوض میں جمع ہوئے پانی پر جیسے بارش ہونے لگتی ہے اور اس کی پھوہار اردگرد کے ماحول کو نم کرنے لگتی ہے، ٹھنڈک پہنچانے لگتی ہے کچھ اسی طرح سے میرے وجود میں چھپی ہوئی خوبصورتی میرے اردگرد پھوہار بن کر بکھر رہی تھی۔

جس طرف بھی میری نگاہ جاتی، جس چیز کو بھی میری نظر چھوتی، وہی خوبصورت ہوتی چلی جا رہی تھی۔

مجھے اپنے اندر موجود اس خوبصورتی کا کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ میرے اندر کوئی ایسی قوت ہے جو ہر چیز کو کندن بنا سکتی ہے۔ لیکن وہ لمحہ پتہ نہیں کیسا تھا۔ کتنا خوبصورت تھا جب مجھے اپنی اس قوت کا احساس ہوا۔ اس وقت میں نے نظر اٹھا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک عام سی سادھارن عورت ہے، جسے میں برسوں سے دیکھتا چلا

آیا ہوں۔ لیکن اس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے میری نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر چاند کا حسن جھلکنے لگا۔ ستارے اس کے بالوں پر زیور بن کر ٹک گئے اور اس کا سارا وجود پھولوں سے لدی ہوئی ڈالی کی طرح مہک دینے لگا۔

اس سے نظریں ہٹا کر میں نے اپنے آنگن میں لگے پودوں کو دیکھا تو یہ احساس ہوا جیسے میری آنکھیں ان پودوں کو ہریادل بخش رہی ہوں اور وہ یہ رنگ روپ پا کر بہت نازک اور خوب صورت ہو گئے ہوں، اور خوشی سے جھوم رہے ہوں۔ ان پر رنگ برنگے پھول بھی کھل آئے تھے۔ اور ماحول بھی مہک اٹھا تھا۔

پھر میری نظر آنگن کے اوپر پھیلی ہوئی فضا کی طرف گئی تو ایسے لگا کہ جیسے میری نگاہوں نے بہت اوپر حد نظر تک نیلاہٹ بکھیر کر ایک نئے آسمان کی تشکیل کر دی ہے۔ میں ابھی اپنی نگاہوں کے اس کمال کو ہی محسوس کر رہا تھا کہ ایسے لگا جیسے میں نے اپنے بنائے ہوئے اس نیلے آسمان پر ہاتھ سے موتی اچھال دیئے ہوں اور وہ آسمان پر دانوں کی طرح بکھر کر ستارے بن کر چمکنے لگے ہوں۔

میں یہ سب دیکھ کر خوش بھی ہو رہا تھا اور حیران بھی۔ حیران اس لیے کہ مجھے ابھی تک کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ میں اتنے کمالات کرنے کے قابل ہوں۔ میں حیران تھا کہ آسمان کیسے میری نظر کے جادو سے فضا میں اٹک گیا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کس طرح وہاں ستارے اُگ آئے ہیں۔ اور میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔

ابھی میں یہی دیکھ رہا تھا کہ آنکھ کے ذرا سے اشارے پر میرے ہاتھ نے اوپر آسمان تک اٹھ کر وہاں چاند کو ٹانک دیا اور اس طرح میرے گھر کے آنگن میں سے دکھائی دینے والے آسمان کا حسن مکمل ہو گیا۔

میں اپنی نگاہوں کے اس جادو کو اپنی اس تخلیق کو بڑی دیر تک غور سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس نظر میں کتنی طاقت ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنگن کے اوپر آسمان کی چھت ڈال دی، پھر اس آسمان کو خوبصورت بنانے کے لیے اس پر نیلاہٹ بکھیر دی، پھر جگمگاتے ہوئے

تبھی مجھے احساس ہوا کہ آسمان کی اس خوبصورتی اور میری بیوی کی خوبصورتی میں بڑی یکسانیت ہے۔ میری بیوی کے چہرے پر بھی چاند کی سی خوبصورتی ہے اور اس کے بالوں میں ستارے زیوروں کی طرح ٹنگے ہیں۔ اور اس کی سانسوں میں پھولوں کی سی مہک ہے اور......اور......

اور میں خوش تھا کہ میں اس قابل ہوں کہ اپنا آسمان بنا سکتا ہوں اس پر چاند ستارے جڑ سکتا ہوں، پودوں کو ہریاول دے سکتا ہوں، ان پر پھول کھلا سکتا ہوں اور پھر چاند ستاروں اور پھولوں کے مجموعی حسن اور مہک سے بیوی کے حسن کو دوبالا کر سکتا ہوں۔

غرضیکہ میرے اندر پیدا ہوا خدا مجھے پانچ چھ فٹ لمبے حقیر سے آدمی کو اتنا بلند کر رہا تھا اس لمحے کہ میں اپنے بنائے ہوئے آسمان سے بھی اونچے بنے ہوئے آسمانوں اور ان آسمانوں پر چمکتے ہوئے چاندوں اور سورجوں اور ستاروں سے بھی اونچا اٹھتا جا رہا تھا۔ اوپر ہی اوپر پرواز کر رہا تھا۔ کبھی دل کرتا تو کسی ستارے پر ہاتھ ڈال کر اسے توڑ کر اپنے گھر کے آنگن میں پھینک دیتا کبھی اسے وہیں چمکتا رہنے دیتا۔

اس طرح جب میرے گھر کا آنگن ستاروں سے بھر گیا تو دوسرے ہی لمحے میں پھر اپنے گھر کے آنگن میں اپنی چارپائی پر بیٹھا تھا، جہاں میری بیوی میرے سامنے بیٹھی سبزی چھیل رہی تھی۔ اب پھر وہ وہی سادھارن سی عورت تھی جس کے بالوں میں ستاروں کے بجائے سفید بال چمک رہے تھے۔ گھر کے آنگن میں لگے پودوں کی طرف نگاہ گئی تو ان کے پتے بھی سوکھے ہوئے سے تھے۔

مطلب یہ کہ اب میری نظر میں وہ قوت نہیں رہی تھی کہ پودوں کے پتوں کو ہریاول عطا کر سکے یا بیوی کے چہرے پر حسین چاند ستارے ٹانک سکے اور آسمان اور چاند ستارے، سب کے سب نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ اوپر فضا میں خلا سی پیدا ہو گئی تھی۔ اور میں تڑپ اٹھا ہوں۔

ایک لمحے کا خدا میرے وجود کے اندر نہ معلوم کن گہرائیوں میں چھپ گیا ہے۔ میں اپنے اندر جھانک جھانک کر کونے کونے میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ لیکن اس ایک لمحے کے خدا کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ میری پریشانی اور گھبراہٹ بڑھ رہی ہے میرا دل ڈوب رہا ہے۔ میں ایسے تڑپ رہا ہوں جیسے اچانک مچھلی کو پانی سے باہر پھینک دیا گیا ہو۔ مجھے ایسے لگ رہا ہے جیسے آسمان کی بلندی سے مجھے سخت زمین پر زور سے پٹخ دیا گیا ہو اور میرا انگ انگ ٹوٹ کر بکھر کر بے حال ہو رہا ہو۔

اس حالت میں میں اپنے ذہن پر زور دے رہا ہوں کہ میرے اندر وہ ایک لمحے کا خدا کیسے پیدا ہوا تھا ...... بہت سوچنے پر احساس ہوا کہ کوئی خوبصورت خیال آیا تھا۔ اچھی سی بات ذہن میں آئی تھی، محبت کا کوئی جذبہ پیدا ہوا تھا ......اور اس کے ساتھ ہی پیدا ہو گیا تھا وہ ایک لمحے کا خدا ......اور اس خیال کے ذہن سے اوجھل ہوتے ہی ......میری دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔

اور میں کوشش کر رہا ہوں کہ وہ لمحہ ایک بار پھر زندہ ہو سکے۔ وہ ایک لمحے کا خدا میرے اندر ایک بار پھر ظہور میں آ سکے تاکہ ساری دھرتی کے آنگن پر میں ایک نیا آسمان بنا سکوں، جس پر چمکتے ہوئے سورج چاند اور ستارے ہمیں نئی روشنی نئی زندگی دے سکیں۔

✓

لہو لہو راستے

اس کے باپ کا قتل کیوں ہوا، اس کی کہانی تو مجھے اپنا سر نیچا کر کے کہنی پڑے گی اور آپ کو بھی اسے سننے کے لئے اپنے سر نیچے کرنے ہوں گے . . . .ورنہ ہو سکتا ہے میرے اور آپ کے سر بھی اسی طرح قلم کر دئے جائیں۔

ہاں البتہ باپ کے قتل سے دہشت زدہ ہو کر وہ پانچ چھ سال کا معصوم سا بچہ بھاگا تو اس سے اس بستی میں ایک ایسی کہانی کی داغ بیل پڑی ہے، جو کہیں ختم ہونے میں نہیں آرہی ہے اور وہ بچہ، برسوں گزر گئے تب سے لے کر اب تک متواتر دوڑ رہا ہے۔ تیز تیز۔

جہاں کہیں وہ کسی آدمی کی صورت دیکھتا ہے اسے دہشت ہونے لگتی ہے۔ اس کے پاؤں تلے جیسے زمین کے ذرے انگارے بن جاتے ہیں اور وہ اس آگ سے بچنے کے لئے تیز رفتاری سے بستی کے باہر کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ وہ دوڑتا ہے تو کھیتوں میں کٹی ہوئی فصلوں کی جڑیں پگڈنڈیوں پر بکھرے ہوئے کنکر پتھر، راستے کی جھاڑیاں، یہ سب اسے لہو لہان کرتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ دوڑتا رہتا ہے دوڑتا رہتا ہے لیکن گاؤں کی آخری حد پر پہنچتے ہی نہ

معلوم کون سی مقناطیسی کشش اسے واپس کھینچ لاتی ہے اور وہ پھر گاؤں کی طرف پلٹ آتا ہے یا پھر اس کے گرد چکر لگانے لگتا ہے۔ دوڑتے ہوئے وہ اپنے بازو ہوا میں یوں لہراتا ہے جیسے ہوا میں تلوار چلا رہا ہو جیسے کسی چیز کو وہ کاٹ رہا ہو۔ اس کے بازوؤں کو اس طرح لہراتے دیکھ کر لوگ اندازے لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ بتانا چاہتا ہے کہ اس کے باپ کا سر کاٹ دیا گیا تھا یا پھر یہ کہ وہ ہوا میں بازو لہرا کر تصور ہی تصور میں باپ کے قاتلوں کے سر اس طرح کاٹ کاٹ کر زمین پر پھینک رہا ہے۔ ان دونوں باتوں میں کون سی بات صحیح ہے یہ تو صرف وہ لڑکا ہی بتا سکتا ہے لیکن اس سے پوچھا کیسے جائے۔ وہ تو کہیں رکتا ہی نہیں۔

اب رہی اس کے باپ کے قتل کی بات۔

تو اس کی ذمے دار اس بستی کی صدیوں پرانی روایت ہے جس کے مطابق اس بستی کے بیشتر لوگوں کو ہر وقت سر جھکا کر چلنا پڑتا ہے۔ سر اٹھا کر چلنے والے صرف چند ہی چودھریوں کے گھر ہیں جو اس بستی کی ساری زمین اور پیداوار کے مالک ہیں اور ایک طرح سے ساری بستی کے ان داتا ہیں۔ باقی لوگ صدیوں سے پیڑھیوں سے سر جھکا کر ہی چلتے آئے ہیں۔

انہیں یہ تو معلوم ہے کہ زمین پر روشنی پھیلتی ہے تو کام کرنا ہوتا ہے اور اندھیرے پھیلتے ہیں تو تنگ و تاریک کوٹھریوں میں دبک کر چھپ جانا ہوتا ہے، لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ آسمان پر چمکتا ہوا ہر نیا سورج دنیا کی نئی وسعتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور رات کے اندھیرے میں چمکتے ہوئے چاند اور ستارے نت نئی منزلوں اور بلندیوں کا پتہ دیتے ہیں اور یہ کہ اس سورج کی روشنی میں اور چاند کے حسن میں ان کا بھی حصہ ہے۔ برابر کا حصہ۔

ان کے جھکے ہوئے سروں نے اب تک دیکھا تھا اپنے مٹی میں سنے ہوئے ہاتھوں کو اور دھول سے اٹے ہوئے پیروں کو اور اپنے گرد بکھرے ہوئے کانٹوں اور کنکروں کو جنہیں صاف کرتے کرتے ان کی زندگیاں لہولہان ہو جاتی ہیں۔

انہی لوگوں میں اس لڑکے کا باپ تھا۔ جس نے ایک شام اپنے گھر کی طرف لوٹتے

ہوئے بستی کے چودھری کی اونچی حویلی کی طرف دیکھنا شروع کیا تو جیسے جیسے وہ حویلی فضا میں اونچی ہوتی چلی گئی ویسے ویسے اس کی نظر بھی اوپر اٹھتی گئی اور ساتھ ہی اٹھتا چلا گیا اس کا سر۔

اب اس کی نظر حویلی کی سب سے اونچی کھڑکی پر جمی تھی جس میں بجلی کی روشنی اس طرح چمک رہی تھی جیسے چاند آسمان سے اُتار کر اس کھڑکی میں لیمپ کی طرح رکھ دیا گیا ہو۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ تو کیا سچ مچ چودھری نے چاند اتار کر اپنی کھڑکی میں رکھ دیا ہے۔ اس نے کھڑکی کے پیچھے چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھا۔ چاند کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر اس نے اپنا سر پوری طرح اوپر اٹھا کر آسمان کھنگال ڈالا۔ وہاں انگنت ستارے پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی اسی بلندی پر چودھری کی کھڑکی میں چمک رہا تھا آسمان کا چاند۔

اس چاند کو دیکھنے کے لئے اس کا سر کافی دیر تک اونچا اٹھا رہا تو اسے سر اٹھا کر چلنا اچھا لگا۔ سر اٹھا کر چلنے سے اسے ایسا لگا جیسے اسکا وجود اونچا ہو رہا ہو۔ جیسے چاند اس کے سر کے قریب چمک رہا ہو پھر اس نے سوچا کہ جو چاند چودھری کی کھڑکی میں چمک سکتا ہے وہ اس کے سر پر بھی چمک سکتا ہے اس کے اور اس کے ہزاروں ساتھیوں کے اندھیرے گھروں میں بھی چمک سکتا ہے۔

اپنی زندگی میں چاند کے چمکنے کی خواہش پیدا ہوتے ہی اس پر نشے کا سا اثر ہوا اور دوسرے لمحے اس کے ہونٹ کچھ گنگنا رہے تھے، جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔ ’’سر اٹھا کے چلو......‘‘ اور پھر اس نغمے کی آواز کچھ اونچی ہوئی۔ کچھ اور اونچی۔ اس کے اپنے کانوں کو وہ آواز اچھی لگی جیسے وہ نہیں بلکہ کوئی دوسرا آدمی اپنے نغموں سے اس کے وجود میں رس گھول رہا ہو۔ پھر اس کی آواز اتنی اونچی ہو گئی جیسے وہ اپنا گیت آسمان کے ستاروں کو سنانا چاہتا ہو۔ جیسے وہ اپنی آواز کے سہارے ان ستاروں کو اسی لمحے توڑ کر لانا چاہتا ہو....

تبھی کوئی گھڑ سوار نہ معلوم کب اس کے پاس سے گزرا تھا اور اس کی گردن تن

سے کٹ کر الگ ہو گئی تھی۔ اس کے پہلے نغمے کی تان آسمان کی بلندی سے یک لخت زمین پر گری اور اس نے لہو لہو ہو کر دم توڑ دیا۔

اور تب سے اس باپ کا لڑکا دہشت زدہ ہو کر پاگلوں کی طرح اس بستی میں اسی طرح دوڑ تا رہا ہے اور اس بستی کے لوگ اسی طرح سر نیچا کیے چلتے رہے ہیں۔ بلکہ اس قتل کے بعد سے ان کے سر پہلے سے بھی زیادہ جھک گئے تھے۔ ہاں البتہ اس پاگل بچے کی ضرورتوں کا انہیں ضرور احساس ہے۔ وہ اس کے لئے کھانے کا سامان کسی مخصوص پیڑ کے تنے پر رکھ دیتے تھے جہاں وہ رات کے اندھیرے میں پتہ نہیں کب آتا۔ ڈرا اور سہا ہوا اور کھانا کھا کر پھر اسی طرح دوڑنا شروع کر دیتا۔

پھر ایک دن گاؤں کا ایک اور نوجوان جس کے کھیت چھن چکے تھے اور جو بے کاری کی گہری کھڈ میں پھینک دیا گیا تھا اسنے اپنے تین دوستوں سے بڑی رازداری سے مشورہ کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح زندگی میں سر جھکا کر چلتے چلتے میں تنگ آ گیا ہوں اور میرا دل کرتا ہے کہ آج سے میں بھی اس پاگل لڑکے کے پیچھے پیچھے بھاگنا شروع کر دوں۔

اس کے دوستوں نے بھی دبی زبان میں کہا کہ وہ بھی ایک عرصے سے کچھ اسی طرح محسوس کر رہے ہیں۔ اور اس زمین پر گردن اٹھا کر چلنے کے لئے وہ بھی بے چین ہیں۔ اور اس دن یہ ہوا کہ اس بستی میں ایک ساتھ چار خون ہو گئے۔ برسوں پہلے ہوئے خون اور اس خون میں فرق یہ تھا کہ تب صرف ایک سر اٹھا تھا جو قلم ہو گیا تھا اور اب کی ایک ساتھ چار سر قلم ہوئے تھے۔

اس دلدوز واقعے کے بعد جہاں بستی والے لوگوں کے سر زمین کی طرف اور زیادہ جھک گئے ہیں وہاں بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی ہے کہ وہ سب ایک ساتھ سر اونچا اٹھا لیں...... اور پھر جو ہو سو ہو۔

اور ....اور ....وہ جو پاگل لڑکا ہے اس کے بھاری زخمی قدموں سے اور

زیادہ خون رسنے لگا ہے لیکن اس میں ادھر ایک خاص تبدیلی یہ آئی ہے کہ دوڑتے ہوئے وہ اپنا سر اونچا اٹھا کر رکھنے لگا ہے اور شاید اس کے کانوں میں یہ بھنک پڑ گئی ہے کہ وہ دن اب بہت دور نہیں جب اس کے گاؤں کے تمام دبے کچلے لوگ ایک ساتھ سر اٹھا کر اس کے ساتھ دوڑ میں شامل ہو جائیں گے۔

اسی لئے اس کی رفتار اور تیز ہو گئی ہے اور تیز۔

✓

ایک گاتھا

دھرم گرنتھوں میں آیا ہے کہ پرانے زمانے میں ایک مہارشی اس دھرتی کے بیچ و بیچ ایک گھنے جنگل میں تپ کیا کرتے تھے۔ ایک بار ان کے من میں آیا کہ یہ توست یُگ کا زمانہ ہے۔ ہر طرف سچ کا، انصاف کا دور دورہ ہے۔ لیکن ست یُگ کے بعد آنے والے لوگوں کو بڑے دکھ اٹھانے پڑیں گے۔ اس لئے کوئی ایسا اپائے کیا جائے کہ یا توست یُگ کی میعاد بڑھ جائے یا آنے والے یگوں میں لوگوں کو کم سے کم دکھ اٹھانے پڑیں۔ اس مسئلے کا حل سوچتے سوچتے آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ست یُگ کی میعاد تو بڑھائی گھٹائی نہیں جاسکتی۔ یہ تو پرماتما کے نیَم میں دخل ڈالنے والی بات ہوگی۔ اس لئے اگر میں آنے والے لوگوں کے کلیان اور بھلائی کے لئے گھور تپسیا کروں تو ہو سکتا ہے کہ ان کے دکھوں میں کسی حد تک کمی ہو جائے۔

بس ان کے من میں یہ آنا تھا کہ مہارشی نے سمادھی پر بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جب وہ پورن سمادھی کی کیفیت میں رہیں گے تو اسوقت ان کے مادی جسم کی دیکھ

بھال کون کرے گا؟۔ یہ ان کے لئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ انھوں نے اسی وقت اپنے یوگ بل سے ایک رشی کنیا کو جنم دیا اور اسے سارے کام کاج سمجھا بجھا کر مہارشی اپنی کٹیا کے اندر دھونی رما کر سمادھی پر بیٹھ گئے۔

رشی کنیا کا روز کا معمول یہ تھا کہ صبح اٹھ کر پاک صاف پانی میں اشنان کر کے مہارشی کو پرنام کرتی، دھونی کی آگ کو تیز کر دیتی۔ لکڑیاں کم ہوں تو اور ڈال دیتی فالتو راکھ اٹھا کر باہر پھینک دیتی، پھر کٹیا کو جھاڑ پونچھ کر بگیا سے تازہ پھول توڑ کر مہارشی کی کٹیا کو سگندھ سے بھر دیتی۔ دن کے وقت یا شام کو دیئے کی لو میں وہ بھی اکثر آلتی پالتی مار کر سمادھی میں گم مہارشی کو ایک ٹک دیکھتی رہتی تھی۔ ایسے موقعوں پر مہارشی کے ماتھے پر چمکتے ہوئے نور کی لو اسی دھونی میں چمکتی ہوئی آگ کی کسی ننھی سی لپٹ کی طرح لگتی اور وہ سوچتی کہ اس روشنی کی مدد سے دنیا سے دکھوں کا اندھیرا دور ہو سکتا ہے وہ سوچتی، مہارشی کی تپسیا کامیاب ہو گئی تو آنے والے یگوں میں لوگوں کا کلیان ہو جائیگا۔

اس طرح وقت گزرتا رہا۔

کچھ دیر بعد جب رشی کنیا نے اپنے آپ کو اکیلا محسوس کیا تو اس نے بھی یوگ مایا سے کچھ رنگ برنگے پھولوں کی کایا بدل کر ان میں جان ڈال دی اور اس طرح اپنی سہیلیوں کو جنم دے دیا۔ اب وہ دن بھر ان سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی کودتی اور اسی دوران مہارشی کی دھونی کے لئے جنگل کی لکڑیاں بھی بن لاتی۔ اب اکثر ایسا ہوتا کہ مہارشی کا خیال رکھنے کے لئے اپنی ذمے داری کچھ دیر کے لئے کٹیا کے دروازے پر پہرہ دے رہے شیروں یا کٹیا کے چاروں طرف چکر کاٹتے ہوئے ناگ ناگن کو دے کر رشی کنیا اپنی بال سہیلیوں کے ساتھ مل کر جنگل کے پیڑوں پر چڑھ کر ٹہنی ٹہنی گھومتی۔ سب سہیلیاں مل کر جنگل کے پھل پھول توڑتیں۔ کچھ کھاتیں کچھ نیچے گراتیں۔ بیچ بیچ میں وہ کٹیا میں بھی جھانک کر دیکھ لیتیں۔ پھر پیڑوں سے اتر کر وہ سرو در میں تیرتی ہوئی اٹھکھیلیاں بھی کرتیں اور پوجا کے لئے کنول کے پھول بھی توڑ لاتیں۔ ایسے موقعوں پر رنگ برنگے پھولوں کے گیند بنا کر ایک دوسری کو مارنا ان کا سب سے

محبوب کھیل تھا۔

وقت آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔

مہارشی کی سمادھی لگی رہی۔

اور رشی کنیا اور اس کی سکھیوں کی عمر بھی وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ ایک دن رشی کنیا اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کٹیا سے کچھ دوری پر جنگل میں کھیل رہی تھی کہ رشی کنیا نے سنا کہ ایک پیڑ سے چڑیا کے ننھے ننھے بوٹ چیخ چیخ کر سارا آسمان سر پر اٹھا رہے ہیں۔

لڑکیوں نے سوچا ضرور بے چاروں پر کوئی مصیبت پڑی ہے۔

بس پھر کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب لڑکیاں پیڑ پر چڑھ گئیں۔ رشی کنیا سب سے آگے تھی۔ اوپر جا کر وہ کیا دیکھتی ہے کہ ایک چیل چڑیا کے گھونسلے کے عین اوپر منڈلا رہی ہے اور بوٹوں پر جھپٹنے کے لئے پنکھ تول رہی ہے۔

رشی کنیا غصے میں تو تھی ہی، اس وقت اس نے پتہ نہیں دل میں کیا سوچا اور پھر ایک نظر گھور کر جو چیل کی طرف دیکھا تو چیل نے ایسا محسوس کیا جیسے کوئی تیر اس کے جسم میں اترتا چلا گیا ہو اور وہ اسی وقت پنکھ پھڑ پھڑا کر زمین پر گر پڑی۔

چیل کو گرتے دیکھ کر بوٹوں نے سکھ کی سانس لی اور رشی کنیا نے انہیں ہاتھوں میں اٹھا کر ان کے نرم نرم اور گرم پنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور انہیں باری باری چوم لیا۔

جب رشی کنیا ان بوٹوں کو واپس اپنے گھونسلوں میں رکھ رہی تھی تو اس نے یوں محسوس کیا جیسے گھنی گہری اور میٹھی خوشبو کا جھونکا اس کے پاس سے گزر گیا ہو۔ ”یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے؟“ رشی کنیا نے من ہی من میں سوچا اور پھر چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ وہاں تو کچھ نہیں تھا، سوائے پیڑوں کی اوپری شاخوں کے۔ چاروں طرف نیلا آسمان پھیلا ہوا تھا اور آسمان کے نیچے سنہری دھوپ دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

اتنی ساری دھوپ ایک ساتھ دیکھ کر رشی کنیا کا دل کھل اٹھا اور پھر......

''ارے یہ خوشبو۔ اتنی ڈھیر سی خوشبو کہیں دھوپ کے کن ہی پھول بن کر تو نہیں کھل اٹھے۔ پھر اس نے کچھ سوچا اور نچلی ٹہنی پر بیٹھی اپنی ہم جولی سے پوچھا۔ ''اری تم کو بھی خوشبو آرہی ہے؟''

''ہاں آرہی ہے'' ایک کے بجائے سب کی سب ہم جولیوں نے جواب دیا۔

لیکن کہاں سے؟ یہاں تو کوئی پھول نہیں ہے۔''

''ہے'' ہمجولیوں نے کھل کر ہنستے ہوئے کہا۔

''کہاں ہے؟''

اور رشی کنیا کی سب ہم جولیاں اس کی طرف دیکھتی ہوئی ایک مرتبہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ''پھول ہے اور ابھی ابھی کھلا ہے۔''

''کہاں؟ کب'' رشی کنیا نے حیران ہو کر ایک مرتبہ پھر اپنے چاروں طرف دیکھا۔

''اری پگلی۔ ابھی جب تم چڑیوں کے بوٹوں کو چوم رہی تھیں تو تمہارے چہرے کا رنگ گلنار ہو گیا تھا۔''

''لیکن یہ خوشبو''

''ہاں یہ تمہارے اپنے جسم سے ہی آرہی ہے'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک مرتبہ پھر ہنس پڑیں اور ان کی ہنسی میں رشی کنیا کی شرمیلی ہنسی بھی شامل ہو گئی۔

اور پیڑوں کے پتے خوشی سے جھوم اٹھے۔ تالیاں بجانے لگے۔

رشی کنیا جوان ہو گئی تھی۔ اور ساتھ ہی اس کی سکھیاں بھی۔

اس واقعہ کے کچھ دن بعد کی بات ہے۔ رات کا سماں تھا۔ آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر۔ اچانک رشی کنیا کی نیند ٹوٹ گئی۔ اسنے اٹھ کر کٹیا کے چاروں طرف دیکھا۔ اس کی ساری سکھیاں سہیلیاں گہری نیند سو رہی تھیں۔ کٹیا کے دوسرے حصے میں دیا جل رہا تھا اور مہارشی اسی طرح سمادھی میں ڈوبے انتر دھیان تھے۔ تبھی رشی کنیا کی نظر باہر کی طرف

پڑی۔ وہاں چاندنی کچھ اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے باہیں پھیلا کر رشی کنیا کو باہر آنے کا نمنترن دے رہی ہو۔ رشی کنیا نے اپنے بکھرے ہوئے لمبے بال سمیٹے اور باہر چاندنی میں آگئی۔ وہاں بگیا کے پودے، پھول، جنگل کے پیڑ، سامنے سرودر کی طرف جاتا ہوا راستہ ہر چیز چاندنی میں نہائی ہوئی تھی اور چاندنی امرت کی پھوہار بن کر رشی کنیا کے روئیں روئیں کو چھیدتی ہوئی جیسے اس کے وجود کی تہوں میں کہیں داخل ہوتی جارہی تھی۔ خوشی سے شرابور ہوکر اس کا من جھوم اٹھا اور خود بخود اس کے پاؤں سرودر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر ہولیے۔

سرودر میں چاروں طرف پھیلے ہوئے پھولوں نے اپنی سوئی سوئی آنکھوں سے جب رشی کنیا کو آتے دیکھا تو وہ اپنی نیند تج کر کچھ اس طرح اکٹھے ہوگئے کہ ان سے کنول کے پھولوں کی ایک بڑھیا ناؤ بن گئی۔

رشی کنیا کو پھولوں کی یہ ادا بہت بھلی لگی اور وہ ناؤ پر سوار ہوگئی۔

ناؤ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی اور رشی کنیا اپنے اردگرد پھیلے ہوئے خوب صورت نظارے کو اپنی آنکھوں میں بسا رہی تھی۔ چاروں طرف دور دور تک پھیلا ہوا جنگل چاندنی کی چادر اوڑھ کر سو رہا تھا۔ اس کے سامنے سرودر کے ہلکورے کھاتے ہوئے پانی پر تو تصویر اور خوب صورت ہوگئی تھی۔ نیلے پانی پر چاندنی کی پرت چڑھی ہوئی اور اس کے نیچے ایسا لگتا تھا جیسے سارا آسمان جھیل میں اتر آیا ہو۔ ہلکا نیلا آکاش، آکاش پر جھلملاتے تارے گول گول سا نورانی چاند سب کچھ تو جھیل کے اندر جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ پھر جنگل کے پیڑوں کے سائے بھی جھیل کے پانی میں نہانے چلے آئے تھے۔

تبھی ناؤ کے پاس ہی چھپ کی آواز ہوئی۔ رشی کنیا نے ادھر گھوم کر دیکھا تو ایک جل پری ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ رشی کنیا کو اپنی طرف متوجہ پاکر جل پری نے اسے پرنام کرتے ہوئے ایک بڑا قیمتی موتی رشی کنیا کے چرنوں میں رکھ دیا۔

"اور یہ مہارشی کی بھینٹ" جل پری نے ایک اور بڑا سا موتی رشی کنیا کے ہاتھ پر رکھا۔

"لیکن وہ تو سمادھی میں ہیں"۔ رشی کنیا نے کہا۔

ان کی سمادھی ٹوٹنے والی ہے۔ اس لئے میں نے سوچا۔

"ان کی تپسیا ختم ہونے والی ہے یہ تمہیں کیسے معلوم؟" رشی کنیا نے پوچھا۔

"ہم جل پرانیوں کو دھرتی پر ہونے والی خاص گھٹناؤں کا تھوڑا بہت گیان تو رہتا ہی ہے۔ رشی کنیا۔"

رشی کنیا اسے کچھ اور پوچھنے ہی والی تھی کہ اس نے دیکھا کہ جل پری نے سرودر میں چھلانگ لگائی اور نیچے ہی نیچے اترتی چلی گئی۔ رشی کنیا کی نظر اس کا پیچھا کر رہی تھی لیکن جل پری کا پاتال کا سفر کہیں ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ تبھی رشی کنیا نے دیکھا کہ جل پری تو کہیں غائب ہو گئی ہے اور اسے کوئی اور ہی دنیا دکھائی دے رہی ہے۔ رشی کنیا کو اندازہ ہو گیا کہ وقت کی حدوں کو پاٹ کر وہ آنے والے کل جگ کے دور کی دنیا کو دیکھ رہی ہے۔

رشی کنیا کیا دیکھتی ہے کہ ہر طرف بھوک اور بیماری کا دور دورہ ہے۔ غریبی اور دردرتا نے ہر طرف پاؤں پھیلا رکھے ہیں۔ لوگ دکھ اور درد کے جال میں پھنسے سٹپٹا رہے ہیں اور نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ ماں بچے کو بیچ رہی ہے۔ بیٹا باپ کو دھوکہ دے رہا ہے۔ انسان، انسان کا دشمن ہو رہا ہے۔ اندھیرے مکانوں میں لوگ ایسے زندگی گزار رہے ہیں جیسے گندی نالیوں میں کلبلاتے ہوئے کیڑے اور ان کے اندھیری زندگی میں روشنی کا کوئی گزر نہیں۔

یہ سب دیکھتے ہوئے رشی کنیا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور اس نے سوچا کہ اچھا ہی ہے کہ مہارشی ان کے کلیان کے لئے تپ کر رہے ہیں۔ بھگوان کرے کہ ان کا تپ سپھل ہو۔

رشی کنیا نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن دوسرے ہی پل وہ پھر نیچے پاتال میں دیکھ رہی تھی۔ رشی کنیا اب کی کیا دیکھتی ہے کہ ایک بیل گاڑی سی ہے جو بیلوں کے بغیر بڑی تیزی سے بھاگتی چلی جا رہی ہے۔ ہائے بھگوان۔ یہ گاڑی بیلوں اور گھوڑوں کے جوتے بغیر کیسے

بھاگ رہی ہے۔ اتنے میں وہ گاڑی رُکی تو رشی کنیا نے دیکھا کہ اس گاڑی میں ایک بڑا ہی خوب صورت آدمی بہت بڑھیا کپڑے پہنے ہوئے بیٹھا ہے اور گاڑی کے رکتے ہی ننگ دھڑنگ بچوں اور ادھ ننگی عورتوں نے اس گاڑی والے کے سامنے ہاتھ پھیلا دیے ہیں۔

"بابو جی کچھ مل جائے۔ پیسہ۔ دو پیسے۔

"کچھ کھانے کو بابو۔ میرا بچہ کئی دنوں سے بھوکا ہے۔" ایک عورت گود میں اٹھائے ہوئے بچے کو دکھاتی ہوئی گڑگڑا رہی ہے۔

لیکن وہ گاڑی والا ان سب سے بیزار انہیں دھتکار رہا تھا گالیاں دے رہا تھا۔

یہ سب دیکھ کر رشی کنیا سے نہ رہا گیا۔ اور وہ زمانے اور وقت کی حدوں کو پار کر کے اس خوب صورت آدمی کے پاس پہنچ گئی۔ "ارے گوتم۔ تمہیں ان اناتھوں کی مدد کرنی چاہیے۔"

اس آدمی نے رشی کنیا کی طرف ایک نظر دیکھا اور بولا۔ ان کی تو نہیں مگر میں تمہاری مدد ضرور کر سکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس آدمی نے بڑی غلیظ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اپنی گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

"چلو چلتی ہو"

رشی کنیا کے کاٹو تو خون نہیں۔ اس نے ایک نظر پلٹ کر اس آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف میلی نظروں سے دیکھتا ہوا بہت ہی بد صورت ہو گیا تھا۔

تو کیا آنے والے زمانوں میں لوگ رشی کنیا کی طرف بھی میلی نظروں سے دیکھیں گے۔ اور وہ بھی گوتم جیسے لوگ۔ رشی کنیا سوچتی سوچتی پسینے سے بھیگ گئی اور اپنی پھولوں کی ناؤ پر واپس آ گئی۔

رشی کنیا پتہ نہیں کب تک پاتال کی دنیا کے خیالوں میں کھوئی رہتی۔ لیکن یہاں سرودر کے پانی پر اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ بڑے زور کا طوفان آ گیا تھا شاید۔ سرودر میں بڑی زور زور کی چھلیں اٹھ رہی تھیں۔ کنول کے پھولوں کی نازک ناؤ ڈانواڈول ہو رہی تھی اور وہ

بے چارے کومل سے پھول بڑی مشکل سے رشی کنیا کو سرودر میں گرنے سے بچا پا رہے تھے۔

اب ادھر تو رشی کنیا اپنی ڈگمگ کرتی ناؤ سے کنارے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی اور ادھر یہ ہوا کہ کوئی ڈراؤنا سپنا دیکھ کر اس کی ایک سہیلی کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس کے جگانے پر باقی سکھیاں جب ہڑبڑا کر اٹھیں تو انھیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ رشی کنیا ان کے بیچ نہیں ہے۔ وہ جلدی سے باہر آئیں تو سرودر کی طرف جاتی ہوئی پگڈنڈی پر ٹوٹی ہوئی شبنم میں پاؤں کے نشان دیکھ کر وہ سب سرودر کی طرف چل دیں جب وہ سرور پر پہنچیں تو رشی کنیا اپنی ناؤ سے کنارے پر اتر رہی تھی۔

"آپ اس وقت یہاں ؟" سکھیوں نے پوچھا۔

ہاں میری نیند ٹوٹ گئی تھی۔ اور آپ۔

"میں نے بڑا ڈراؤنا سپنا دیکھا تھا۔ ایک نے کہا۔ باقیوں نے بھی کہا کہ ڈراؤنا سپنا تو وہ بھی دیکھ رہی تھیں۔

ذرا بتاؤ تو ؟

میں نے دیکھا کہ ......

"ارے جنگل میں آگ لگی ہے۔ باپ رے باپ"

"کدھر"

وہ دیکھو رشی کنیا۔ تمہارے پیچھے سرودر کے اس پار۔

"ارے کہیں کل یگ کی آگ ہمارے زمانے میں تو نہیں چلی آئی" رشی کنیا نے سوچا اور اپنی نظروں ہی نظروں سے آگ کو باندھ دیا تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے بجھ گئی۔

"ارے رشی کنیا۔ دیکھو یہ دو شیر آپس میں لڑتے ہوئے ادھر آ نکلے ہیں لگتا ہے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔"

رشی کنیا نے ان کو بھی گھور کر دیکھا اور وہ دونوں دم ہلاتے ہوئے رشی کنیا کے پاؤں میں آگرے۔

"جاؤ بھاگو۔ آپس میں لڑنا اچھی بات نہیں ہے۔"

اور وہ دونوں شیر جنگل کی طرف ہو لیئے۔

رِشی کنیا یہ آگ یہ پانی، جنگل کے پھول، شیر، جانور، غیر جاندار سب کے سب آپ کی بات کیسے مان لیتے ہیں۔

"مانتے ہیں تبھی تو ست یگ ہے۔ ورنہ کل یگ نہ ہو جائے"۔ رِشی کینا نے کہا۔ "چھوڑو ان باتوں کو۔ تم بتاؤ۔ وہ سپنا کیسا تھا؟"

"سپنا بڑا بھیانک تھا رِشی کنیا۔ کیا بتاؤں۔ میرے تو اس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں کیا دیکھتی ہوں کہ دو آدمی ساتھ ساتھ باتیں کرتے چلے آرہے ہیں۔ اتنے میں میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان میں سے ایک آدمی سانپ بن گیا۔

"سانپ بن گیا۔"

"ہاں سانپ بن گیا اور اپنے ساتھ چلنے والے آدمی کو کاٹ لیا۔

"پھر کیا ہوا؟"

اس کے بعد اُسی سانپ کی کوکھ سے سینکڑوں ہزاروں سانپ نکل کر دھرتی پر پھیل گئے اور انھوں نے پوری زمین کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ میں نے دیکھا رِشی کنیا کہ ان سانپوں کے ڈر سے سمندر سوکھے جا رہا تھا اور بڑے بڑے پہاڑ ڈر کے مارے کانپ رہے تھے۔ اور ان کانپتے ہوئے پہاڑوں سے یہ بڑے بڑے پتھر نیچے گرتے تھے اور لوگ ان پتھروں سے بچنے کے لیے ڈر کے مارے بھاگ رہے تھے۔ لیکن بھاگ کے جاتے کہاں۔ سب ان کے نیچے آکر کچلے جاتے تھے۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ رونا دھونا تھا اور...... رِشی کنیا سپنا سنتے سنتے سرودر کی تہہ میں دیکھتے ہوئے دردناک واقعات میں کھو گئی اور اُداس ہو گئی۔

جب وہ سب واپس کٹیا میں پہنچیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ کٹیا کی بگیا کے تمام پھول اِس طرح گر کر زمین پر بکھرے ہوئے تھے جیسے بہت بڑے طوفان نے پودوں کو جھنجھوڑ دیا ہو۔

کٹیا کے اندر جا کر رشی کنیا کو احساس ہو گیا کہ مہارشی کی سمادھی ٹوٹنے والی ہے۔ ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ مکمل سکون کی کیفیت سے نکل کر مادی دنیا کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ وہ اور اس کی سکھیاں مہارشی کے سامنے ہی چپ چاپ بیٹھ گئیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مہارشی کی اندریاں آہستہ آہستہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے مانوس ہو رہی ہیں۔ یہ تبدیلی بہت ہی آہستہ آہستہ آرہی تھی لیکن یہ صاف ظاہر تھا کہ تبدیلی آرہی ہے۔ اس لئے رشی کنیا نے کمنڈل میں صاف جل بھر کر رکھ دیا۔ کچھ پھول باہر سے وہ خود لے آئی۔ کچھ سکھیوں کو بھیج کر سرور سے منگوا کر رکھ دیے۔ وہ سارے انتظام کر کے ہٹی ہی تھی کہ مہارشی کی سمادھی پوری طرح ٹوٹ گئی اور انہوں نے اوم اوم کا اچارن کرتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

مہارشی سروور میں اشنان کرنے کے بعد جب واپس اپنے آسن پر آکر بیٹھے تو وہ خوش نہیں لگ رہے تھے۔ پھر بھی رشی کنیا نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔ "آپ کا تپ سپھل رہا؟"

مہارشی تھوڑا سا مسکرائے اور بولے "بھگوان کی اِچھا کچھ اور ہے۔"

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر مہارشی بولے۔ "بگیا کے سارے پھول گرے ہوئے ہیں کیا کوئی طوفان آیا تھا۔"؟

"طوفان آیا تھا لیکن سروور میں"

"ہاں۔ اس کا تو مجھے پتہ ہے" مہارشی بولے۔ وہ کچھ دیر چپ رہے اور پھر بولے۔

"رشی کنیا تم نے اپنی سکھیوں کا پریچیہ نہیں کرایا۔"

مہاراج یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ سب کی سب میرا ہی روپ ہیں۔ یہ بتایئے کہ آپ کو سروور کے طوفان کی بات کیسے معلوم ہے۔"

"وہ سب مایا تھی۔" مہارشی بولے۔ "مایا نے ہی آدھی رات کو تمہاری نیند اچاٹ کی تھی۔ مایا نے ہی تجھے اپنی شکتی سے پھولوں کی ناؤ پر بٹھایا۔ مایا نے ہی جل پری بن کر تمہیں

موتی پیش کیا۔

"ارے یہ موتی تو پتھر ہو گیا۔" رشی کنیا مہارشی کے چرنوں میں پتھر دیکھ کر حیران ہو گئی۔

ہاں سب نظر کا دھوکا تھا۔ رشی کنیا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مایا نے ہی سرووَر کے پانی میں تجھے کل جگ کی جھلک دکھائی۔ مایا نے ہی مجھے سمادھی کی اوستھا میں بتایا کہ سرووَر میں طوفان آیا ہے اور رشی کنیا ڈوب رہی ہے۔ اسی لئے مجھے سمادھی توڑ کر تمہاری ڈوبتی ہوئی ناؤ کو کنارے پر لگانا پڑا"

یہ سنتے ہی رشی کنیا کی آنکھوں سے چھم چھم آنسو برسنے لگے تو مہارشی اپنے آسن سے اٹھے اور اسے اپنے گلے سے لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔"

"رشی کنیائیں رویا نہیں کرتیں۔ بھگوان جو کرتا ہے۔ ٹھیک ہی کرتا ہے۔"

"لیکن میری وجہ سے آپ کی سمادھی ٹوٹ گئی۔ آپ کی ورشوں کی محنت بے کار چلی گئی۔

"یہ اچھا ہی ہوا کہ سمادھی ٹوٹ گئی۔ کنیا جوان ہو جائے تو باپ کی سمادھی ٹوٹنی ہی چاہئے۔ اس کی شادی کی فکر کرنی ہوتی ہے۔ اس لئے۔

نہیں۔ مہارشی۔ نہیں۔ میں اپنے آپ کو دوشی محسوس کر رہی ہوں۔ ایسی صورت میں تو.........

"شادی تو تمہاری بھی ہونی چاہئے اور تمہاری سکھیوں کی بھی۔ تم تو مجھے یہ بتاؤ کہ بر کیسا ہونا چاہئے۔؟"

رشی کنیا کچھ دیر خاموش رہی۔ مہارشی نے دوبارہ پوچھا تو بولی۔ "اگر ایسا ہی ہے تو میں شادی ایسے ویکتی سے کروں گی جو آنے والی دنیا کو ان دکھوں سے بچا سکے جن کی ایک جھلک دیکھنے سے ہی میرا دل تڑپ اٹھا تھا جن کی وجہ سے سرووَر میں طوفان آگیا تھا جنگل میں خود بخود آگ لگ گئی تھی اور بگیا کے سارے پھول ٹوٹ کر گر گئے تھے۔"

"ہماری بھی یہی اچھا ہے۔" رشی کنیا کی سکھیاں ایک آواز ہو کر بول پڑیں۔

مہارشی نے بڑے پیار سے ایک بار رشی کنیا کی طرف دیکھا اور پھر اس کی سکھیوں کی طرف۔ پھر وہ اسی وقت ان کے لئے مناسب بَر کی تلاش میں نکل پڑے۔

مہارشی کا یہ سفر ان کی تپسیا سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ اس بات کو ہزاروں سال بیت چکے ہیں۔ رشی کنیا اور اس کی سکھیاں گھنے جنگل سے گھرے اپنے آشرم میں اب بھی انتظار کر رہی ہیں۔ مہارشی ابھی تک نہیں لوٹے۔

✔

سم ترم

غریب غربا کی اس چھوٹی سی بستی میں سم ترم کو خدا بنادئے جانے کا سلسلہ بہت آہستہ آہستہ شروع ہوا۔

ہوا یہ کہ ....

لیکن ذرا ٹھہریئے۔ سم ترم کے بارے میں آپ کو تھوڑا سا تو بتادوں۔

سم ترم کون ہے ؟ کیا ہے ؟اس کے بارے میں بستی کا کوئی بھی آدمی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ کئی کہتے ہیں کہ یہ اسی بستی کا رہنے والا ہے۔ غریبی سے پیدا ہونے والے مصیبتوں کے پہاڑ کو اٹھائے اٹھائے جب اس کا وجود درد سے کراہ اٹھا تو دکھوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے بھاری بوجھ کو زمین پر پٹخ دیا اور اس بستی کے چوراہے پر آکر کھڑا ہو گیا اور منہ اٹھا اٹھا کر گردن کو جھٹکے دے دے کر یوں سم ترم، سم ترم بولنے لگا جیسے غریبی سے اپنی نجات کا اعلان کر رہا ہو۔ کئی کہتے ہیں یہ اس بستی کا نہیں ہے۔ خدا نے ہی اسے اس بستی والوں کے کلیان کے لئے یہاں بھیجا ہے۔

بات کچھ بھی ہو سم ترم اپنا پتلا دبلا جسم لئے، میلا سا پھٹا پرانا چوغا پہنے اس بستی کے چوراہے پر ہر وقت کھڑا رہتا ہے اور سم ترم، سم ترم بولتا رہتا ہے۔

پہلے پہل کوئی اس کی طرف دھیان نہیں دیتا تھا۔

کسی کو فرصت نہیں تھی یہ جاننے کی کہ اس چوراہے پر کھڑا ہو کر یہ سم ترم سم ترم کیوں بولتا رہتا ہے۔ آخر اس لفظ کے معنی کیا ہیں؟

کبھی وہ اس کے بارے میں بات بھی کرتے تو کچھ اس طرح ہوتی۔

"میرا خیال ہے یہ ام تم کہتا ہے۔ جس کا مطلب ہے ہم اور تم۔"

"نہیں یہ تو کہتا ہے اب گواب گو۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ پونت پونت کہتا ہو۔"

کہتا یہ کچھ بھی ہو لیکن اس بات پر سب کو اتفاق تھا کہ یہ جو کچھ بولتا ہے۔ اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔۔یہ کوئی لفظ نہیں محض آواز ہے۔ کئی کہتے ہیں یہ ہے تو کوئی لفظ ہی مگر ہے بے معنی۔ اور یہ بے معنی سا لفظ بولنے والا یہ شخص اس چوراہے سے گزرنے والی دنیا کے لئے بے معنی پوری طرح غیر اہم غیر ضروری ہو کر اسی چوراہے پر کھڑا سم ترم بولتا رہتا تھا۔

اس کی آواز چاروں طرف گونجتی رہتی۔ فضا میں ہر طرف تیرتی رہتی۔ ان لوگوں کے کانوں میں شیشہ بن کر پگھلتی رہتی، جو دنیا کے بہت ضروری کاموں میں پھنسے ہوئے اس چوراہے سے تیز تیز نکل جاتے اور ان کو یہ جاننے کی بھی کبھی فرصت نہ ملتی کہ یہ کون ہے؟ اور اس چوراہے پر کیوں کھڑا ہے؟

پھر بھی سم ترم سم ترم کی آواز بہت دور تک ان کا پیچھا کرتی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

"میں ہوں میں ہوں۔"

ایک دن کسی نے اٹکل لگائی۔

"یار کہیں یہ ستیم شوم سندرم ہی نہ کہتا ہو۔"

"کیوں تمہیں یہ خیال کیسے ہوا؟"

"ایک دن ایک بوڑھا سنیاسی اسی چوراہے سے گزرتا ہوا ستیم شوم سندرم کا پاٹھ کر رہا تھا"

"یہ تو ہزاروں سال پہلے کی بات ہے اور پھر یہ لفظ بھی اسی سنیاسی کی طرح بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اب ان کے کوئی معنی نہیں رہ گئے۔"

معنی کیوں نہیں رہ گئے ستیم شوم سندرم ہی سب سے بڑی سچائی ہے اور سچائی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ میں تو کہتا ہوں یہ ستیم شوم سندرم ہی بولتا ہے۔"

"یہ تو سم ترم سم ترم ہی کہتا ہے۔ تم خود سن لو"

"بھائی یہ اس کا بگڑا ہوا روپ بھی تو ہو سکتا ہے۔ بالمیک بھی تو رام رام کی بجائے مرا مرا کہا کرتا تھا۔"

"اب بالمیکیوں کے پیدا ہونے کا زمانہ ختم ہو گیا۔ یہ بوڑھا وقت اب کسی بالمیک کو جنم نہیں دے سکتا اب تو اسی سم ترم سم ترم کا زمانہ ہے۔ سم ترم جو کوئی لفظ نہیں محض آواز ہے جس کے کوئی معنی نہیں۔"

"میں تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ وقت بوڑھا ہو گیا ہے۔ وقت کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔"

تم کیا سمجھتے ہو کہ صرف ہم ہی بوڑھے ہوتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں۔ ارے میاں، وقت بھی ہماری آپ کی طرح بوڑھا ہو رہا ہے۔ اس کے جسم کی طاقت بھی آہستہ آہستہ کم ہوتی رہتی ہے تم دیکھ لینا ایک دن ایسا آئے گا جب یہ بھی ہماری آپ کی طرح دم توڑ دے گا۔"

"اور پھر ہمارا کیا ہو گا؟"

"ہم سب سم ترم ہو جائیں گے۔ ایک بے معنی آواز جس کی حقیقت اس بلبلے سے زیادہ نہیں جو پانی کی سطح پر بنتا ہے تھوڑی دور چلتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ٹوٹ جاتا ہے۔"

پھر ایک دن یہ ہوا کہ گھڑ دوڑ میں پیسہ لگانے والے ایک جواری نے سم ترم کو ایک دوسری شکل میں پہچانا۔ وہ اس دن بے حد مایوس تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنی تمام تمنائیں، بیوی

کے ہونٹوں کی مسکان، بچوں کی پرورش، باپ دادا کی عزت، سب کچھ گھڑ دوڑ کے میدان میں ہار چکا تھا۔ اس کو لگ رہا تھا جیسے اس کی زندگی کی تمام خوشیاں گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے روندی جا چکی ہوں اور اب اس کے لئے کچھ بھی باقی نہ بچا ہو۔ تبھی ایک شرابی کی بات یاد آتے ہی اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکان ابھری۔ اس کے دماغ میں امید کی لو کوندی۔ شرابی کا واقعہ یہ تھا کہ ایک بار جب وہ شراب کے نشے میں دھت ساری رات گندی نالی میں پڑا رہا تھا اور اگلے دن جب لوگوں نے اسے دیکھا تو پہلے تو وہ اسے کسی طرح ہوش میں لائے اور پھر اس کا منہہ کالا کر کے ایک گدھے پر بٹھا کر اس کے گھر کی طرف چل دیے۔ گدھے پر بیٹھے بیٹھے شرابی نے دیکھا کہ زمین پر ایک روپے کا سکہ گرا پڑا ہے۔ اسنے جھٹ پٹ گدھے سے چھلانگ لگائی۔ اس روپے کو مٹھی میں تھاما اور پھر بھاگتا ہوا شراب کے ٹھیکے پر پہنچ گیا۔

اس کہانی کو یاد کر کے اس گھوڑ دوڑ کے جواری پر بھی امید کی کرن چمکی۔ اتفاق سے اس کے کانوں میں سم ترم کی واز پڑی اور وہ بھاگ کر اس کے پاس آیا اور اپنا سوال داغ دیا۔ "مالک آج کس نمبر کا گھوڑا جیتے گا۔"

سم ترم نے اس کی آواز سنی بھی نہیں۔ اس نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں اور اپنی پرانی ادا سے گردن کو جھٹکے دے دے کر سم ترم سم ترم بولتا رہا۔

لیکن اس جواری نے اپنا مطلب نکال لیا۔ اس نے تین دفعہ سم ترم کہا ہے اور دو دفعہ سر کو جھٹکا دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے تین جمع دو۔ پانچ نمبر کا گھوڑا جیتے گا۔ بس اسی وقت وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اور اس دن پانسہ ایسا پڑا کہ ایک ہی دوڑ میں اسنے وہ سب کچھ جیت لیا جو وہ اپنی زندگی میں ہار چکا تھا۔ اس دن وہ خوش خوش لڈوؤں کا ڈبہ لے کر سم ترم کے پاس آیا تو سم ترم نے ہاتھ مار کر اس کے لڈوؤں کو گرا دیا۔ اور گردن کو جھٹکے دے دے کر سم ترم سم ترم کا ورد شروع کر دیا لیکن وہ جواری ہمت نہیں ہارا۔ اس نے دیکھا ڈبے میں سات لڈو بچے تھے اس سات کے ہندسے میں بھی اس نے ایک اشارہ ہی سمجھا اور اگلی ریس میں سات نمبر پر پیسہ لگا کر اپنی خوشیوں کو پہلے سے دگنا کر لیا۔

اس دن سے اس جواری نے لوگوں کو بتانا شروع کیا۔ بڑا پہنچا ہوا فقیر ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ اس مہارشی کا اوتار ہے۔ جس نے دنیا کو ستیم شوم سندرم کا پیغام دیا تھا۔ اور اس کے بعد وہ اپنے بدلے ہوئے دِنوں کی کہانی ہر ایک کو سناتا۔

اس دنیا میں کسی کو پیسے کی تمنا تو کسی کو نوکری کی، کسی کو رہنے کے لئے چھت چاہئے تو کسی کو بیماری سے نجات، اس بستی کے غریبوں کے ہاں کال تھا تو خوشیوں کا، خواہشوں کی کمی تھوڑی تھی۔

جس کی خواہش پوری ہو جاتی اس کے لئے تو وہ خدا سے بھی بڑھ کر تھا۔ ان کو اس کے چہرے کی پژمردگی، پیلی رنگت اور بہت اندر تک دھنسی ہوئی آنکھوں میں خدا کا نور دکھائی دیتا اور چیتھڑا چیتھڑا چوغے کو وہ فقیری شان بتاتے۔

بے چارے غریبوں نے خدا بھی چنا تو اپنے جیسا۔ غریب ہی۔ مند حال۔ وہ کہتے:۔

"میں نے خود سنا ہے۔ ایک دن کچھ سنت ستیم شوم سندرم کا اچارن کرتے وقت اس چوراہے سے نکل رہے تھے تو مجھے اس کے سم ترم سم ترم کی آواز میں زیادہ سچائی دکھائی دی۔"

"ایک دن ایک نیتا چوراہے پر کھڑا بھاشن دے رہا تھا۔" بھائیو یہ سرکار آپ کی سرکار ہے آپ کے لئے ہے۔ اس لئے غریبی دور ہونی چاہئے اور مجھے لگا جیسے اس کی سم ترم کی آواز اس سے کہہ رہی تھی۔" یہ بات تو ہم ہزاروں سالوں سے سن رہے ہیں۔ غریبی دور کرنی ہے تو کر ڈالو۔ اس میں بھاشن دینے کی کیا ضرورت ہے۔"

لیکن سم ترم خود ان باتوں سے بے خبر تھا۔ وہ تو اپنی دھن میں گردن کو جھٹکے دے دے کر سم ترم سم ترم کی آوازیں نکالتا رہتا۔ اسے مطلب تھا تو صرف سم ترم کہنے سے دنیا کی کسی اور بات سے نہیں۔

اس طرح وقت گزرتا رہا۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس چوراہے پر بڑی تبدیلی ہوگئی۔بستی سے کچھ فاصلے پر کوئی مل بن گئی۔ اوراس کے ساتھ ہی اس بستی میں بھی تبدیلی آنی شروع ہو گئی۔ پہلے تو سڑک بڑی چوڑی ہوگئی۔ چوراہا پہلے سے دوگنا ہو گیا ور چوڑی سڑک کے کنارے کی جھونپڑیاں بڑے لوگوں نے خرید لیں اوراس سڑک کے دونوں طرف بڑی بڑی پکی عمارتیں بن گئیں۔ان میں نیچے دوکانیں تھیں اوراوپران دوکانوں کے مالک رہتے تھے۔

اب چوارہے پر کافی ہنگامہ رہتا تھا۔

لیکن سم ترم اس چوراہے کے بیچ و بیچ کھڑا ہو کراسی طرح گردن کو جھٹکے دے دے کر سم ترم کہتا رہتا تھا۔

بستی کے وہ غریب لوگ جو اسے خدایا خدارسیدہ آدمی سمجھتے تھے اب ان کے مکان چوراہے سے کافی دور چلے گئے تھے۔ سڑک اور جھونپڑیوں کے بیچ پکی گلیوں کا سلسلہ کافی پیچھے تک چلا گیا تھا لیکن پھر بھی وہ سم ترم کے پاس اپنی منتیں مانگنے آتے رہے۔

اس طرح بے معنی لفظ یا بے معنی آواز نکالنے والا میلا کچیلا چوغا پہنے وہ مسکین سا شخص ان غریبوں کی زندگی میں اسی طرح اہم بنا رہا۔

لیکن اس کی اصل زندگی اس کے مرنے کے بعد شروع ہوئی۔ ایک دن اسی چوراہے پر جب اس کی سم ترم سم ترم کی آواز چاروں طرف بکھر رہی تھی تو اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی اور دھڑام سے گر پڑا شاید گرنے سے پہلے ہی اس کی موت ہو گئی تھی۔

اس کے مرتے ہی جیسے سارا چوراہا زندہ ہو گیا۔

کسی نے کہا سنت ایسے ہی مرا کرتے ہیں۔

کسی نے کہا چوراہا سونا لگتا ہے۔

”وقت اس خلا کو پورا نہیں کر سکے گا۔“

وہ مرا نہیں بلکہ یہیں کہیں الوپ ہو گیا ہے۔

نہیں وہ الوپ نہیں ہے۔ ہم سب تو اسی کا روپ ہیں۔ ہم سب سم ترم ہی تو ہیں۔

سم ترم کی یاد کو محفوظ رکھنے کے لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس کا ایک قد آدم بت اس چوراہے پر نصب کیا جائے۔

اس بت کو بنوانے کے لئے چندہ دیا ان لوگوں نے جو بڑی بڑی دوکانوں اور مکانوں کے مالک تھے اور انہونں ے ہی بت کو اچھے بت تراش سے بنوایا۔

لیکن جس دن یہ بت نصب کیا گیا اس دن ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔

جھونپڑیوں میں رہنے والے لوگ کہہ رہے تھے۔ یہ تو اس کا بت لگتا ہی نہیں یہ تو کسی راجہ مہاراجہ یا بڑے نیتا یا رئیس کا بت لگتا ہے۔ اس کے چہرے پر تو لالی ہے۔ اس کی آنکھوں میں تو زندگی کی رونق ہے۔ وہ تو ایسا تھا ہی نہیں۔ اس کی آنکھیں تو اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، اس کا چہرہ تو پیلا تھا اور پھر بت کا چوغا کتنا خوب صورت ہے۔ اس کا چوغا تو چیتھڑا چیتھڑا ہوتا تھا اور میلا کچیلا۔ یہ بدل کیسے گیا۔

لیکن بت بنوانے والے لوگوں کا کہنا تھا۔ ”جو آدمی زندگی بھر ننگا رہے، اس کو بھی موت کفن پہنا دیتی ہے۔ اس کی لاش کو ڈھک دیتی ہے۔ یہ دنیا کا اصول ہے۔ اس لئے بت ایسا ہی ہونا چاہئے۔

مگر جنہوں نے سم ترم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ نہیں مان رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان سے ان کا خدا چھین لیا گیا ہے جو ان میں سے تھا۔ ان جیسا تھا اور ان کیلئے تھا۔

لیکن ان کی آواز کی وہاں اہمیت ہی کیا تھی؟

اور سم ترم جس کی آواز کو وہ اپنی آواز سمجھتے تھے اس نے بھی جیسے ان غریبوں کی طرف سے آنکھیں چرا لی تھیں۔ وہ اپنے صحت مند جسم کے اوپر بڑھیا چوغا پہن کر چوراہے پر نصب ہو کر ان لوگوں کا منہ چڑا رہا تھا جنہوں نے اسے اپنا خدا مان رکھا تھا۔

جنگل اداس ہے

آدی باسیوں کی اس ٹولی کے پاؤں جنگل میں ایک ساتھ بہت سے موروں کی ٹولی کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ موروں کی ٹولی میں دو ایک مور جو سب سے آگے تھے، وہ بار بار اپنی گردنیں اکڑائے اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے پنجے بھی نیچے اوپر اٹھا رہے تھے۔آدی باسیوں کو لگا جیسے وہ سب کے سب ایک ساتھ ناچنے کی تیاری کر رہے ہوں۔

اوپر آسمان پر کالے بادلوں کے گروہ حرکت میں تھے۔بادلوں کی ٹولیاں امڈ امڈ کر یوں آرہی تھیں جیسے ایک دوسری سے چہل کر رہی ہوں اور اس طرح بہتے ہوئے پل کے ساتھ گھٹا اور گھنگھور ہوتی چلی جارہی تھی۔بادلوں کے آپس میں ٹکرانے سے کبھی کبھی ان کی گرج چاروں طرف گونج جاتی تو لگتا تھا جیسے بھگوان شیو نے اپنا وشال روپ دھارن کر کے کسی پہاڑ کی تیکھی نوک دار چوٹی پر مستی میں آکر ناچنا شروع کر دیا ہے اور ان کے لمبے کالے بال، افق تا افق بادل بن کر پھیل گئے ہوں اور ان کے ڈمرو کی آواز بادلوں کی گرج بن کر کبھی یہاں گونج اٹھتی کبھی وہاں۔

ایسے میں اس دھرتی پر بھی ہوا دھیرے دھیرے چلنے لگی تھی۔ جنگل کے پیڑوں کی شاخوں کی سرسراہٹ سے جو سنگیت پیدا ہو رہا تھا، اس کی لے ہر پل، ہوا کی تیزی کے ساتھ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے قدرت کی ان بیٹیوں نے رنگ برنگی پوشاکیں پہن کر بادل کی تال پر ناچنا شروع کر دیا تھا۔ جیسے جیسے ہوا کی لہروں میں تیزی آتی جاتی ان شوخ حسیناؤں کے پاؤں کی تھرکن بھی بڑھ جاتی۔

ایسے میں مور بھلا کہاں پیچھے رہ سکتے تھے۔ سب سے اگلے والے مور کے پاؤں میں تھرکن پیدا ہوئی تو پھر سب موروں کے پاؤں اس پر تال دے اٹھے۔ آہستہ آہستہ ان کے پاؤں یوں تھرکنے لگے جیسے قدرت نے اپنی تمام رنگینوں کو ساری خوب صورتی کو ان موروں کے پنکھوں میں بکھیر دیا ہو۔ قدرت نے موروں کے پھیلے ہوئے پنکھوں پر اپنے انمول خزانے سے بہترین ہیرے اور جواہرات نکال کر ٹانک دیئے تھے اور جیسے ہی موروں کے پنکھ پھیلتے تھے ویسے ہی ان ہیرے موتیوں کی چمک بجلی کی کوند کی طرح فضا میں بکھر جاتی۔

ایسے میں آدی واسیوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ ان کے ہاتھ آپس میں کب جڑ گئے۔ کب انہوں نے گول دائرہ بنا کر سارے جنگل ساری دھرتی کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور کب انہوں نے ناچنا شروع کر دیا۔ دھرتی کے ان بیٹوں پر قدرت نے جادو سا کر دیا تھا۔

ایسا لگتا تھا جیسے گھنے بادلوں، ہوا کی لہروں کی تال پر جھومتی ہوئی پیڑوں کی شاخوں موروں کے تھرکتے بکھرتے ہوئے پنکھوں اور ناچتے ہوئے آدی باسیوں کے قدموں اور ان کے گیتوں کے بولوں میں ایک تال میل سا پیدا ہو گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایسا سماں بندھ گیا تھا، جیسے سارا آسمان ساری فضا، سارا جنگل، ساری دھرتی، ساری کائنات، جھوم اٹھی تھی، ناچ اٹھی تھی۔

پاس ہی جھیل کے پانی میں بھی زندگی پیدا ہو گئی تھی۔ پانی کی لہروں سے اوپر اٹھے ہوئے بند کنول یوں کھل اٹھے تھے جیسے قدرت کے چاروں طرف بکھرے ہوئے حسن کو دیکھنے کے لئے انہوں نے آنکھیں کھول دی ہوں۔ وہ بھی جھومنے لگے ناچنے لگے۔

یہ ناچ اس وقت تک چلا۔ جب تک قدرت اپنی موج میں رہی۔ اور جب ناچتے ناچتے قدرت کا من بھر گیا تو کائنات کا یہ ناچ بھی تھم گیا۔ سرسراتی ہوا تھم کر پیڑوں کی ٹہنیوں پر بیٹھ کر آرام کرنے لگی۔ ٹہنیاں بھی ہل جل نہیں رہی تھیں، تاکہ ہوا کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ دور آسمان پر بادلوں کی گھٹا اب پھیکی اور پتلی سی ہو کر سارے افق پر چت لیٹی تھی۔ اس میں اب کوئی حرکت نہیں تھی۔ موروں کے پاؤں بھی تھم گئے تھے اور وہ بھی اپنے پنکھ سمیٹ کر دانہ دنکا چگنے لگے تھے۔

ایسے میں ان آدی باسیوں کے پاؤں بھی تھم گئے۔ سب نے اپنی اپنی ٹوکریوں میں رکھی چاولوں کی پوٹلیاں کھولیں اور چٹنی ملا کر کھانے لگے۔ کھانے کے بعد انہوں نے چاولوں کی شراب پی اور پھر وہ آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔

لگتا تھا جیسے ساری کائنات تھم گئی تھی۔ آرام کر رہی تھی، ہر طرف خاموشی کا عالم تھا۔ پیڑ خاموش تھے سارا جنگل خاموش تھا۔ ہوا خاموش تھی دور افق پر پہاڑوں کی چوٹیوں پر بادل خاموش تھے۔

کہیں کوئی حرکت تھی تو صرف اتنی کہ رنگ برنگی تتلیاں ادھر ادھر پھیلے جنگلی پھولوں پر پھدکتی پھرتی تھیں۔ کبھی اڑ کر یہاں بیٹھتیں۔ کبھی وہاں۔ یا پھر کوئی گلہری ایک پیڑ سے اترتی اور چوکنی سی ادھر ادھر دیکھتی دوسرے پیڑ پر چڑھ جاتی۔

ایسے میں پیڑوں کے پکشی بھی اپنے اپنے گھونسلوں میں چونچوں کو اپنے پنکھوں میں دبائے، آنکھیں میچے پڑے تھے۔ جنگل کی یہ خاموشی کافی دیر تک قائم رہی۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد ہوا پھر سے مدھم مدھم چلنے لگی تو جیسے سارا جنگل انگڑائی لے کر جاگنے لگا۔ ٹہنیوں کے بیچ سے سرسراتی ہوا نے جیسے ایک نغمہ چپکے سے چھیڑ دیا جو لمحہ لمحہ بڑھتا ہوا سارے جنگل میں ایک لطیف سی میٹھی آواز پیدا کر رہا تھا۔ جیسے دریا کی لہریں آپس میں ٹکراتی ہوئی گنگناتی ہیں۔ اس نغمے کو سن کر پکشی بھی چہچہا اٹھے تھے اور ان کے مدھر سنگیت کو سن کر آدی باسیوں کی ٹولی کے کچھ لوگ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور باقی لیٹے لیٹے ہی آنکھیں

کھولے ٹانگیں پسارے کسمسار ہے تھے اور اٹھنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جہاں یہ آدی باسی بیٹھے تھے۔ وہاں ان کے قریب سے ایک شیر دھیرے دھیرے چلتا ہوا اور ان آدمی باسیوں کی بو کو سونگھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ تبھی ایک ہرن آدی باسیوں کے پاس سے ہو تا ہوا ادھر کو جانے لگا، جدھر شیر گیا تھا تو ایک آدمی باسی نے ذرا سا ہاتھ بڑھا کر ہرن کی ٹانگ پکڑلی۔

"ادھر کہاں جاتا ہے۔ تیرا باپ ابھی ابھی ادھر سے گیا ہے۔ اس نے دیکھ لیا تو کچا چبا جائے گا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ہرن کا منہ دوسری طرف کر کے چھوڑ دیا۔

لیٹے لیٹے ہی ایک آدی باسی کی نظر ایک پیڑ کی ٹہنی پر گئی۔ اس ٹہنی کو اپنے بلوں میں جکڑے ہوئے ایک بہت بڑا سا سانپ اپنے سر کو ادھر اُدھر جھلاتا ہوا مستی کے عالم میں جھوم سا رہا تھا۔

اس سانپ کو دیکھتے ہی ایک آدی باسی نے تیر کمان سنبھالا تو دوسرے آدی باسی نے اس کے نشانے کو بھانپتے ہوئے اسے تیر چلانے سے منع کر دیا۔

"جو اپنی طرف بری نظر سے نہ دیکھے اس پر تیر چلانے سے پاپ لگتا ہے۔"

پہلے آدی باسی نے اپنی کمان واپس زمین پر رکھ دی۔

جنگل کی دنیا اب پوری طرح بسی بسائی لگ رہی تھی۔

سر سراتی ہوا گیت گا رہی تھی۔

پکشی چہک رہے تھے۔ کلول کر رہے تھے۔

ایک پیڑ کی ٹہنی پر سانپ جھول رہا تھا۔

جنگلی جانور اپنے چوگے کی تلاش میں چوکنے سے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

آدی باسیوں کی ٹولی کے سبھی آدمی اپنا اپنا سامان ٹوکریوں میں بھر رہے تھے کہ ایک آدی باسی کی نظر اوپر ٹہنیوں کی آڑ میں بنی ایک پیڑ کی کھوہ کی طرف گئی اور وہ مسکرانے لگا۔

"کیوں مسکرا رہے ہو" دوسرے آدی باسی نے پوچھا۔

Library
...man Taraqqi Urdu (Hind)

اس نے پیڑ کی کھوہ کی طرف اشارہ کر دیا۔

وہ آدی باسی بھی مسکرانے لگا۔ وہاں ایک طوطا، اپنی طوطی سے چہلیں کر رہا تھا۔

دور مور اور مورنیاں ایک دوسرے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر یوں دھیرے دھیرے چل رہے تھے جیسے لڑکے لڑکیوں کی ٹولیاں کسی سہاونے موسم میں آپس میں باتیں کرتے ہوئے عشق و محبت کی نئی داستانوں کی داغ بیل ڈال رہے ہوں۔

تبھی آسمان میں ایک چیتکار سی اٹھی۔

پیڑوں کی اوپری شاخوں پر بیٹھی ہوئی ننھی ننھی چڑیوں پر چیلوں کا ایک گروہ جھپٹ پڑا تھا۔ اس حملے کے ساتھ ہی جنگل کا وہ حصہ چڑیوں کی چیخ و پکار سے گونج اٹھا تھا۔ کچھ پکشی ادھر ادھر چکر کاٹتے ہوئے اونچی آوازوں سے چیں چیں میں کر رہے تھے۔ دوسرے پکشی گھبرائے ہوئے کبھی اس ٹہنی پر بیٹھتے، کبھی پھر سے اڑ کر دوسری ٹہنی پر پہنچ جاتے۔ انہیں کہیں بھی چین نہیں پڑ رہا تھا۔ کچھ بندروں کی ٹولیاں پتہ نہیں اس وقت کہاں سے آ گئیں۔ وہ اپنے بچوں کو سینے سے چپکائے پیڑوں کی اونچی ٹہنیوں پر وہاں پہنچ کر غرانے لگے، جہاں چیلوں کا گروہ منڈلا رہا تھا۔

نیچے ٹہنی پر جھولتے ہوئے سانپ نے خطرے کو بھانپ کر زور زور سے پھنکارے مارنے شروع کر دئے تھے۔ زمین پر گلہریاں پھدکتی ہوئی کبھی ادھر کو بھاگتیں کبھی ادھر کو انہیں کسی طرح چین نہیں پڑ رہا تھا۔

کچھ ہرن سہم کر تھوتھنیاں اٹھائے کبھی اوپر کی طرف دیکھتے اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے دوڑتے اور پھر اسی پیڑ کے نیچے آ کر جمع ہو جاتے، جس کے اوپر چیلیں منڈلا رہی تھیں۔

ایک تتلی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور وہ گھبراہٹ میں پھول کے بجائے کانٹوں پر جا بیٹھی۔ اس کے پنکھ کانٹوں میں بری طرح الجھے ہوئے تھے اور وہ کانٹوں کی پکڑ سے آزاد ہونے کے لئے چھٹپٹا رہی تھی۔

آدی باسی بھی اپنے اپنے تیر کمان اٹھائے ایسی جگہوں کی تلاش کر رہے تھے، جہاں سے ان چیلوں کو نشانہ بنایا جاسکے۔

مور بھی کٹ کٹ کرتے ہوئے اپنے پنجے پٹخ رہے تھے اور گردن اٹھا اٹھا کر آسمان میں ادھر دیکھ رہے تھے جہاں زندگی، موت کے اس اچانک حملے سے بچنے کے لئے سرگرداں تھی۔

بھگوان شیو نے بھی جیسے ردر روپ دھارن کر لیا تھا۔ تبھی تو بادل بن کر بکھرے ہوئے ان کے بالوں میں بجلی کڑکنے لگی تھی۔

موت کا یہ کھیل چند پلوں کے لئے چلا تھا، جس میں چیلیں پانچ چڑیوں کو اپنے پنجوں میں دبا کر لے گئی تھیں اور ان کی چیخیں ادھر سے سنائی دے رہی تھیں، جدھر کو چیلوں کا گروہ اڑتا ہوا گیا تھا۔

ایک چڑیا زخمی ہو کر وہاں جا گری تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے مور ناچ رہے تھے۔
ایک آدی باسی بھاگ کر اس چڑیا کو زمین سے اٹھا کر لے آیا۔ لیکن اس کی ہتھیلی پر بیٹھے بیٹھے ہی چڑیا نے دم توڑ دیا۔

آدی باسی اپنی ہتھیلی پر کافی دیر تک چڑیا کے تڑپنے کے درد کو سمیٹے رہا۔
زندگی کے اس درد نے جنگل کی زندگی کو اس حد تک دردناک بنا دیا تھا کہ پھدکتی ہوئی گلہریاں سہم کر پیڑوں کی جڑوں میں چھپ گئی تھیں۔

یہاں تک کہ ٹہنی سے لٹکا ہوا سانپ بھی اپنے پھن کو ٹہنی پر ٹکائے بے دم سا ہو گیا تھا۔

ہرن گھاس چرنا بھول کر گردنیں لٹکائے سہم کر کھڑے تھے۔
کانٹوں میں الجھی ہوئی تتلی سٹپٹاتے ہوئے کانٹوں میں ہی الجھ کر رہ گئی تھی۔ اس نے بھی دم توڑ دیا تھا۔ باقی تتلیاں بھی اڑنا بھول کر جہاں تھیں وہیں چپک گئی تھیں۔
اتنے میں سہمی ہوئی قدرت نے جیسے پھر سانس لی۔

ہوا پھر چلنے لگی۔

ہوا کے چلتے ہی جنگل کی ٹہنیوں میں سرسراہٹ شروع ہو گئی۔

اس سرسراہٹ نے جنگل کی فضا میں پھر سنگیت چھیڑ دیا۔ دور افق پر بادلوں کے پرے کے پرے آئے اور گھنگھور گھٹا بن کر سارے آسمان پر پھیل گئے۔ یہ فضا پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت زیادہ لطیف زیادہ رنگین تھی۔

موروں نے افق تا افق پھیلی ہوئی گھنگھور گھٹاؤں کی طرف دیکھا اور پھر نظریں نیچی کر لیں۔

آدی باسیوں نے جھومتی ہوئی پیڑوں کی شاخوں کی طرف دیکھا اور پھر کانٹوں میں الجھی ہوئی تتلی کی طرف اور بجھے بجھے من سے انہوں نے اپنی ٹوکریاں اٹھا کر اپنی پیٹھ پر لاد لیں۔

وہی سرسراتی ہوا تھی۔

وہی گھنگھور گھٹائیں۔

پہلے سے بھی زیادہ میٹھی اور حسین۔

لیکن جنگل اداس تھا۔ اس کی ٹہنیوں سے میٹھے گیت نہیں بلکہ ماتم کی اداس دھنیں اٹھ رہی تھیں۔ آدی باسی سر جھکائے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

مور اور مورنیاں اپنے پنکھوں میں زندگی کے حسن کو سمیٹے دانہ دنکا چگنا بھول کر اداس کھڑے تھے اور تو اور جھیل میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں نے جنگل کو اداس دیکھ کر اپنی پتیاں سمیٹ لی تھیں اور اداس سے موت کی گھنگھور کالی گھٹاؤں کو دیکھ رہے تھے۔

✓

ایک مجذوب کی کہانی

کہتے ہیں کہ ایک مجذوب ننگ دھڑنگ اس راستے پر پڑا رہتا تھا، جدھر سے شاہی محل میں رہنے والوں اور بادشاہِ وقت کے وزیروں، امیروں کا گزر ہوتا تھا۔

اب اگر یہ مجذوب کسی عوامی راستے یا عام گزرگاہ پر پڑا رہتا تو ممکن ہے وقت کے حاکم اور امیروں وزیروں کو زندگی بھر یہ پتہ بھی نہ چل پاتا کہ اس طرح کا کوئی ننگ دھڑنگ آدمی ان کی حکومت میں ان کے ملک میں موجود ہے۔ لیکن چونکہ یہ مجذوب شاہی راستے پر پڑا رہتا تھا اس لئے اس کا ننگا پن ملک کی انتظامیہ کے سامنے بہت بڑا سوال بن کر کھڑا ہو گیا۔

اسے وہاں سے ہٹانے کے لئے انہوں نے کئی طریقے اپنائے۔

اسے وہاں سے زبردستی اٹھا کر کہیں بہت دور چھوڑ کر آئے تو انہیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ ان کے لوٹنے سے پہلے وہ مجذوب اپنی جگہ پر موجود تھا۔ ڈرانے دھمکانے اور مارنے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ لوگ اسے جتنے زور کا پتھر مارتے تھے، وہ اتنے ہی زور سے کھلکھلا کر ہنستا تھا۔ یوں کہہ لیجئے کہ اس کے درد کی ٹیس اس کے ہونٹوں پر مسکان بن کر کھل

اٹھتی تھی۔ ایک بار بھیڑ میں سے کسی نے اسے پتھر مارا۔ لہو کی دھار بہہ نکلنے پر مجذوب کھلکھلا کر ہنس پڑا تو پتھر مارنے والے سے نہ رہا گیا اور اس نے پوچھ ہی لیا ”میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ اتنی بڑی چوٹ کھا کر آپ بلبلانے کی بجائے ہنس کیسے رہے ہیں؟“

مجذوب نے ایک نظر سوال کرنے والے کی طرف دیکھ کر کہا تھا ”کبھی دوسرے کے حصے کا پتھر خود کھا کر دیکھو تو یہ بات خود سمجھ میں آجائے گی۔“

یہ بات تو کسی کو سمجھ میں نہ آئی البتہ مجذوب کو وہاں سے ہٹانے کا مسئلہ ویسے کا ویسا بنا رہا۔

آخر ایک چنگیز قسم کے افسر نے سوچا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ کیوں نہ اس مجذوب کا قتل کروا دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک بڑے جابر اور ماہر قسم کے قاتل کو بلوایا اور اپنے من کی بات کہی اور اس سے یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر وہ اس کام کو کردے گا تو اس کے باقی سارے خون معاف کردئے جائیں گے۔

وہ بولا۔ ”حضور قتل کرنا میرے لئے چٹکی بجانے کے برابر ہے۔ لیکن جہاں تک اس مجذوب کا سوال ہے اسے قتل کرنے کی بات میں دل میں نہیں لا سکتا۔ آپ سوچئے نا، آخر مجھے بھی خدا کو جان دینی ہے۔

اس کی بات سن کر حاکم اعلیٰ کو غصہ تو بہت آیا۔ لیکن کرے تو کیا کرے۔ اس قاتل کی مشکیں کسوا کر اس کو تو اس نے جیل کی کال کوٹھری میں ڈلوادیا اور آخر ایک کالی رات کے اندھیرے میں اس نے خود ہی مجذوب کا قتل کردیا۔

اگلی صبح وہ خوش خوش بادشاہ وقت کو یہ خوش خبری دینے کے لئے اس کے محل کی طرف جا رہا تھا تو اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ مجذوب پہلے کی طرح اپنی جگہ پر موجود تھا۔ وہ نہ صرف اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا بلکہ اسے آشیرواد دیتے ہوئے لمبی عمر تک سکھ چین سے جیتے رہنے کی دعائیں دیں۔

اب وہ حاکم اعلیٰ کرے تو کیا کرے۔ اس نے یہ تو نہ کیا کہ جا کر مجذوب کے

قدموں میں گر جائے۔ ہاں دل ہی دل میں شرم سار سا وہ اپنے گھر کو لوٹ گیا۔

اب ایک طرح سے صورت حال یہ ہو گئی کہ ایک طرف تو وہ کمزور نہتا بے سہارا ننگ دھڑنگ سا آدمی جو زمین میں پاؤں گاڑ کر اٹل کھڑا ہے۔ اور اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہو رہا اور دوسری طرف بادشاہ وقت اور سرکار کی ساری طاقت ہے جو اسے شاہی راستے سے ہٹا کر ایسی جگہ پھنکوا دینا چاہتی ہے جہاں سے ان کے وجود پر یہ بدنما داغ کہیں دکھائی نہ دے۔

جب ہر طرح کے حربے اس مجذوب کو ہٹانے میں ناکام ہو گئے تو ایک دفعہ یہ بات مجلس عاملہ میں زیر بحث آئی۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جو تجویزیں سامنے آئیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ اگر یہ مجذوب شاہی راستے سے نہیں ہٹتا تو شاہی محل کو ہی ہٹا کر کسی دوسری جگہ لے جایا جائے۔ قریب تھا کہ اس تجویز پر عمل کرنے کے احکامات جاری ہو جاتے کہ تبھی کسی نے کہا کہ اگر یہ مجذوب یہاں سے اٹھ کر نئے محل کی طرف جانے والے راستے پر آ کر بیٹھ گیا تو کروڑوں کے خرچ پر پانی پھر جائے گا اور پھر یہ کہ ابھی تو یہ محل کی چار دیواری سے دور بیٹھا ہے۔ اور پھر کون جانے۔ کب یہ محل کی دیواروں کے نیچے جا کر بیٹھ جائے اور ہر وقت کے لئے آنکھ کا ناسور بن جائے۔

بات معقول تھی۔ اس لئے دارالخلافہ بدلنے کی تجویز رد کر دی گئی۔

آخر ایک وزیر جو سننے میں آیا ہے کہ بادشاہ کے وزیروں میں سب سے عقلمند سمجھا جاتا تھا اس نے تجویز رکھی کہ ہم نے اس مجذوب کے جھمیلے کو خواہ مخواہ طول دے رکھا ہے۔ اس سے نجات پانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جب بھی شاہی سواری ادھر سے گزرے اس وقت مجذوب کو ایک قیمتی دوشالہ اوڑھا دیا جائے۔ اس طرح اس کا ننگا پن کسی کو دکھائی نہیں دے گا۔

یہ بات سب کو پسند آ گئی اور اسے فوری طور پر عمل میں لے آیا گیا۔

لیکن اس سے ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی۔ وہ یہ کہ جب ننگ دھڑنگ مجذوب پر

قیمتی دوشالہ اوڑھایا تو وہ جو ہر وقت مسکراتا اور ہنستا رہتا تھا اس نے اس طرح زار، زار رونا شروع کیا اور آنسوؤں کی ایسی دھار بہہ نکلی کہ لگتا تھا جیسے ساری دھرتی سیراب ہو جائے گی۔

ظاہر ہے کہ ہنستے اور مسکراتے ہوئے مجذوب سے حکومت وقت کو اتنا خطرہ نہیں تھا جتنا زار، زار روتے اور بلکتے اور تڑپتے ہوئے ننگ دھڑنگ آدمی سے۔

پھر یہ ہوا کہ بھیڑ میں سے وہی لوگ جن کو مجذوب کو پتھر مار کر خوشی حاصل ہوتی تھی ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پتھر ہاتھوں میں ہی پکڑے رہ گئے اور کسی نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھ ہی لیا کہ وہ جو پتھر کھا کر مسکراتا اور ہنستا تھا وہ قیمتی دوشالہ اوڑھا دینے سے روتا کیوں ہے ؟"

مجذوب نے کہا۔ پہلے اس ناپاک دوشالے کا بوجھ میرے اوپر سے اٹھاؤ تو میں کچھ کہوں۔

لوگوں نے دوشالہ ہٹایا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مجذوب کا سارا جسم یوں لہولہان ہو رہا تھا جیسے ہزاروں لاکھوں کانٹے اس کے جسم میں ایک ساتھ چبھ گئے ہوں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہمالیہ کی ڈھلانوں سے ایک ساتھ سینکڑوں ہزراروں ندیاں نالے اور دریا پھوٹ نکلے ہوں۔ وہ حیران تھے کہ پتھر مارنے پر بھی اس کے جسم سے اتنا لہو کبھی نہیں بہا تھا، جتنا قیمتی دوشالہ پہنا دینے سے بہا ہے، آخر ایسا کیوں ہوا؟

دوشالہ ہٹا دینے کے کافی دیر بعد جب مجذوب کا زخم خوردہ وجود اپنے معمول پر آیا اور اس کے چہرے پر پھر وہی مسکراہٹ بکھر گئی تو بھیڑ میں سے پھر کسی نے اپنا سوال دہرا دیا کہ قیمتی دوشالہ اوڑھائے جانے پر اس کا وجود لہولہان کیوں ہو گیا۔ ؟

"جب میرے گرد تمہارے جیسے لاکھوں کروڑوں ننگے بھوکے ننگے لوگ کھڑے ہوں تو تم خود ہی کہو کہ مجھے دوشالہ اوڑھنا کیسے اچھا لگ سکتا ہے ؟ یہ دوشالہ تو کانٹے بن کر میرے جسم میں چبھ رہا تھا اور میرے جسم کو لہولہان کر رہا تھا" مجذوب نے انگلی اٹھا اٹھا کر ایک ایک شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اے لوگو، اپنے آپ کو اپنی حقیقت کو پہچاننا چاہتے

ہو تو ذرا میرے ننگے جسم کے آئینے میں جھانک کر دیکھو۔"

اور لوگوں نے جب ایسا کیا تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ سب کے سب مجذوب تھے۔ سب کے سب ننگے تھے۔ اور پھر انہوں نے ایک نظر اٹھا کر قیمتی ددشالے کی طرف دیکھا تو انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس دوشالے کی لالی میں ان کے اپنے خون کی لالی چمک رہی تھی۔

بس اس کے بعد کی کہانی مجھے نہیں لکھنی۔ کیوں کہ ایک قطرے پر جب اس کی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے تو وہ سمندر بن جاتا ہے اور اس مجذوب کے گرد تو ایک انسان نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہجوم ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

✓

تلاش ایک بالی کی

ہڑبڑا کر جب گڈریا جاگا تو گھبراہٹ میں بانسری اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ پورے کا پورا ریوڑ غائب تھا۔

اس نے آنکھیں ملیں۔ بازو پر زور کی چٹکی کاٹی۔ "سسر ہم جاگت ہیں یا ابھوں سوئے رہین" وہ بڑبڑایا اور جب چٹکی کاٹنے کا درد دل و دماغ سے ہوتا ہوا واپس بازو پر آیا تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جلدی سے انگوچھا جھاڑ کر کندھے پر ڈالا اور چاروں طرف پھر کی کی طرح گھوم گیا۔ ریوڑ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

بکری کی مونچھ، بھیڑ کی دم۔

ارے بوڑم سارا ریوڑ گم۔

اس نے اپنے آپ کو گالی دی۔

ریوڑ اسے پھر بھی کہیں دکھائی نہ دیا۔ لمبی چوڑی چراگاہ غریب کے دامن کی طرح خالی تھی۔

صبح شگن ہی اچھا نہیں ہوا تھا۔ ریوڑ لے کر نکلا تو گلی کی دو عورتیں اپنے اپنے گھر کے آنگن میں کھڑی ایک دوسری کی پشتوں کی ایسی کی تیسی کر رہی تھیں اور ان کی اس لڑائی میں دونوں گھروں کے بیچ کی کچی دیوار فالج شدہ بوڑھے کے ہاتھوں میں پکڑی ڈنگوری کی طرح کانپے جا رہی تھی۔ یہ لڑائی بھڑائی گڈریے کو اچھی نہیں لگتی۔

اسے تو اپنی بھیڑوں کا جینے کا ڈھنگ پسند ہے۔ ایک کا سر دوسری کی ٹانگوں یا پیٹ سے چپکا رہتا ہے، پھر بھی کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔

ان دونوں عورتوں کی لڑائی سے تو اس کا دماغ خراب ہوا ہی تھا اوپر سے دھوپ اس کے انگوچھے کی پرتوں کو چیر کر اس کی کھوپڑی میں گھسی جا رہی تھی ایسے میں اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور اب پورے کا پورا ریوڑ ہی غائب تھا۔

بکریوں کی تلاش میں اس نے بکریوں کے سموں کی چھاپ دیکھی اور پھر اس کی نظر چراگاہ کے آخری سرے پر اجڑے ہوئے ٹیلے کی چوٹی کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں کالے بھورے ہلتے ہوئے نقطے سے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی مگر ساتھ ہی اس کے منہ میں کڑواہٹ بھر گئی۔

تو آج سارے کا سارا کواہی ادت گیا۔

ایسا اکثر ہوتا تھا کہ دو چار بھیڑیں یا بکریاں کبھی کبھی ہری پتیوں کے لالچ میں اس ٹیلے کی چوٹی تک پہنچ جایا کرتی تھیں۔ مگر وہاں کی کانٹے دار جھاڑیوں میں کبھی کبھی ایسی الجھ جاتی تھیں کہ ان کا وجود لہو لہان ہو جاتا تھا۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوا تھا کہ وہ جھاڑیوں میں ایسی پھنس گئی تھیں کہ انہیں چھڑانے کے لئے اسے وہاں جانا پڑا تھا۔ چند ایک تو زخموں کی تاب نہ لا کر مر بھی گئی تھیں۔ مگر آج......

آج تو سارا ریوڑ وہاں پہنچ گیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ کھاؤ ہری پتیاں اور سہو کانٹوں کی چبھن، دو ایک مریں گی تو ہوش آ جائے گی خود ہی۔ گڈریے نے غصے میں آ کر زمین پر تھوک دیا اور بانسری منہ کو لگالی۔

پورے کا پورا ریوڑ کانٹے دار جھاڑیوں میں پھنسا ہو تو پھر کوئی گڈریا بانسری نہیں بجاتا۔

اس نے بھی بانسری ہونٹوں سے ہٹا کر پاجامے کے نیفے میں ٹھونس لی، اور تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا ٹیلے کی طرف دوڑ پڑا۔

''میں میں''۔ بھیڑ بکریوں کی نحیف سی آوازوں سے ان کے کانٹوں کی چبھن سے پیدا ہونے والے درد کا احساس ہوا تو اس کا دل تڑپ اٹھا۔ تبھی اس کے کانوں میں اپنے کتوں کے بھونکنے کی بھی آوازیں آئیں۔

''جو بھیڑوں کے رکھوالے تھے وہ بھی سسر وہاں جا کر پھنس گئے ہیں۔ ٹھیک ہے بھونکے جاؤ۔ بھونکے جاؤ''۔ گڈریے نے کہا۔

لیکن جب میں ہی سو گیا تھا تو کتے پھر کتے ہیں۔ یہی کیا کم وفاداری ہے کہ بھیڑوں کو کانٹوں سے بچانے کی کوشش میں وہ خود بھی کانٹوں میں الجھے پڑے ہیں۔

ٹیلے کی طرف جاتے ہوئے وہ من ہی من میں سوچ رہا تھا کہ ٹیلے کے اوپر کدھر سے چڑھا جائے۔ عام طور پر وہ اس پر سامنے کی طرف سے نہیں بلکہ بائیں طرف سے چڑھنا پسند کرتا ہے۔ سامنے کا راستہ چھوٹا تو ہے مگر پرانے وقتوں میں شاید اس طرف پانی کا جھرنا گرتا تھا۔ اس لئے مٹی کٹ کٹ کر وہاں سیدھی دیوار سی بن گئی ہے۔ اسی لئے ادھر سے جانا ممکن تو ہے۔ مگر مشکل ہے۔ دائیں طرف ٹیلے کے نیچے ندی بہتی ہے اور وہاں پانی کافی گہرا رہتا ہے۔ ویسے بائیں طرف سے ٹیلے پر چڑھنے کی ایک خاص وجہ بھی ہے۔ یہ ٹیلہ شاید کسی انسانی بستی کے اجڑ جانے کی وجہ سے بنا ہے۔ اسلئے اس کی ڈھلانوں سے جب بھی مٹی کٹتی ہے تو لوگوں کو پرانے سکے ٹوٹے ہوئے برتن، کھلونے اور کبھی کبھی تو چھوٹے موٹے زیور بھی مل جاتے ہیں۔ اس گڈریے کو ایک مرتبہ ایک پرانا کلپ مل گیا تھا۔ اسے بالوں میں لگا کر اس کی محبوبہ بڑی خوش ہوئی تھی۔ اور اسے اپنے بالوں کو چھونے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ گڈریا آج بھی اپنی انگلیاں سونگھتا ہے تو محبوبہ کے بالوں کی خوشبو کے تصور سے ہی اس کا

وجود معطر ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ گڈریئے کو ایک بالی بھی مل گئی تھی جو اس نے بڑی سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ اس نے بہت چاہا ہے کہ دوسری بالی بھی مل جائے تو پھر دونوں بالیاں اپنی محبوبہ کے کانوں میں پہنادے۔ اسے اس بات کا پورا یقین ہے کہ جس دن دوسری بالی مل جائیگی اس دن اسے اس کی محبوبہ مل جائیگی۔

یہی بات اپنے شعور میں بسائے اپنی عادت کے مطابق وہ ٹیلے کی بائیں طرف تیزی سے بھاگتا جارہا تھا۔

''میں میں'' ایک ساتھ کتنی ہی بھیڑ بکریوں کی درد بھری آوازیں اس کے کانوں میں پڑیں۔

بھیڑ کے سر اور بکری کے سم
ہوش کرے گڈریے کی دُم۔

تیرا سارا ریوڑ کانٹوں میں الجھا درد سے بلک رہا ہے اور تجھے محبوبہ کی بالی ڈھونڈنے کی فکر ستارہی ہے۔

یہ سوچ کر اس نے سامنے کی طرف سے ہی ٹیلے پر چڑھنے کا فیصلہ کیا اور دوسرے ہی لمحے وہ اپنی لاٹھی کے آگے جڑے ہوئے ہنسئے سے کانٹے دار جھاڑیاں کاٹ رہا تھا۔

گڈریے کو نجات دہندہ کی شکل میں آیا دیکھ کر ریوڑ کی سبھی بکریوں اور بھیڑوں نے ''میں میں'' کر کے سارا ٹیلہ آسمان پر اٹھالیا اور اس گڈریے کو لگا......

ہاں گڈریے کو لگا کہ صدیوں سے اس ٹیلے کے نیچے دبی ہوئی پوری بستی زندہ ہو اٹھی ہے اور وہاں کا ہر نفس، ہر جاندار، میں میں کرتا ہوا اسے اپنی مدد کے لئے پکار رہا ہے۔

اس نے اور زور زور سے ہنسیا چلانا شروع کر دیا۔ جھاڑیاں کٹ کٹ کر زمین پر گرنے لگیں تو اسکا دماغ اس بات کی طرف چلا گیا کہ یہ بسی بسائی بستی کیسے اس ٹیلے میں تبدیل ہوگئی ہوگی۔

اس بارے میں پورے وثوق سے تو اس کے پرکھے بھی نہیں بتا سکتے کہ صدیوں

پہلے کیا ہوا تھا۔ پھر بھی ایک سنی سنائی کہانی اس کے ذہن میں کوند آئی۔

ایک مرتبہ یہ ہوا کہ بھوک سے مرتے ایک آدمی نے اپنے من کی تسکین کے لئے زمین پر ایک گول دائرہ کھینچ کر تھالی بنائی۔ پھر اس تھالی میں چار دایرے کھینچ کر چار روٹیاں رکھیں۔ تھالی کے ایک کونے میں اس نے دال اور سبزی کی کٹوریاں بھی رکھیں۔ اور پھر منہ میٹھا کرنے کے لئے ایک کونے میں حلوہ بھی رکھ دیا۔ ابھی وہ زمین پر اتنا ہی نقشہ بنا پایا تھا کہ اس سے بھی زیادہ بھوکا آدمی وہاں پہنچ گیا۔

"یہ تم کیا بنا رہے تھے؟" آنے والے بھوکے آدمی نے پوچھا۔

'رہنے کے لئے مکان بنا رہا ہوں۔' وہ نہیں چاہتا تھا کہ اتنے اچھے کھانے میں کوئی دوسرا شریک ہو۔ اس لئے اس نے صاف جھوٹ بول دیا۔

آنے والا آدمی پہلے کا بھی گرو تھا۔ اس نے اس کی تھالی کے گرد اور بڑا گول دائرہ بناتے ہوئے کہا۔ "یہ ساری زمین تو میری ہے۔ تم اس میں اپنا مکان کیسے بنا سکتے ہو؟"

اسی بات پر جب وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے تو اس زمین کا اصلی مالک آگیا۔ اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ دونوں کے سروں پر دس دس جوتے مارے جائیں۔ اب وہ بھوکے تو تھے ہی، مار کھا کر بے ہوش ہونے لگے تو مالک نے سوچا کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ اس نے ان کو کھانا کھلوایا اور حکم دیا کہ بھاگ جاؤ اور دوبارہ صورت نہ دکھانا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں اسے پھر اپنے گھر کے پاس ٹہلتے دکھائی دئے تو اس نے پوچھا "تم لوگ گئے نہیں؟"

"حضور ہم یہ پوچھنے کے لئے رک گئے تھے کہ جوتے کی مار کے بعد اگر پیٹ بھر کھانا مل سکتا ہے تو ہم کل بھی آجائیں۔

اس کہانی کو سوچ کر گڈریا پہلے تو مسکرایا لیکن ساتھ ہی اس کا دل درد سے بھر آیا۔ "کون جانے 'ایسے موروکھوں اور بے حیاؤں کی لڑائی کی وجہ سے ہی یہ بسی بسائی بستی اجڑا ہوا ٹیلہ بن گئی ہو۔

جب بھیڑ بکریاں کانٹے دار جھاڑیوں سے باہر نکل آئیں تو گڈریے نے خوشی کا نعرہ مارا۔

اینگن پینگن تلی تلینگن

لے گڈریے ریوڑ گن

ساری بھیڑ بکریاں پوری نکلیں تو اس کا دھیان پھر ان دونوں بھوکوں کی لڑائی کی طرف چلا گیا۔

"ارے مورکھو پیٹ کی بھوک مٹانے کے بجائے تم تو بے کار کی بات کے لئے آپس میں لڑ پڑے اور اسی لیے یہ بسی بسائی بستی اجڑا ہوا ٹیلہ بن گئی۔ گڈریے نے ایک بھیڑ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بڑبڑایا "غلطی تم نے کی اور سزا میں بھگت رہا ہوں۔ اب دیکھو نا میرا سارا ریوڑ تمہاری پیدا کی ہوئی کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

یہی سب سوچتے سوچتے گڈریے کا دھیان ایک بھیڑ کی پیٹھ پر گیا جس پر اب بھی کانٹوں بھری ٹہنی کا ایک ٹکڑا پھنسا ہوا تھا۔

اس ٹہنی کو بھیڑ کی پیٹھ سے چھڑاتے ہوئے اس کی نظر اچانک اپنے گاؤں کی طرف اٹھ گئی اور اسے یہ دیکھ کر بڑی تسکین ہوئی کہ اس کا گاؤں اسی طرح بسا بسایا ہے اور صبح جو لڑائی ہو رہی تھی اس کی وجہ سے وہ اجڑا ہوا ٹیلہ نہیں بنا۔

اس خوشی کے احساس کے ساتھ ہی اس نے پاجامے کے نیفے میں ٹھونسی ہوئی اپنی بانسری کو نکالا اور ہونٹوں سے لگا کر میٹھی تان چھیڑ دی۔

اپنے ریوڑ کے ساتھ ٹیلے سے اترتے ہوئے اس کی نظریں ادھر ادھر بھٹکتی دوسری بالی تلاش کر رہی تھیں اور بانسری کی میٹھی لے کو تیز سے تیز تر کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ وہ بالی مل جائے تو میری زندگی میں پیار کا رس گھل جائے۔ وہ بالی مل جائے تو اجڑے ہوئے ٹیلے سے زندگی کا جھرنا پھوٹ پڑے۔

✓

سیال کوٹ کا لاڑا

میں نے اپنی لاڑی کو بچپن میں اس وقت چن لیا تھا جب میں ماں کا دودھ پیتا بچہ تھا اور وہ لاڑی تھی ایک گوگلیانی۔

پنجاب میں گوگلیانی، راجستھان کی ان عورتوں کو کہتے ہیں جو گلی گلی، گھر گھر، سوئیاں اور کندھوئیاں بیچتی ہیں۔ یہ سوئیاں، کندھوئیاں بیچتے ہوئے انہوں نے اپنے پکے ججمان بھی بنا رکھے ہیں۔ اپنے ججمانوں کے گھروں میں نئے بچے کی پیدائش پر لوریاں، شادی ہونے پر گھوڑیاں اور دوسرے خوشی کے گیت گایا کرتی ہیں، کوئی افسوس کا موقعہ ہو وہ بین کے دردناک گیت گا کر اپنے ججمانوں کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتی ہیں۔

میری پیدائش کے موقع پر بڑی گوگلیانی چونکہ مر گئی تھی، اس لئے اس کی چودہ پندرہ سال کی بیٹی میری لوری کے گیت گانے آئی۔

گوگلیانی گاوے لوری

کاکا لمبڑی عمریا توری

اونچ اٹریا جو تو جائے

تجھ کو دنیا سیس نوائے

تیرا اونچا ہو اقبال

امبڑی لا مصری کا تھال

گوگلیانی گاوے گھوڑی

لاڑا لاڑی بڑھیا جوڑی

جو تو بیاہ کرنے کو جائے

کوئی اپسرا بیاہ کر لائے

تیری چاچی ہوئے نہال

چاچی لا مصری کا تھال

کاکا بلاں وچ مسکائے

دادی پیلاں پاندی آئے

متھا چمے مرچاں وارے

دادی پوتے توں بلہارے

اسکا مکھڑا سوہا لال

دادی لا مصری کا تھال

میری ماں بتایا کرتی تھی کہ مجھے گود میں لے کر، گوگلیانی اپنی باریک لمبی آواز میں جب یہ لوری گا رہی تھی تو پتہ نہیں کب میں اس کے دودھ کو منہ میں ڈال کر چپل چپل پینے لگا۔ میں دودھ پی رہا تھا اور شرم کے مارے گوگلیانی کا چہرہ لال انار ہوتا جا رہا تھا۔

دادی نے جب مصری کے بھرے ہوئے تھال کے اوپر پانچ روپے رکھ کر گوگلیانی کی جھولی میں ڈالے تو بولی "لے میں نے تجھے مصری کھلا دی تو بھی ماں بننے والی ہے، تو بھی مجھے مصری کھلانا۔ گوگلیانی نے شرم کے مارے مجھے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا اور جب وہ مجھے

ماں کی گود میں ڈالنے لگی میں واپس جا ہی نہ رہا تھا۔ اتنی اچھی لگی تھی مجھے گوگلیانی۔

جب میں کچھ بڑا ہوا تو گوگلیانی کی انگلی تھامے میں گلی گلی گھوما کرتا تھا۔ وہ سوئیاں اور کندھوئیاں بیچتی رہتی اور میں اس کے غرارے یا رنگ دار چنری کو تھامے اس کی طرف دیکھتا رہتا۔ جب وہ کسی کی لوری گاتی تو مجھ پر وجد کا سا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ میں آنکھیں بند کئے اپنے کانوں میں اس کی میٹھی آواز کا رس گھولتا رہتا۔

لوگ مذاق میں اس سے پوچھتے کہ یہ تیرا کون لگتا ہے تو وہ ہنس کر کہتی "یہ میرا لاڑا ہے۔"

رہی میری بات تو میں تو کہتا ہی تھا کہ یہ میری لاڑی ہے

میرا جواب سن کر لوگ ہنستے اور میری لاڑی کا رنگ چنبے کی طرح کھل اٹھتا۔

میرے ذہن میں اپنی اس لاڑی کی جو تصویر محفوظ ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔ کنوئیں کی طرح گہری تھوڑی کے اوپر شعلوں کی طرح دہکتے دو تراشے ہوئے ہونٹ ان کے اوپر لشکتی تیکھی پتلی تلوار سی ناک، اس ناک پر رکھی ہوئیں کٹار سی بڑی بڑی آنکھیں جن کے اوپر کالی بھنوئیں اس طرح جھکی رہتیں جیسے آنکھوں کی خوب صورتی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی ہوں۔ اس کے ماتھے کے عین بیچ و بیچ بالوں کے چیر سے لٹکتی ہوئی چاندی کی زنجیر کے سہارے ایک ٹیکا جھولتا رہتا تھا۔ سر کے بیچ و بیچ چوک پھول اور اس چوک پھول کی اونچی ٹیسی پر اٹکا ہوا اس کی گہرے رنگ کی ساڑھی یا دوپٹے کا پلو، جو اس کے لمبے چہرے کو اپنے ہالے میں لئے رہتا تھا اور اس کی چنری کے رنگ کی دمک اس کے گورے رنگ پر پڑتی ہوئی کوئی ایسا جادو جگاتی جیسے قوس قزح کے ساتوں رنگ اس کے چہرے پر نکھر آئے ہوں۔ پھر اس کے ہاتھوں سے لے کر کہنیوں تک اور کہنیوں سے لے کر کندھوں تک سفید، لال اور ہرے رنگ کا چوڑا بازوؤں کی ذرا سی حرکت سے جھنجھنا اٹھتا تو مجھے ایسا لگتا جیسے چھاکے والے کنوئیں کی اونچی نشار کا پانی "اولو" میں گرتا ہوا میٹھا گیت گا رہا ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے بچپن میں، میں اس کی گود میں بیٹھ کر اس کی چپکی ہوئی چولی میں ٹنکے چھوٹے چھوٹے شیشوں میں اپنا چہرہ دیکھا کرتا

تھا۔ چہرہ دیکھتا اور اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیاں ان شیشوں پر مار مار کر کہا کرتا تھا۔ ''میں یہاں بھی ہوں، میں یہاں بھی ہوں۔''

''میرا لاڑا تو میرے دل میں رہتا ہے، وہ مجھے اپنے سینے سے بھینچ کر کہتی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ بچپن کے دن بہت پیچھے رہ گئے۔

آخری مرتبہ جب میں نے اپنی لاڑی کو دیکھا تب میں چودہ پندرہ سال کا بھرپور جوان ہو گیا تھا۔ جوان، لمبا چوڑا، چھ فٹ سے نکلتا قد، سر پر کلف لگی پگڑی باندھ کر میں پورا مرد لگتا تھا۔ اس بار جب وہ آئی تو میرے بڑے بھائی کی منگنی ہوئی تھی اور اس کی سسرال سے بڑے بڑے موتی چور کے لڈو آئے تھے۔ ایک ایک لڈو پاؤ پاؤ بھر کا تھا۔ اتنا موٹا کہ میرے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں نہ سماتا تھا۔

ہمارے گھر کے کھلے چوڑے آنگن میں گوگلیانی بدھائی کا گیت گا رہی تھی۔

ہوئی منڈے دی کڑمائی
گوگلیانی دے بدھائی
دوہٹی بیٹھی پیڑا ڈاہ کے
گل وچ ہار ہمیلاں پا کے
اس کی گود میں کھیلے بال
امبڑی لا مصری کا تھال

گوگلیانی گا رہی تھی، ناچ رہی تھی۔ ناچتی ہوئی جب وہ تیزی سے چکر پر چکر کاٹتی تو اس کا کھلا گھگرا، چھتری کی طرح پھیل جاتا اور اس کے دوپٹے، اس کی چولی میں ٹنگے رنگ برنگے شیشوں سے رنگ برنگی کرنیں پھوٹتی رہتیں۔

اس موقعہ پر سب خوش تھے۔

سب اس کے تال میں تال ملا کر تالی بجا رہے تھے۔

اس تالی میں اگر کسی کے ہاتھ نہیں اٹھ رہے تھے تو میرے۔ میں اداس تھا۔ میرا

بچپن بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اس لئے گوگلیانی کی انگلی تھامے اس کے ساتھ نہیں گھوم سکتا تھا۔ اب میں اس کے ڈیرے میں جاکر اس کی گدڑی کے نرم اور گرم بستر میں اپنی لاڑی کے سینے سے لگ کر نہیں سو سکتا تھا اور ابھی میں پورا مرد بھی نہیں بنا تھا کہ کھل کر اس سے اپنے عشق کا اظہار کر دوں۔ میں تو اب بھی سوچ رہا تھا کہ وہ میری لاڑی ہے اور اب سر پر کلف دار پگڑی باندھے، پورا مرد بننے کی کوشش کے باوجود مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے لاڑی کے سینے سے لگ کر جو سکھ مل سکتا ہے، اسے کیسے حاصل کروں۔ اس کا ناچ جاری تھا اس کے گیت کی باریک دھن اب بھی میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی اور اس رس کا نشہ دھیرے دھیرے میرے وجود پر چھا رہا تھا لیکن مجھے مکمل سرشاری نہیں مل رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے بڑے ہونے کے ساتھ ہی میری لاڑی مجھ سے دور ہو گئی ہے۔ شاید اسی لئے اس نے ابھی تک میری آنکھوں میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔ پہلے کی طرح اپنے سینے سے لگا کر مجھ سے پیار نہیں کیا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے میں بار بار اپنے بچپن میں لوٹ جاتا لیکن لاڑی کے جسم سے نکلتی کرنوں کی رنگینی مجھے واپس آنگن میں لے آئی۔

میری اداسی کو شاید گوگلیانی نے بھی بھانپ لیا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ ناچتے ناچتے کب اس کا بازو کوندر کر لپکا۔ مجھے تو تبھی پتہ چلا جب اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے آنگن کے بیچ و بیچ کھینچ لیا اور میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، میرے جوان چہرے کے دونوں طرف ناگن کی طرح سر گھماتے، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال اس نے گیت کا مکھڑا اٹھایا۔

میرا لاڑا کھڑا اداس
میں تو جاتی اس کے پاس
میری دولت اس کا پیار
اپنی جان میں کروں نثار
یہ تو میرا قیمتی لعل
امبڑی لا مصری کا تھال

گیت جاری تھا۔ لاڑی میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گدے کی تال میں ناچ رہی تھی۔ چاروں طرف کھڑے میرے گھر والے اور محلے بھر کی عورتیں مرد اکٹھے ہو کر اپنی تالی سے تال دے رہے تھے، ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے اور میرے لئے تو جیسے وقت کا چلتا ہوا چکر رک گیا تھا۔ آسمان سے امرت کی گنگا اتر رہی تھی اور دھرتی اس امرت کو گرہن کر کے سچے سکھ کا آنند لے رہی تھی۔ اس سرشاری میں میری آنکھیں مندی جا رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں اتنی تاب ہی نہیں تھی کہ میں اپنی لاڑی کے سورج کی طرح چمکتے چہرے کی طرف دیکھ سکوں۔

مجھے ہوش اس وقت آیا جب میں نے دیکھا کہ لاڑی میری دادی کے لائے ہوئے لڈوؤں سے بھرے تھال کو اپنے جھولے میں ڈال رہی تھی۔ لڈو جھولے میں رکھ کر اس نے تھال میں رکھے چاندی کے دس سکے بھی اٹھائے اور انہیں بھی اپنے جھولے کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

گوگلیانی میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ اب لاڑی کے لئے وہاں سب کے موجود ہونے کے باوجود اور کوئی موجود نہیں تھا اگر کوئی تھا تو صرف میں، جس کی طرف دیکھ کر وہ بار بار مسکرا رہی تھی۔

اس نے ذرا سا دم لے لیا تو وہ خود ہی بولی۔ اب تک تو میں بڑے بیٹے کی کڑمائی کی بدھائی دینے کے لئے گا رہی تھی۔ اب میں صرف اپنے لاڑے کے لئے گاؤں گی۔ یہ کہہ کر اس نے ایک ادا سے شرارت بھری نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں تو پہلے ہی اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جو ناچتے ناچتے سرخ انار ہو رہا تھا۔۔ میرے اندر کا جوان مرد یہ سوچ رہا تھا کہ یہ عورت کسی طرح بھی چونتیس پینتیس کی نہیں لگتی۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے وقت اس کے لئے ٹھہر گیا ہو۔ گزرتے ہوئے وقت کا اس پر کچھ بھی اثر نہ پڑ رہا ہو اور جیسے وہ میری ہم عمر ہی ہو۔

اتنے میں اپنے جھولے کو سمیٹتی ہوئی وہ اٹھی اور پھر کھڑے ہو کر بازو لہرا کر اس

نے ایک ہاتھ کان پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے مجھے اپنی طرف کھینچ کر اس نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا، میرے ماتھے اور گال کو چوم کر گیت کی تان اٹھائی۔

مجھ کو مل گیا میرا لاڑا
جیون بھر کا ساتھ ہمارا
ہم نے چن لی اپنی راہ
ٹنڈے لاٹ کی نہیں پرواہ
منڈیا میں مچھلی تو جال
دادی لا مصری کا تھال

گوگلیانی مجھے اپنے ساتھ لے کر گا رہی تھی، ناچ رہی تھی، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے اپنے حسن کے جادو سے مسحور کر رہی تھی۔ سب ہنس رہے تھے، خوش ہو رہے تھے۔ لیکن میری خوشی کی کوئی تھاہ نہیں تھی۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ جس مقام پر خوشی کی انتہا ہوتی ہے وہ مقام سوئی کی نوک کے ہزارویں حصے سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ انسان کا وجود تو دور رہا۔ وہ اپنے تصور میں بھی اس مقام پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اس اونچائی سے اس کے قدم جب پھسلتے ہیں تو وہ رنج کی گہری کھائی میں جا گرتا ہے اور وہ خوشی جسے پانے کے لئے اس کا من مچلتا رہتا ہے، وہی سوئی کی نوک کی طرح اس کے وجود کے روئیں روئیں میں چبھ کر اسے چھلنی کرتی رہتی ہے، لہولہان کرتی رہتی ہے۔

یہی میرے ساتھ ہوا۔

زندگی کے اس موڑ پر جہاں گوگلیانی نے میرے گھر والوں کے سامنے مجھے اپنا لاڑا مان کر زندگی بھر ساتھ رہنے کا گیت گاتے ہوئے کہا تھا کہ اے لڑکے میں وہ مچھلی ہوں جو تمہارے جال میں پھنس چکی ہے۔

ہاں زندگی کے اسی موڑ پر میرا دل غم سے روشناس ہوا۔

ہوا یہ کہ میری لاڑی نے جب سے میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر یہ گیت گایا تھا کہ :

مجھ کو مل گیا میرا لاڑا
جیون بھر کا ساتھ ہمارا
ہم نے چن لی اپنی راہ
ٹنڈے لاٹ کی نہیں پرواہ
منڈیا میں مچھلی توں جال
دادی لا مصری کا تھال

بس اسی وقت سے مجھ پر نشہ سا طاری تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن جب لاڑی اپنا سوئیوں کندھوئیوں والا تھیلا کندھے سے لٹکائے ہمارے گھر سے اپنے ڈیرے کی طرف گئی تو میں ہانپتا ہانپتا گھر کی چھت پر چڑھ کر کھیتوں کی پگڈنڈیوں میں اٹھلا اٹھلا کر چلتی اپنی لاڑی کو اس وقت تک دیکھتا رہا تھا جب تک وہ مجھے دکھائی دیتی رہی تھی۔

اور جب وہ آموں کے جھنڈ کے پاس جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی، تب بھی میرے تصور نے اسے اس پگڈنڈی کے ہر موڑ پر کھڑا کر کے دیکھا کہ وہ وہاں کتنی خوب صورت لگتی ہے۔

میرے ہونٹ انہی بولوں کو گنگناتے رہے
منڈیا میں مچھلی تو جال
منڈیا میں مچھلی تو جال
لیکن میرا یہ سپنا جاگتے میں دیکھا ہوا سپنا تھا۔

اس مقام پر جب میرے دل کو کسی طرح قرار نہیں آیا تو میں نے ماں سے سفید شلوار مانگی۔ اپنے بڑے بھائی کی شہر سے دھل کر آئی استری کی ہوئی قمیص پہنی۔ سر پر کلف لگی پگڑی باندھی اور اس طرح اپنی طرف سے پورا چھیلا بن کر میں گوگلیانی کے ڈیرے کی طرف چل دیا۔

شام کے وقت وہاں اچھا خاصا جمگھٹ لگتا تھا۔

گوگلیانیوں کے مردوں کی بھٹیاں جن میں دن کے وقت وہ کسانوں کے لئے درانتیاں وکھرپیاں بنایا کرتے تھے، شام کے وقت وہ الاؤ میں تبدیل ہو جاتیں، ان میں ایک طرف گوگلیانیاں کھانا بناتیں اور دوسری طرف مرد آگ سینکتے رہتے، گودھول کے وقت جب کسان اور چرواہے لوٹتے تو ان کے جلتے ہوئے الاؤ کے گرد کبھی کبھی گانے بجانے کے پروگرام بھی ہو جاتے۔ اس دن شام کے دھند لکے میں جب میں وہاں پہنچا تو ویسا ہی جمگھٹ لگا ہوا تھا۔ سب لوگ اردگرد کھڑے تھے اور میری لاڑی بیچ میدان میں بوڑھے نمبر دار کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ناچ رہی تھی گا رہی تھی۔

آیلیا لکوٹ کالاڑا
یہ تو من کا میت ہمارا
میں نے ایسی جوت جلائی
اس کی لوٹ جوانی آئی
اس کو مل گئے بیتے سال
بوڑھے لامصری کا تھال

لاڑی بے سدھ ہو کر گا رہی تھی۔ وہی شمع کی طرح دہکتا چہرہ، وہی ناگن سی لہراتی اس کی چوٹی اور......

میرے دل پر چوٹ لگی۔ یہ تو میری لاڑی ہے صرف میری اور یہ کسی دوسرے کے ساتھ ناچ رہی ہے۔

زخمی سانپ کی طرح پھنکارے مارتا میں الٹے پاؤں واپس لوٹ آیا تو لاڑی نے آدھے راستے میں ہی مجھے آدبوچا۔

"تم لوٹ آئے ناراض ہو کر...... ارے پگلے یہ تو ہماری روزی روٹی ہے۔ نمبر دار کے ساتھ تو میں ڈھونگ کر رہی تھی۔

لیکن میرا غصہ کافور نہیں ہوا۔

میں آنکھوں میں آنسو بھرے لوٹ آیا۔

اس رات میں نے کھانا نہیں کھایا اگلے دن بھی نہیں۔ سارا دن اپنے گھر کی پچھلی اندھیری کوٹھری میں رضائی میں دبکا پڑا رہا۔ وہ رات وہ دن میرے لئے زندگی کی سب سے اندھیری رات تھی، جس میں میرے تن بدن پر کانٹے چبھتے رہے، روح لہولہان ہوتی رہی۔

اگلے دن گوگلیانی آئی تو اسے دادی سے پتہ چلا کہ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ جب اس کے آواز دینے پر بھی میں باہر نہیں آیا تو وہ خود ہی اندر آ گئی۔ آتے ہی میرے ساتھ رضائی میں لیٹ گئی۔ مجھے سینے سے لگا کر پیار کیا۔ اپنے دوپٹے سے میرے آنسو پونچھے میرے ماتھے اور گالوں کو چوما۔

اتنے میں اس کے اشارے پر دادی میرے لئے چاولوں کی تھالی بھر کر لے آئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک ایک لقمہ کر کے مجھے چاول کھلائے۔ آخری لقمے پر بولی "لے یہ بھی کھالے، اتنے پیار سے تو میں نے اپنے خصم کو بھی کھانا نہیں کھلایا ہوگا۔

پھر وہ پاس کھڑی دادی سے بولی "سردارنی تمہارا یہ پوتا بھی اب جوان ہو گیا ہے۔ اس کے لئے بھی بڑھیا سی لاڑی ڈھونڈ تو پھر میں اس کے بیاہ کی گھوڑی گانے آوں گی۔"

"تو کیا دے گا رے سیالکوٹ کے لاڑے، مجھے اپنی گھوڑی گانے کا" اس نے بڑے پیار سے ٹھوڈی سے میرا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے جیسی سندر چاند سی بہو"۔ میں نے کہا

"یہ بات ہوئی نہ کچھ"

"لیکن وہ میری لاڑی کی بہو ہو گی، نمبردار کی لاڑی کی نہیں" میں نے شرارت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اسکی ہنسی کے ساتھ ہی اس اندھیری کوٹھری کا کونہ کونہ میری لاڑی کے حسن کی چمک سے جگمگا اٹھا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر ماں کی ممتا چھلک رہی تھی اور محبوبہ کا پیار بھی۔

✓

نئی دوستی

جگیرے کے مقابلے میں جب لوگوں نے ستر سالہ بوڑھے استاد لہناسوں کو لنگوٹ کستے دیکھا تو انہوں نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ خود جگیرے کا یہ حال تھا کہ مخالف دھڑے کے استاد کو اترتے دیکھ کر اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ پاؤں تلے سے اکھاڑے کی مٹی کھسکتی محسوس ہوئی۔ اس نے گھبرا کر اپنے استاد کشنے کی طرف دیکھا۔ وہ خود سر سے بندھا انگوچھا اتار کر گلے میں ڈالے، گردن نیچی کیے زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور شاید دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ استاد لہناسوں کی اس چال کا کیا جواب دے۔ جگیرا اکھاڑے کے چار چکر کاٹ چکا تھا۔ لیکن لہناسوں کے پہلوانوں کی ٹولی کو تو اسے دیکھ کر جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ لہناسوں نے گھور گھور کر اپنے پٹھوں کی طرف دیکھا۔ لیکن کسی نے بھی جگیرے کے مقابلے میں اترنے کا دم خم نہیں دکھایا۔ سب کے سب سر نیچا کیے بیٹھے رہے۔ کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اپنے استاد سے بھی نظریں چرا رہے تھے۔ جگیرا، میدان کے تین چکر اور کاٹ لے تو بنا کشتی کے ہی وہ پالا مار لے گا۔ دھمال کا پانچ ہزار کا

انعام اسے مل جائے گا۔

اور اب اچانک خود لہناسوں نے میدان میں اترنے کا فیصلہ کر لیا تو جگیرا اکھاڑے کے بیچ وہاں جا کر کھڑا ہو گیا، جہاں ڈھولچی ڈھول پیٹ رہا تھا۔

دراصل جگیرے نے دس بارہ سال کی عمر میں ہی جب قد کاٹھ نکالنا شروع کیا اور اسکے بازو دھان کوٹنے والی موںگلی کی طرح لمبے ہونے لگے تو لہناسوں نے بہت کوشش کی کہ جگیرا اس کے اکھاڑے میں آ جائے لیکن جگیرے نے ایک "ناں" پکڑلی۔ "نہیں، مجھے پہلوان نہیں بننا ہے" کسی کو یقین بھی نہیں آیا کہ جگیرے نے نہ کر دی۔ لوگ تو لہناسوں کا پٹھا بننے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس کے اکھاڑے کی دور دور تک دھوم مچی تھی اور خود لہناسوں ملک کا نامی گرامی پہلوان۔

اس کا نام تو دوسرے ملکوں میں بھی لیا جاتا تھا۔ وہاں بھی کشتی کے شوقین اس کے داؤ پیچ کی تعریف کرتے تھے۔ اور کنڈلی تو اس کا رام بان تھا۔ جہاں اس نے کنڈلی ماری وہاں طاقتور سے طاقتور پہلوان چاروں شانے چت ہو جاتا۔ جن لوگوں نے اسے کنڈلی مارتے دیکھا تھا وہ کہتے تھے "صاحب لہناسوں کے پاس جادو ہے۔ دوسرے کی ٹانگ میں ٹانگ اڑا کر وہ سانپ کی کنڈلی کی طرح بھاری سے بھاری پہلوان کو اپنے شکنجے میں جکڑ کر پتہ نہیں کیا کرتا ہے کہ دوسرا چت ہو جاتا ہے۔ لوگوں کو تو تبھی پتہ چلتا ہے، جب لہناسوں سینہ پھلا کر ہاتھ اٹھائے اپنی جیت کا اعلان کر رہا ہوتا ہے۔

لہناسوں کا پٹھا بننے کے لئے نوجوان ترستے تھے۔ وہ گھی کے بھرے ہوئے کنستر اور دودھ کے مٹکے بھر بھر کر لاتے اور لہناسوں کی طرف امید بھری نظر سے دیکھتے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے لہناسوں کا سر نہ میں ہل جاتا تو ان کی امیدوں پر پانی پھر جاتا۔ اس کے برعکس یہ جگیرا پتہ نہیں کس مٹی کا بنا تھا کہ ایک مرتبہ نہ پکڑلی تو پکڑلی۔ جگیرے کا دل جیتنے کے لئے لہناسوں اپنے پٹھوں کو کہتا "جاؤ گھی کے یہ کنستر اور دودھ کے مٹکے جگیرے کے گھر چھوڑ آؤ۔ بڑا جی دار لڑکا ہے۔ کھائے پیئے گا تو ایک دن اچھا پہلوان بنے گا۔ علاقے کا نام روشن کرے گا۔

لیکن جگیرے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

پھر پتہ نہیں مخالف دھڑے کے استاد کشنے نے کیا چکر چلایا کہ جگیرے نے اس کے اکھاڑے میں جانا شروع کر دیا۔ لہناسوں کو خبر ملی تو اس نے مایوسی سے گردن نیچے ڈال لی۔ اچھا اس کی قسمت میں تو چاہتا تھا......"

اور اب وہی جگیرا اکھاڑے کے بیچوں بیچ کھڑا للکار رہا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا قد، شیر کی طرح چوڑا سینہ، کندھوں سے، موٹی شاخوں کی طرح جھولتے بازو، اور ٹانگیں تو لگتا ہے جیسے دو ستون ہوں فولادی، جن پر جگیرا آکر ٹک گیا ہے

ڈھول بج رہا ہے۔ بلکہ خود لہناسوں کو ڈنڈ بیٹھک لگاتے دیکھ کر ڈھولچی نے ڈھول کی لے میں تیزی اور گونج بھر دی۔ جگیرے کا انگ انگ پھڑک رہا ہے اور ادھر لوگ ستر سالہ لہناسوں کو دیکھ کر عش عش کر رہے ہیں۔ کیا جسم کمایا ہے۔ اس عمر میں بھی بازوؤں کی مچھلیاں، انگ سے جڑی ہوئی لگتی ہیں" تہمد اتار کر جب لہناسوں قلابازی کھاتا ہوا اکھاڑے کے مرکز کی طرف بڑھا تو لگتا تھا جیسے شیر مستی میں آکر اپنے شکار کی طرف بڑھ رہا ہو۔

ڈھولچی نے ایک مرتبہ ڈھول کی لے کو تیز کیا تو اکھاڑے میں چاروں طرف لوگوں کے دل دھڑکنے لگے۔ اس ڈھول کی گونج میں بھی انہیں اپنے سینے میں دھڑکتے دلوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سارا ماحول تھم سا گیا تھا۔

جگیرا خاموش کھڑا تھا۔ اور لہناسوں دھیرے دھیرے قدموں سے چلتا ہوا جگیرے پر نظریں جمائے یوں دیکھ رہا تھا جیسے مخالف کی طاقت کا اندازہ لگا رہا ہو۔ دس قدم کے فاصلے سے لہناسوں نے جھک کر اکھاڑے کو پرنام کیا پھر اکھاڑے کی مٹی لے کر ماتھے کو لگائی اور پھر جیسے شیر حملہ کرنے کے لئے قدم اٹھاتا ہے، ویسے ہی اس نے دایاں پاؤں ابھی اٹھایا ہی تھا کہ جگیرا بجلی کی پھرتی سے آگے بڑھا اور بوڑھے استاد کے پیروں میں گر پڑا اور زمین پر پڑے پڑے ہی انہیں چومنا شروع کر دیا۔

لوگ حیران! کہ یہ کیا ہو رہا ہے

خود لہناسوں ہکا بکا کھڑا تھا۔ جگیرا دونوں ہاتھوں سے استاد کی ٹانگیں تھامے اپنے ہونٹ اس کے پاؤں کے پنجوں پر جمائے تھا اور انہیں چومے جا رہا تھا۔

آخر لہناسوں نے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر جگیرے کو کھڑا کیا۔ جگیرے کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اس کے چوڑے سینے کو بھگو رہے تھے۔ لہناسوں نے جگیرے کو اپنے سینے سے لگایا۔ کندھا تھپتھپا کر اس کی ڈھارس بندھائی۔

کشتی نہ ہونے کی وجہ سے لہناسوں دھمال کے پہلے انعام کا حقدار قرار دیا گیا اور جگیرا دوسرے انعام کا۔

انعام کی رقم وصول کرنے کے لئے جب لہناسوں اور جگیرا آگے پیچھے، آگے بڑھے تو عین موقعہ پر لہناسوں نے جگیرے کو آگے کر دیا۔

"پہلے انعام کا حقدار جگیرا ہی ہے، پہلے انعام کا حقدار جگیرا ہی ہے۔" لوگوں نے لہناسوں کو بار بار یہ کہتے سنا تو عش عش کر اٹھے۔

جگیرا حیران کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ استاد خود اسے آگے کیے پہلا انعام اس کی جھولی میں ڈلوا رہا تھا۔ اور لوگوں کے ہونٹوں پر لہناسوں کی تعریف کے بول تھے۔

تبھی جگیرے نے انعام کی رقم لہناسوں کے قدموں میں ڈال دی۔ "یہ گورو دکشنا ہے۔" جگیرا کہہ رہا تھا۔ اب لہناسوں کے چکرانے کی باری تھی۔

جگیرا پھر اس کے پاؤں پکڑے تھا۔

تبھی جگیرے کا استاد کشنا آگے بڑھا اور لہناسوں کے ہاتھوں میں مولی کا دھاگا دیتے ہوئے بولا "لو یہ جگیرے کے ہاتھ میں باندھ دو۔ اسے اپنی شاگردی میں لے کر کنڈی مارنا سکھا دو تو وہ سچا پہلوان بن جائے"۔

لہناسوں کے کان میں کشنے کے الفاظ پڑے تو اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔

دو مخالف دھڑوں میں نئی دوستی کی بنیاد پڑی تھی۔ اس لئے ڈھولچی کے ڈھول کی گونج چاروں طرف دور دور تک مٹھاس بکھیر رہی تھی۔ ☆☆

چلتی چرخی

لوہار کے بیٹے رحمت کے سپنوں میں بھٹا اور پھا تان گھس آتے ہیں، اس لیے اس کی سپنوں کی حسین دنیا کا تانا بانا بار بار بکھر جاتا ہے، ٹوٹ جاتا ہے۔

بھٹی کی آگ کو ہوا دینے والی دھونکنی کی چرخی گھماتے ہوئے رحمت تصور ہی تصور میں اپنی محبوبہ کے ساتھ ایک پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر بیٹھا تھا۔ سیداں کے الفاظ اس کے کانوں میں رس گھول رہے تھے۔ ”ہائے رے تیرے بازو کی مچھلیاں، تیرے ہاتھوں کی انگلیاں یہ تو لگتا ہے جیسے لوہے کی بنی ہوں۔ میں تو کہتی ہوں تو سارے کا سارا لوہے کی دھات کا ڈھلا ہوا ہے۔“

”ہاں ہے تو میرا جسم لوہے کا ہی بنا ہوا مگر جب تو میرے پاس ہوتی ہے تو میرا جسم گوشت پوست کا بن جاتا ہے۔ میری رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے۔“

”اور تمہاری سانس کی دھونکنی چلنے لگتی ہے۔“ سیداں نے اس کی بات اچک لی تھی۔ اور وہ ہنستی ہوئی دوہری ہو ہو کر کہہ رہی تھی۔ ”ایسے میں عشق کی بھٹی میں آگ کی

لپٹیں اٹھنے لگتی ہیں اور بے چاری سیداں کو ڈر لگنے لگتا ہے کہ اس آگ کی آنچ مجھے جلا کر زاکھ نہ کر دے۔"

رحمت آپے سے باہر ہو کر سیداں کے لال لال ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھنے ہی جا رہا تھا کہ کھٹاک کی آواز آئی۔

پھتا اور پھاتاں پھر اس کے تصور میں در آئے تھے۔

پھتے نے پھاتاں کے گال پر زوردار تھپڑ جما دیا اور کہا کہ ہنسو۔ کھل کھلا کر ہنسو۔

پھاتاں نے اپنا گال سہلاتے ہوئے برا سا منہ بنایا تو پھتے نے دوسرا تھپڑ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھا لیا۔ "دیکھ میری جان۔ یہاں رونے دھونے کا کام نہیں۔ پھتے کی دنیا کا قانون یہی ہے کہ مار بھی کھاؤ اور دنیا پر یہ بھی ظاہر کرو کہ تم ہم سے بہت خوش ہو۔" یہ کہتے ہوئے پھتے نے ایک زوردار جھانپڑ اور مار دیا۔

مارے درد کے پھاتاں بلبلا اٹھی۔ لیکن ایسے میں اس نے اپنی بے بسی کو غالباً اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اس لئے ایک طرف تو مارے درد کے اس کی آنکھوں میں آنسو تیر آئے تو دوسری طرف اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی بکھر گئی۔

"ہاں ہاں مسکراؤ، مسکراتی ہوئی تم مجھے اچھی لگتی ہو" یہ کہتے ہوئے پھتا دو قدم پیچھے ہٹ کر اس کی طرف گہری نظر سے دیکھنے لگا۔ میرے نام سے تو تم پہلے سے واقف ہی ہو گی؟"

پھاتاں چپ رہی۔ لیکن آنکھیں یوں نیچی کیں جیسے وہ کہنا چاہتی ہو کہ تمہارا نام تو سن رکھا ہے، مگر تھو ہے تمہارے نام پر۔"

خیر۔ تم نہیں بولتی تو ہمیں بتائے دیتے ہیں۔ بڑے بڑے بدمعاش، عیاش قاتل، عیار، چور، ٹھگ، نوسر باز سب کے سب میری چوکھٹ پر ناک رگڑتے ہیں"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک اور زوردار چانٹا پھاتاں کو جڑ دیا اور حکم دیا کہ اب کی کھل کھلا کر ہنسو ذرا کھل کر۔

چانٹا کھا کر پھاتاں کھلکھلا کر ہنس دی تو پھتے نے خوشی کا نعرہ مارا۔

”لے بھئی لے ہوگئی راضی۔“

”چل بھئی پھتے منگوالے قاضی“

یہ کہتے ہوئے پھتے بولا۔ ”دیکھ پھاتاں۔ ایسے ہی ہمارے حکم مانتی رہو گی تو جندگی میں بڑے سکھ پاؤگی اور رہے یہ دو تین تھپڑ جو میں نے مارے ہیں تجھ کو۔ یہ میں نے تیرے کو نہیں مارے۔ اپنے آپ کو مارے۔ جتنا درد تجھے ہو رہا ہے نہ اس سے جیادہ وہ مجھے ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے ہو رہا ہے کہ میں تجھ پر دل وجان سے پھر پھتہ ہوں۔ اب تو راضی ہو گئی ہے نہ تو کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہے۔ اب سمجھ لے تو کہ تیری قسمت کھل گئی تیرے چنگے دن آگئے۔“ وہ ایک پل کے لئے رکا اور پھر بولا۔ ”اب تو گھر جا۔ اور اپنے سالے باپ سے کہہ دے کہ تیرا نکاح مجھ سے کروادے کوئی آنا کانی نہ کرے۔ اس کو سمجھا دینا کہ اس نے ناں کی تو پھر مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ یہ بات وہ جانتا ہی ہے کہ جس چیز پر میری نظر ٹک جاتی ہے، اسے میں اپنی بنا کر ہی دم لیتا ہوں اور تجھ پر میری نظر ٹک گئی ہے، سمجھی۔“

بھٹی کی آنچ کچھ ہلکی ہو گئی تھی۔ اس لئے رحمت نے دھونکنی کی چرخی کی رفتار تیز کر دی۔ بھٹی کی آنچ جب اپنے پورے جوبن پر آئی تو رحمت لوہار پھر سپنے کی دنیا میں اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ جہاں وہ تھوڑی دیر پہلے اپنی سیداں کے پاس بیٹھا تھا۔ سیداں وہاں نہیں تھی۔ اور وہ چٹان جس پر وہ اور سیداں بیٹھے تھے وہاں پھولوں کے پودے اگ آئے تھے۔

تو کیا؟ جہاں دو پیار کرنے والے بیٹھتے ہیں وہاں پھول اگ آتے ہیں۔ رحمت نے سوچا اور ذرا سا جھک کر اس نے ایک پھول کو سونگھا۔ رحمت کو اس پھول سے سیداں کے جسم کی خوشبو آئی۔ اس نے حیران ہو کر دوسرے پھول کو سونگھا۔ پھر تیسرے پھول کو، پھر چوتھے پھول کو، اسے ہر پھول سے سیداں کے جسم کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس خوشبو نے اس پر نشہ سا طاری کر دیا۔ خوشبوؤں کے اس نشے سے سرشار ہو کر اس نے سامنے افق کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سیداں نے آسمان کی تختی پر اس کا اور اپنا نام لکھ کر اس کے چاروں طرف پھولوں کی بیل بنا دی تھی۔ اسے بڑا اچھا لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ سیداں

کے جسم کو ٹھیک اسی طرح اپنی باہوں میں لپیٹ لے جس طرح پھولوں کی بیل ان دونوں کے ناموں کے گرد لپٹی ہوئی ہے۔ اس نے اس مقصد کے لئے اپنی باہیں پھیلا دیں۔ لیکن سیداں پہاڑ کی گود میں سمندر کی لہروں میں اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔ اس نے وہیں سے نیچے سمندر میں چھلانگ لگا دی اور وہ دوسرے ہی لمحے اپنی سیداں کے ساتھ سمندر کی لہروں پر تیر رہا تھا۔

سمندر میں تیرتے ہوئے ان دونوں نے دیکھا کہ سمندر کی مچھلیاں کیسے ایک دوسرے سے پیار کا کھیل کھیلتی ہیں۔ مادہ تیرتی ہوئی آتی اور اپنے نر کے جسم سے اپنا جسم رگڑتی ہوئی اس کے اوپر سے نکل جاتی۔ نر بھی یہی کرتا۔ رحمت اور سیداں کتنی دیر تک مچھلیوں کے اس پیار بھرے کھیل کو دیکھتے رہے۔ انہوں نے خود بھی کوشش کی کہ مچھلیوں کی طرح تیرتے ہوئے وہ بھی ایک دوسرے سے پیار کریں۔ لیکن ان سے ایسا ہو نہیں پا رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے اوپر سے تیرتے ہوئے نکل تو جاتے لیکن پھر اسی پھرتی سے واپس نہ مڑ پاتے۔ پتہ نہیں وہ کب تک اس طرح پانی میں سرمستی کرتے رہتے کہ تبھی رحمت نے دیکھا کہ ان کے اوپر بہت بڑا جال پھینک دیا گیا ہے اور اس کا ہالہ ان کے گرد تنگ ہوتا جا رہا ہے وہ سمجھ گیا کہ اگر اس نے ذرا بھی دیر کی تو وہ دونوں شکاری کے جال میں بندھ چکے ہوں گے۔

سر پر منڈراتے ہوئے جال کے گھیرے کو دیکھ کر سیداں کا عاشق، رحمت آن کی آن میں لوہار کا بیٹا بن گیا۔ اس کا گوشت پوست کا جسم لوہے کے جسم میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے جیب سے چاقو نکالا اور دیکھتے ہی دیکھتے جال کے بندھنوں کو کاٹ کر ریزہ ریزہ کر کے پھینک دیا۔

"تم تیرتے ہوئے مجھ سے دور کیوں نکل گئے تھے؟" سیداں نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔

مچھیرے نے ہمیں پکڑنے کے لئے جال پھینکا تھا۔ اسے کاٹنے کے لئے یہاں تک آنا پڑا۔

"اس نے جال کیوں پھینکا تھا۔ وہ ہمیں کیوں پکڑنا چاہتا ہے" سیداں سوال پر سوال کئے جا رہی تھی۔

"کچھ لوگ دوسروں کے حصوں کی خوشیاں بھی اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔ وہ زندگی کی کوکھ کو سونا کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے رحمت اداس ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے سپنے کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

بھٹی میں کوئلے کم ہو گئے تھے۔ رحمت نے کوئلے توڑ کر اس میں اور کوئلے ڈالے۔ لوہے کی سلاخوں کو تپنے کے لئے کوئلوں کے بیچ وبیچ جمایا اور پھر دھونکنی کی چرخی چلانے لگا۔ چرخی گھماتے گھماتے اس کا دھیان پھاتاں کی طرف چلا گیا کہ اس نے کس طرح پھتے کو مزہ چکھایا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ جس دن پھتے نے پھاتاں کو تھپڑ مار مار کر ہنسنے پر مجبور کیا تھا اس کے دو تین دن بعد ہی پھاتاں کی ایک سہیلی پھتے کے پاس گئی اور کہا کہ پھاتاں نے اسے دوپہر کے وقت حویلی میں بلایا ہے۔ پھتا وہاں پہنچا تو پھاتاں نے مسکراتے ہوئے اس کو خوش آمدید کہا اور اسے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جس پر صاف ستھرا کھیس بچھا ہوا تھا۔ پھتا جیسے ہی تخت پر بیٹھا۔ اس کے کمزور تختے ٹوٹ گئے اور پھتا گر گیا۔ پھتے کے گرتے ہی پھاتاں کی چار پانچ سہیلیوں نے پھتے کو دھر دبوچا اور اس کی مشکیں کس دیں۔ پھر ان میں سے کسی نے اس پر شہد بھرا کٹورا الٹ دیا۔ یہ سب ہو چکا تو پھاتاں نے اس پر ایک اور ڈبا الٹا تو کالے منہ والے یہ بڑے بڑے بھو کے چینٹے پھتے کے جسم کو کاٹنے لگے اب چینٹے اس کے جسم کو کاٹ رہے تھے۔ مارے درد کے پھتا تڑپ رہا تھا اور پھاتاں اور اس کی سہیلیاں پاس کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ ہنسو۔

پھتا ہنسنے کی کوشش کرتا تو مارے درد کے اس کے ہونٹوں سے کراہنے کی آواز نکلتی۔ ایسے میں پھاتاں ایک پتلی سی چابک لے کر سر پر کھڑی ہو گئی۔"

"ہنستا ہے یا دوں چابک کی مار"۔

کہتے ہیں کہ جب پھتا بے ہوش ہونے لگا تو پھاتاں نے اس کی مشکیں کھلوائیں اس

کو نہلایا، دھلوایا، نئے کپڑے پہننے کو دئے اور پھر قاضی بلوا کر چھتے سے نکاح کر کے اس کے گھر آ گئی۔

اور جب سے ان آفت کے پرکالوں کا جوڑ ہوا ہے تب سے یہ دنیا بھر کے لئے مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ ان کی دشمنی تو خیر دشمنی ہے ہی اگر یہ دونوں کسی پر درحقیت مہربان بھی ہو جائیں تو سمجھ لو کہ اس پر کوئی بڑی آفت آنے والی ہے۔

بے چارے رحمت کو ان آفت کے پرکالوں کی دنیا سے کہیں نجات ملتی ہے تو وہی اپنے سپنوں کی دنیا میں۔ دھونکنی سے پوری پوری ہوا ملنے کی وجہ سے بھٹی کی آگ تیز ہوئی تو کوئلے چٹخنے لگے۔ آگ کی لپٹیں اٹھنے لگیں اور لوہے کی سلاخوں کی رنگت آگ کی رنگت میں تبدیل ہونے لگی۔

رحمت نے اس آگ کی تپش کو برقرار رکھنے کے لئے کوئلوں کا ایک اور جھونکا پھینکا اور تیز رفتار سے چرخی چلاتے چلاتے ایک مرتبہ پھر وہ اپنے سپنوں کی دنیا تخلیق کرنے میں مصروف ہو گیا۔

جس وادی میں رحمت اور سیداں مل کر یہ دنیا تخلیق کر رہے تھے وہ چاروں طرف سے اونچے اونچے آسمان کو چھوتے ہوئے برف سے ڈھکے پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی۔ رحمت اور سیداں نے پہاڑ کی ڈھلان پر چھوٹا سا پھولوں کا باغیچہ اگایا۔ پھر انہوں نے اپنے باغیچے میں ایک چھوٹا سا خوب صورت سا گھر بنایا جو سردی کے موسم میں اندر سے گرم رہتا تھا اور گرمی کے موسم میں ٹھنڈا، بڑا بھرا، بھرا سا گھر تھا وہ خوب صورت آرام دہ پلنگوں پر نرم اور صاف ستھرے بستر بچھے ہوئے، کتابوں کی الماریاں، میز پر رکھے ہوئے کھانے اور پھولوں کی خوشبو، گھر کے آنگن میں تتلیوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے بچے۔ یہ سب بنا کر رحمت اور سیداں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ان ہی کی طرح کے سینکڑوں ہزاروں مکانوں، صاف ستھری سڑکوں اور پارکوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ یہ کیسے ہو گیا؟ انہوں نے سوچا۔ اور پھر انہیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انہی کی طرح سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں رحمت اور

سیداں مل کر اپنی اپنی دھونکنی کی چرخی گھماتے ہوئے زندگی کو خوب صورت بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اتنا کچھ کرنے کے بعد رحمت کا سینہ فخر سے چوڑا ہو گیا وراس نے مسکرا کر اپنی سیداں کی طرف یوں دیکھا جیسے پوچھنا چاہتا ہو کہ بولو تمہیں اس گھر میں اور کیا چاہئے۔

سیداں نے اس کے دل کی بات سمجھ کر کہا۔ سب ٹھیک ہے۔ بس ایک ہی چیز کی کمی ہے۔"

"وہ کیا؟ رحمت نے پوچھا۔"

آسمان سے کہکشاں اتار کر لانا باقی رہ گیا ہے۔

"یہ کون سا مشکل کام ہے۔ آؤ ایک اونچی مچان بناتے ہیں۔ وہاں سے آسمان پر کمند پھینک دیں گے۔"

وہ دونوں مل کر مچان بنا ہی رہے تھے کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور کڑی محنت اور لگن سے بنائی ہوئی رحمت اور سیداں کی دنیا کے پرخچے اڑ گئے۔ اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی۔ پھولوں کا باغیچہ کہیں جا گرا، مکان دوسری جگہ گر کر ڈھیر ہو گیا۔ تمام مکان، سڑکیں، پارکیں ٹوٹے ہوئے گھڑے کے ٹکڑوں کی طرح بکھر گئے۔ پہاڑ سے گرتے ہوئے جھرنے کا سنگیت پتھروں میں ڈوب گیا۔ زندگی کی دھوپ غریب کے چیتھڑوں کی طرح میلی ہو کر ریزہ ریزہ ہو کر بکھری پڑی تھی۔

دھول میں اٹے رحمت اور سیداں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھتا اور پھاتاں ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ان کی بے بسی کو دیکھ کر کھل کھلا رہے تھے۔

رحمت کے سپنے کی دنیا اجڑ گئی تھی۔

رحمت کا سپنا بکھر گیا تھا۔

بھٹی میں کوئلوں کی آنچ مدھم ہو گئی تھی۔ چرخی چلانے والا ہاتھ نہ جانے کب رک گیا تھا۔

سپنے کی دنیا سے باہر آ کر رحمت نے ایک مرتبہ پھر بھٹی میں اور کوئلے ڈالے۔

غصے سے بھر کر دھونکنی کی چرخی کو اور زور زور سے چلانا شروع کیا اور بھٹی کی آگ میں رکھی ہوئی سلاخوں کو لال ہوا دیکھ کر اس نے سنسی کی مدد سے ایک سلاخ باہر نکالی اور مار توڑ لے کر اس پر ضرب لگانے ہی جا رہا تھا کہ پھتا اور پھاتاں، گوشت پوست کے پھتا اور پھاتاں اس کے لوہار خانے میں داخل ہوئے اور پھتے نے آتے ہی حکم دیا۔ ''ہمارے لئے دو درانتیاں بنا دو۔ ابھی''

رحمت غصے میں تو تھا ہی۔ آگ میں تپتی ہوئی لال لال سلاخ پر ہتھوڑا مارتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس فرصت نہیں ہے۔''

''کیا کہا؟'' پھتے نے پوچھا۔

''کہہ دیا نہ فرصت نہیں ہے۔ سنا نہیں تم نے''

''تم جانتے ہو کس سے نہ کہہ رہے ہو اس دنیا میں کسی مائی کے لال کی ہمت نہیں کہ پھتے اور پھاتاں کو نہ کہہ دے''

دیکھ پھتے چپ چاپ یہاں سے باہر نکل جاؤ تم دونوں۔ اگر ذرا بھی دیر کی تو یہ لوہے کی جلتی ہوئی سلاخ تمہارے پیٹ میں گھسیپ دوں گا۔ یا پھر اسی ہتھوڑے سے تم دونوں کے سر توڑ دوں گا۔''

پھتے نے دیکھا کہ رحمت کی آنکھیں اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لوہے کی سلاخ کی طرح لال ہو رہی تھیں۔ اس لئے ان دونوں نے وہاں سے چپ چاپ چلے جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

اس کے جاتے ہی رحمت نے بھٹی میں اور کوئلے ڈالے۔ کوئیلوں پر لوہے کی نئی سلاخیں رکھیں اور زور زور سے دھونکنی کی چرخی چلانے لگا۔

گریا کی ڈالی

گاڑی کے اندر اور باہر ماحول بہت خوب صورت ہو رہا تھا۔

اندر میرے سامنے والی سیٹ پر کھڑکی کے پاس ایک خوب صورت لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے کھلے بال اس کے دونوں کندھوں پر لہرا رہے تھے۔

باہر جنگل میں دور دور تک پھیلے ہوئے گریا کے پیڑوں کی ڈالیوں پر سنہرے پیلے اور ہرے رنگ کے پتے ایسا نظارہ پیش کر رہے تھے جیسے سینکڑوں ہزاروں، الھڑ آدی باسی عورتیں رنگ برنگے پتوں اور پھولوں کے زیور پہنے بے خود ہو کر ناچ رہی ہوں۔

میری نظر کہیں نہیں ٹک رہی تھی۔

سامنے بیٹھی لڑکی کی طرف دیکھتا تھا تو اسکے کالے بالوں میں گھرا ہوا حسن اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ میرے ہوش و ہواس اڑا رہا تھا۔ ہوا میں لہراتے ہوئے اپنے بالوں کو قابو میں کرنے کے لئے وہ ایک ادا سے بالوں میں انگلیاں پھیرتی تو میرا دل بے قابو ہو جاتا۔ وہ جنگل کی طرف سے آنے والی تازہ ہوا کو زیادہ سے زیادہ سینے میں بھر لینے کے لئے لمبے لمبے

سانس لیتی تو اس کے جسم کے زیر و بم کو دیکھتے ہوئے میرا دم نکلنے لگتا۔

میں بمشکل تمام لڑکی کی طرف سے نظریں ہٹا کر باہر جنگل کی طرف دیکھتا تو گریا کے پیڑوں پر آئی ہوئی بہار کو دیکھتے ہوئے میری نظریں افق تا افق پھیلتی چلی جاتیں۔ نیلے آسمان کے چوکھٹے میں سج کر قدرت اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ خوب صورت تصویر کی صورت یوں پھیلتی جارہی تھی جیسے زندگی نے دلہن بن کر دھرتی پر پہلا قدم رکھا ہو اور اب شرماتی لجاتی ہولے ہولے قدم رکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہو۔

تبھی میں نے محسوس کیا جیسے گلاب کی خوشبو کا جھونکا مجھے اپنی لپیٹ میں لے رہا ہو۔ میں نے افق سے نظریں سمیٹ کر گاڑی کے آس پاس دیکھا۔ کہیں پھولوں کی باڑی نہیں تھی۔ وہی گریا کے رنگ برنگے پتے تھے۔ تو کیا پتے بھی پھولوں کی طرح مہکتے ہیں؟ میں نے سوچا۔

گلاب کی مہک متواتر میرے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے گاڑی کے اندر دیکھا۔ لڑکی بالوں کی لٹوں میں یوں انگلیاں پھیر رہی تھی جیسے انہیں سلجھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ تبھی مجھے احساس ہوا کہ یہ خوشبو اس کے لہراتے ہوئے بالوں سے آ رہی تھی۔ ممکن ہے اس نے اپنے بالوں کو گلاب ملے شیمپو سے دھویا ہو۔ یا ایسا ہی کوئی عطریا تیل لگایا ہو۔ یا پھر کون جانے زندگی خود گلاب بن کر اس کے بالوں میں مہک رہی ہو۔ حقیقت کچھ بھی ہو۔ بڑی لطیف سی خوشبو تھی وہ۔

اس کے بالوں کی خوشبو میں ڈوبے ہوئے میرے ذہن نے کئی رنگین تانے بانے بن ڈالے۔ انہی رنگین تصویروں میں کھوئے ہوئے میں نے نظر بھر کر اس لڑکی کی طرف دیکھا تو مجھے لگا کہ جنگل کی خوبصورتی نے اس کو بھی دم بخود کر دیا تھا اور اس کی نظریں جنگل کے پیڑوں کے اوپر سے تیرتی ہوئی آسمان میں وہاں اٹک کر رہ گئی تھیں جہاں دو کونجیں پہاڑی ندی کے اوپر اڑتی ہوئیں دور اڑتی ہوئی کونجوں کی ڈار تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”بڑا ہی خوب صورت نظارہ ہے،، میں نے اس لڑکی سے رسم و راہ پیدا کرنے کی

کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''بے حد خوب صورت۔ ''ایسا خوب صورت جنگل میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔''

وہ ایک پل کے لئے رکی۔ اپنے کھلے بالوں کی ایک لٹ کو کمر پر پھینکنے کی ناکام کوشش کی اور پھر بولی ''ان پیڑوں کا نام کیا ہے؟''

یہ گریا کے پیڑ ہیں۔ دسمبر جنوری کے مہینوں میں جب دوسرے پیڑوں پر خزاں آتی ہے تو ان پر بہار چھا جاتی ہے۔ قدرت اپنے آنگن کو ہزار رنگوں سے سجالیتی ہے۔ اب دیکھیے نہ ایسا لگتا ہے جیسے قدرت نے پتوں کو پھولوں کے رنگ عطا کردیئے ہوں۔

میں چاہتا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ باتوں کا سلسلہ زندگی کے اس سفر میں آخر تک چلتا رہے۔ اس لئے میں نے آن کی آن میں کلپنا کے سہارے اس جنگل میں لگے گریا کے پیڑوں کے بارے میں ایک جھوٹی کہانی گھڑ ڈالی اور اسکے دل میں تجسّس پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے ان پیڑوں کے بارے میں اس علاقے کے آدی باسیوں میں ایک دنت کتھا بھی ہے۔

''وہ کیا ہے' سنایئے، ضرور سنایئے۔ کہانی سنتے سنتے زندگی کا یہ سفر سہاونا ہو جائیگا''

یہ کہتے کہتے وہ میری طرف جھک آئی تو مجھے لگا جیسے گریا کے پیڑ کی رنگین ڈالی میری طرف جھک آئی ہو۔

لڑکی کے کالے لمبے بال پیٹھ سے سرک کر اس کے گلے میں آگئے اور اس کے چہرے کو اپنے ہالے میں لے لیا۔ بالوں کے اس ہالے میں گھری وہ تن بہ گوش ہوگئی اور میں نے اپنی کہانی سنانی شروع کی۔

ایک آدی باسی لڑکی تھی بڑی خوب صورت۔ اسے پھولوں کے زیور پہننے کا اتنا شوق تھا کہ لوگوں نے اس کا نام ہی پھول مالا رکھ دیا تھا۔ اس لڑکی کے یوں تو بہت سے چاہنے والے تھے۔ لیکن اس کا ایک پریمی اپنی پھول مالا کے لئے ہر روز ایک سے ایک سندر پھول چن کر لاتا۔ اسے رِجھانے کے لئے، اپنی بنانے کے لئے، ہزار ترکیبیں کرتا اور پھول مالا بھی اس کے لائے ہوئے پھولوں کی بینی بنا کر اپنے جوڑے میں باندھتی ہوئی، لجاتی، شرماتی،

مسکراتی، مگر پھر بھی اس کے آگے بات نہ بڑھ پاتی۔

"پھول مالا۔ تم میری کب ہو گی؟" پریمی نے ایک دن پوچھا۔

جب مجھے تمہاری پریت پر پورا وشواش ہو جائے تب

میں تو تمہارے لئے ایک سے ایک اچھا پھول چن کر لاتا ہوں۔

تمہارے لائے ہوئے پھولوں کی بنی بینی سویر تک مرجھا جاتی ہے۔

پھول ہیں۔ رات بھر میں تو مرجھا ہی جائیں گے۔

میں کچھ نہیں جانتی۔ جس دن تمہارے لائے ہوئے پھولوں کی بینی شام کو باندھوں اور وہ صبح ہونے پر بھی اسی طرح تروتازہ رہے۔ اس دن مجھے یقین آجائے گا کہ تمہاری پریت سچی ہے۔ اس دن میں تم سے بیاہ رچالوں گی۔

اب ان دونوں کی یہ باتیں کوئی دوسرا بھی سن رہا تھا۔ اس نے یہ بات ان لڑکوں کو جا سنائی جن کی طرف پھول مالا آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ پھول مالا کا پریمی دھن کا بڑا پکا ہے۔ اگر کسی دن وہ ایسے پھول چن کر لے آیا جو رات بھر میں نہ مرجھائیں تو پھول مالا اس کی ہو جائے گی اور وہ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ اس لئے ان سب نے مل کر منصوبہ تیار کیا۔ اور اپنے ارد گرد کے جنگل میں اگے پھولوں کے تمام پودے کاٹ کر رکھ دیے۔

اگلے دن پھول مالا کا پریمی، پھولوں کی تلاش میں نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ جنگل میں پھولوں کا کوئی پودا دکھائی نہیں دیتا۔ اب وہ کرے تو کیا کرے۔ بڑا مایوس اور فکر مند ہو کر تھکا تھکا سا ایک پتھر پر بیٹھا وہ خون کے آنسو بہا رہا تھا کہ اسے ایک بوڑھا آدمی اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے دیکھا کہ بوڑھے کے جھریوں بھرے چہرے پر زندگی کا تجربہ چمک رہا ہے۔ اس نے اس بوڑھے کو اپنی ساری رام کتھا سنادی۔

بوڑھے نے کہا۔ عشق میں رونے دھونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تم ایسا کرو کہ فلاں فلاں پہاڑ پر جاؤ۔ اس کی چوٹی پر گریا کا ایک پیڑ اگا ہوا ہے۔ اس کے پتوں کے رنگ ایسے ہیں کہ پھولوں کے رنگ بھی ان کے سامنے مات پڑ جائیں۔ تم اس پیڑ سے اپنی پریمیکا

کے زیوروں کے لئے ایک ڈالی مانگ لینا۔ بھگوان بھلی کرے گا۔

لمبا سفر جھاگ کر نوجوان اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا، اور گریا کے عجیب و غریب پیڑ کو دیکھ کر اس کا جی خوش ہو گیا۔ اس پیڑ کے پتے پھولوں سے بھی زیادہ سندر لگ رہے تھے۔ ایک پل میں اس کے من کی مراد اس کے ہونٹوں پر آگئی۔

گریا گریا ڈالی دے
ڈالی پھولوں والی دے
پھول مالا کا من پتیائے
وہ مری دلہن بن جائے

گریا کے پیڑ نے اس کی بات سن کر کہا۔ تمہارا پیار بڑا سچا ہے۔ مگر میرے پتوں کا رنگ ابھی کچا ہے۔ تو ایسا کر۔ فلاں تالاب پر جا۔ وہاں سے ایک کٹورا پانی لا۔ اس پانی کو میری جڑوں میں ڈال۔ اس سے پتوں پر آجائے گا پورا نکھار۔ پھر تم ڈالی لے کر جاؤ اور پھول مالا کو بیاہ لے آؤ۔

پریمی نے پھر لمبا سفر طے کیا اور گریا پیڑ کے بتائے ہوئے تالاب کے پاس پہنچا۔

تال تال تو پانی دے
گریا تیرا پانی لے
مجھ کو دے گا اپنی ڈالی
سندر رنگ کے پتوں والی
پھول مالا کا من پتیائے
اور میری دلہن بن جائے

تالاب نے بھی اس کی پریم گاتھا کو بڑے دھیان اور ہمدردی سے سنا اور کہا کہ تمہارے سچے پیار کو دیکھتے ہوئے میں تمہیں اپنا پانی ضرور دوں گا لیکن جتنا پانی تمہیں درکار ہے اتنا پانی تمہیں فلاں دریا سے لاکر میرے اندر ڈالنا ہوگا یہ سیدھا راستہ اس دریا کی طرف جاتا

ہے۔ تم وہاں سے پانی لے آؤ اور مجھ سے پانی لے جاؤ۔

اب وہ پریمی تالاب کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا چلتا، دریا کے پاس پہنچا۔ اسے پرنام کیا اور اپنی رام کہانی سنانی شروع کی۔

دریا پانی، تال کا پانی
اس سے میرے بنے کہانی
گریا کو میں پانی دوں
تب اس سے میں ڈالی لوں
پھول مالا کا من پتیائے
وہ میری دلہن بن جائے

دریا نے کہا۔ فلاں پہاڑ کے پاس ایک پانی کا جھرنا ہے۔ اگر تمہیں پھول مالا سے بیاہ کرنا ہے تو اس جھرنے کے پاس جاؤ وہ جھرنا مجھے پانی دیتا ہے۔ وہی پانی میرے اندر بہتا ہے ان دنوں وہ جھرنا مجھے بہت کم پانی دے رہا ہے۔ اس سے میرا حق دلواؤ اور ضرورت بھر پانی لے جاؤ۔

اب وہ نوجوان جھرنے کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔

جھرنے جھرنے سن میرے یار
میرا بیڑا کر دے پار
تو دریا کو پانی دے
تلیا اس سے پانی لے
تال کا پانی گریا کو دوں
تب اس سے میں ڈالی لوں
پھول مالا کا من پتیائے
اور میری دلہن بن جائے

تبھی نوجوان نے دیکھا کہ وہ جھرنا پہاڑ کی ایک گپھا کے اندر سے نکلتا ہے اور گپھا کے منہ پر ایک بہت بڑا پتھر رکھا ہوا ہے۔ اسی پتھر کے نیچے سے تھوڑا تھوڑا پانی رس کر جھرنا بن کر نیچے گر رہا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر پورا تان لگا کر جھرنے کے منہ پر رکھا ہوا وہ پتھر ہٹایا تو جھرنا کھل کھلا کر ہنس پڑا اور اس کا پانی پوری رفتار سے نیچے گھاٹی میں گرنے لگا۔

یہ کام کر کے وہ نوجوان دریا کے پاس پہنچا تو اس نے اسے ایک کٹورا پانی دے دیا۔ یہ پانی لے کر اس نے گریا کے پیڑ کی جڑوں میں ڈالا تو اس کے پتے سونے کی طرح دمکنے لگے اور اس نے خوش ہو کر اسے اپنی سب سے اچھی ڈالی توڑنے کی اجازت دے دی۔

وہ نوجوان گریا کے پتوں کی وہ خوب صورت ڈالی لے کر تیز تیز گھر کی طرف جا رہا تھا۔ تو اسے قریب سے کہیں بچاؤ بچاؤ کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک غار ہے، جس کے منہ پر بہت بڑا پتھر رکھا ہوا ہے۔ وہ آوازیں اسی کے پیچھے سے آ رہی تھیں۔ اس نے پورا زور لگا کر وہ پتھر ہٹایا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس غار کے اندر اس کے گاؤں کے بہت سے نوجوان بندھے کھڑے تھے۔

نوجوان نے آگے بڑھ کر ان سب کو بندھنوں سے آزاد کیا تو وہی بوڑھا مسافر وہاں آ گیا، جس نے اسے صبح گریا کے پیڑ کا راستہ بتایا تھا۔

ان لڑکوں کو میں نے جنگل میں سے اگے پھولوں کے پودے کاٹنے کے جرم میں بند کر دیا تھا۔ تم نے انھیں آزاد کیوں کر دیا۔ یہ تو تمہارے دشمن ہیں۔

دشمن ہیں تو کیا ہوا۔ ہیں تو آخر یہ میرے ہی بھائی بند ہو۔ انہیں معاف کر دو بابا۔

تم کہتے ہو تو معاف کر دیتا ہوں۔ لیکن ایک شرط پر

"ہم سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ ہمیں معاف کر دو بابا" وہ ایک ساتھ بول اٹھے

تمہیں یہ کرنا ہو گا کہ یہ گریا کے بیج لے جاؤ اور اس جنگل میں گریا کے اتنے پیڑ اگاؤ اتنے پیڑ اگاؤ کہ سارا جنگل بھر جائے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے گریا کے بیجوں کی پوٹلی ان کی طرف بڑھا دی۔

بس اس طرح اس جنگل میں ہر طرف گریا کے پیڑ ہی پیڑ اگ آئے۔

"اور اس پھول مالا اور پریمی کا کیا ہوا" وہ لڑکی اس کہانی کا انجام جاننے کے لئے میری طرف اور جھک آئی۔

ہونا کیا تھا۔ پریمی نے گریا کے پیڑ والی ڈالی پھول مالا کو جا کر دی تو وہ ان کے پتوں کی خوب صورتی دیکھ کر مگدھ ہو گئی۔ اس کی بینی بنا کر اپنے جوڑے میں باندھی اور اگلے روز اس سے شادی کر لی۔

"بہت اچھی دنت کتھا ہے" وہ لڑکی بولی۔

اس علاقے میں آج بھی جب کوئی نوجوان کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے گریا کے پتوں سے لدی ٹہنی لا کر دیتا ہے۔ اگر وہ لڑکی اس کی بینی بنا کر بالوں میں سجا لے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ لڑکی اس سے شادی کرنے کو تیار ہے۔

بہت اچھا چلن ہے

ریلوے لائن کی مرمت ہو رہی تھی۔ اس لئے گاڑی دھیمی ہوتی ہوتی آخر رک گئی۔ جہاں ہماری گاڑی رکی تھی وہاں ایسا لگتا تھا جیسے پٹری کے کنارے اگے ہوئے گریا کے پیڑوں کی ڈالیاں پٹری پر جھکی پڑ رہی تھیں۔ میں نے پٹری پر کام کر رہے مزدوروں میں سے ایک کو آواز دے کر کہا کہ وہ گریا کے پیڑ کی ایک ڈالی توڑ کر دے۔

اس نے ایک بڑی ہی خوب صورت لمبی سی ڈالی توڑ کر مجھے پکڑائی تو میں نے وہ ڈالی اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کی طرف بڑھا دی، جو اس وقت اپنے لمبے کھلے بالوں کو گردن کے جھٹکے سے کمر کی طرف پھیلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اب دیکھو ان پتیوں کی خوب صورتی۔

"بہت خوب صورت ہیں۔ بالکل پھول معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان کا رنگ تو ایسا لگتا ہے جیسے سارے کے سارے پتے سونے کے بنے ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے اس لڑکی نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا باندھا اور

ڈالی کی بیتی بنا کر اسے اپنے جوڑے میں سجالیا۔

تبھی گاڑی اپنے سفر پر چل دی۔

میں نے اس لڑکی کے بالوں میں گریا کے پتوں کی بیتی دیکھ کر کہا "اب قدرت کا سارا حسن سمٹ کر گاڑی کے اندر آگیا ہے۔"

اپنے بچوں کو یہ کہانی سناتے ہوئے جب میں بتاتا ہوں کہ ان کی ماں سے میری پہلی ملاقات ایسے ہوئی تھی تو انہیں یقین نہیں آتا۔

یقین آئے بھی تو کیسے۔ گریا کے پیڑ انہیں کہیں دکھائی نہیں دیتے۔

✓

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

سنی سنائی بات

کچھ دنوں کے لئے لندن سے مہمان آئی ہوئی ایک ہندوستانی خاتون سے میں نے پوچھا تھا کہ کیا اسے کوئی ایسا انگریز کبھی ملا ہے جو ۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں رہتا تھا۔

میرا سوال سن کر وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔

پھر اس نے مجھے ایک واقعہ سنایا۔

وہ کہنے لگی :-

آزادی سے پہلے جالندھر میں ایک خونخوار قسم کا انگریز کمشنر ہوا کرتا تھا جس کی صورت سے ہی لوگ بیزار رہا کرتے تھے۔

"جون رائیٹ۔ نابابانا۔ اس کے پاس نہیں جائیں گے۔ بڑے بڑے ہندستانی افسر، سیٹھ، ساہوکار سب اس کے نام سے گھبراتے تھے۔ وہ اپنی عالیشان کوٹھی کے کھلے چوڑے ہرے بھرے لان میں چھتری کے نیچے بیٹھا رہتا۔ اس کے ہات میں کتے کی زنجیر رہتی تھی۔ کتا بھی ایسا کہ اس سے بھی زیادہ ڈراونا۔ اپنے کالے منہ سے لال لال زبان نکالے جب

وہ لمبے لمبے سانس لیتا تو ایسا لگتا جیسے ناگ پھنکاریں مار رہا ہو۔ لال انگاروں کی طرح دہکتی آنکھوں سے وہ چاروں طرف چوکنا ہو کر دیکھتا رہتا۔ اس کے صاحب کے علاوہ بس ایک کشن سنگھ چپراسی ہی تھا جو اس کتے کو سنبھال سکتا تھا اس لیے جہاں جون رائیٹ اور کتا ہوتے، وہاں کشن سنگھ کا ہونا لازمی تھا۔ بس یوں کہہ لیجئے کہ ایک طرف جون رائیٹ کے آس پاس باادب با ملاحظہ ہوشیار کی کیفیت میں دم سادھے بُت بنا کھڑا رہتا۔

جہاں صاحب نے دو چار گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھا ویسے ہی کشن سنگھ ناپ تول کر اتنی وہسکی اور ڈال دیتا۔ اول تو اپنے فرض میں اس سے کبھی کوتاہی نہیں ہوتی تھی اور اگر کبھی بھول چوک ہو بھی جاتی تو صاحب کتے کی زنجیر ذرا سی ڈھیلی کر دیتے اور اپنے پاؤں پر ناگ کے پھنکاروں سی گرم گرم سانسیں پڑتے ہی اسے اپنا فرض یاد آ جاتا۔

اس کتے سے صاحب ایک اور کام بھی لیتے تھے۔ جب کبھی اپنے ملاقاتی پر یہ ظاہر کرنا چاہتے کہ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے یا وہ اس کی مزید بکواس سننے کو تیار نہیں ہیں تو بھی وہ کتے کی زنجیر کو ذرا سا ڈھیلا کر دیتے۔

ٹامی کو نزدیک آتے دیکھ کر ملاقاتی جان بچا کر بھاگنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے تھے۔

یہی جون رائیٹ جب ہندوستان سے جانے لگا تو کشن سنگھ سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے نہ صرف اپنا ٹامی اس کو دے گیا بلکہ اسے اپنا پتہ بھی دے گیا کہ وہ ٹامی کے بارے میں اسے کبھی کبھی خط لکھتا رہے۔

"آپ کا پتہ سرکار ہمارے بڑے کام آئے گا۔ میں کبھی انگلینڈ آیا تو آپ سے ملنے ضرور آؤں گا۔"

"ہاں ہاں ضرور آنا۔" جون رائیٹ نے کہا تھا، اور دل ہی دل میں سوچا تھا یہ کشن سنگھ معمولی چپراسی، یہ بھلا انگلینڈ کیسے آسکتا ہے کبھی نہیں آئیگا یہ۔

لیکن کشن سنگھ واقعی انگلینڈ پہنچ گیا۔ ہوا یہ کہ اس کے دونوں لڑکے جوان ہوئے تو روزی روٹی کی تلاش میں وہ لندن میں جا کر بس گئے۔ پانچ سات برسوں میں ان کے پاؤں بھی

وہاں جم گئے اور چار پیسے بھی جمع ہو گئے تو انہوں نے بوڑھے ماں باپ کو بھی وہاں بلو الیا۔

بوڑھا کشن سنگھ جب انگلینڈ کے ماحول سے اچھی طرح مانوس ہو گیا تو ایک دن بڑھیا سوٹ پہن کر اپنے پرانے صاحب سے ملنے کے لیے پہنچ گیا۔

بڑا ہی معمولی سا گھر تھا، برآمدے میں ایک بوڑھا انگریز معمولی سے کپڑے پہنے اخبار پڑھ رہا تھا۔ کشن سنگھ نے سوچا صاحب کا نوکر ہو گا۔ اس نے قریب جا کر کہا مجھے جون رائیٹ صاحب سے ملنا ہے" اپنا نام سن کر بوڑھے نے سر اٹھایا تو کشن سنگھ کو پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ وہ خود جون رائیٹ تھا۔

کشن سنگھ تم! انگلینڈ کب آیا؟ پھر اس نے کشن سنگھ کی طرف یوں دیکھا جیسے اسے بڑھیا سوٹ میں دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی ہو، اور وہ تسلی کر لینا چاہتا ہو کہ وہ کشن سنگھ ہی ہے یا کوئی اور......

صاحب ہم نے تامی کی قبر پر کراس گاڑ دیا تھا، کشن سنگھ کے پاس کہنے کے لئے کچھ اور تھا بھی نہیں۔

"ویل، ویل بہت اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا۔" کشن سنگھ کو بیٹھنے کے لئے اس نے اب تک نہیں کہا تھا پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا تو وہ ضروری کام سے کمرے کے اندر چلا گیا۔

کشن سنگھ اپنی پرانی عادت کے مطابق زمین پر بیٹھنے ہی والا تھا مگر پھر ہمت کر کے دوسری والی کرسی پر جھجکتے جھجکتے بیٹھ گیا۔

جون باہر آیا تو کشن سنگھ کو اپنی برابر والی کرسی پر بیٹھا دیکھ کر اس کے اندر غصہ عود کر آیا۔ اسی وقت کشن سنگھ کے منہ سے نکل گیا۔ "صاحب آپ وہی اوور کوٹ پہنے ہیں نا جو جالندھر میں پہنا کرتے تھے؟

کشن سنگھ نے یہ بات صاحب سے اپنی پرانی قربت ظاہر کرنے کے لئے کہی تھی۔

"ہاں، ہاں وہی ہے" جون رائیٹ سمجھا جیسے کشن سنگھ نے اسے چڑھانے کے لئے ایسا کہا ہو۔ اس لئے اس کا غصہ اور بھڑک اٹھا۔ وہ سوچنے لگا اگر کشن سنگھ نے انڈیا جا کر میری

موجودہ حالت کا ذکر کیا تو بڑی بھد ہوگی۔

وہ کچھ دیر اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ پھر اٹھ کر برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ ایسے ہی جیسے وہ جالندھر میں خونخوار ٹامی کو ساتھ لیے لان میں ٹہلا کرتا تھا پھر پتہ نہیں کیا سوچ کر اندر گیا اور باہر آتے ہی کشن سنگھ کی کنپٹی پر پستول رکھ دیا، اور غصے میں کانپتا ہوا چلایا۔

بلڈی ام تم کو اس لئے گولی مار رہا ہے کہ انڈیا میں جا کر تم کسی کو یہ نہ بتا سکو کہ ام یہاں اس حال میں رہ رہا ہے۔

کشن سنگھ کے کاٹو تو خون نہیں رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ٹامی کی لال لال دہکتی آنکھیں موت کا پیغام بن کر تھرکنے لگیں۔

''ہم کسی کو نہیں بتائے گا سر۔ ہم کو نہ مارو سر

''نہیں ام تم کو زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔

تبھی جون رائیٹ نے دیکھا کہ کسی نے اس کے ہاتھ کو مروڑ کر اس کے پستول کا رخ اسی کی طرف کر دیا ہے۔

''یہ جالندھر میں تمہاری کوٹھی کا لان نہیں ہے مسٹر جون رائیٹ، جہاں تم اپنے ٹامی کی مدد سے دنیا بھر کے لئے ہوا بنے رہتے تھے'' یہ کشن سنگھ کی بیوی تھی جو اپنی مارکٹنگ کا کام ختم کر کے کشن سنگھ کو واپس لینے کے لئے آئی تھی۔ اس نے اپنے پتی کی جان بچانے کے لئے جون رائیٹ کے پستول والے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ رکھا تھا۔

جب کشن سنگھ اور اس کی بیوی واپس کار میں آکر بیٹھے تو جون رائیٹ اپنے برآمدے کی کرسی پر بیٹھا ہانپ رہا تھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے ان دونوں کو کار میں جاتے دیکھ رہا تھا۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ برآمدے کے کونے میں پڑے اپنے پستول کو اٹھائے جو مرے ہوئے ٹامی کی طرح خاموش پڑا تھا۔

کشن سنگھ کی بیوی کو بھی کار چلانے میں دقت ہو رہی تھی۔ ہاتھا پائی میں چوٹ لگنے کی وجہ سے اس کے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی بڑا درد کر رہی تھی اس میں فریکچر ہو گیا تھا

جو بعد میں پلاسٹر لگانے سے ٹھیک تو ہو گیا لیکن وہ انگلی تھوڑی ٹیڑھی ہو گئی۔

وہ مہمان عورت جب اپنی کہانی کے اختتام پر پہنچی تو مجھے تعجب ہوا کہ اس عورت کو یہ واقعہ اتنی تفصیلات کے ساتھ کیسے یاد ہے؟

تبھی میری نظر اس کے دائیں ہاتھ والے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی کی طرف گئی۔ وہ ٹیڑھی تھی اور اس پر چوٹ کا نشان صاف دکھائی دے رہا تھا۔

✓

حد سے گزر جانے کے بعد

ایک تو اسے اپنے وجود سے بدبو آ رہی ہے۔
اوپر سے اڑوسنوں پڑوسنوں کی کھسر پھسر۔
اسے خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس نے کیوں اپنے جیٹھ کو حد سے گزر جانے دیا جس کی وجہ سے محلے بھر میں اس پر تھو تھو ہو رہی ہے۔
کیا اس کے اندر کوئی کمزوری تھی؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا ہے۔
کوئی دبی دبائی خواہش؟
نہیں۔
کوئی لالچ؟
نہیں۔
تو پھر ایسا کیسے ہو گیا؟
پتہ نہیں کس پڑوسن نے یہ سب دیکھ لیا تھا اور اب وہ سب کی تیکھی نظروں کا

نشانہ بنی ہوئی تھی۔

شکل تو دیکھو منہ پر پھٹکار برس رہی ہے۔"

دیکھنے کو کتنی بھولی لگتی ہے، جیسے منہ میں دانت نہ ہوں۔اور کرتوت؟

جتنے منہ اتنی باتیں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں، کھسر پھسر۔

کسی نے اس سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ سب کی نظریں اس کے جسم پر برچھیوں کی طرح پڑ رہی تھیں۔شاید اسی لئے اس کی کسی سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی اپنے شوہر اور جوان بچوں سے بھی نہیں۔

تب شوہر کام پر گیا ہوا تھا اور بچے بھی گھر پر نہیں تھے اور اسے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کی آواز گلے میں اٹک سی گئی تھی۔پھر اپنے جیٹھ کے ہاتھ دھلاتے ہوئے اس نے من میں سوچا تھا کہ ہاتھ کتنے گندے اور بھدے ہیں۔"

"ہاتھ اچھی طرح دھو لیجئے۔"اس نے لاپرواہی سے ہاتھ دھو کر کرتے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے جیٹھ کو ٹوک دیا تھا۔

ہم کام گاروں کے ہاتھوں پر لگے یہ رنگ روغن کے داغ تو چتا کی آگ ہی دھو سکتی ہے۔"

جیٹھ رنگ روغن سے پتے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھا رہا تھا اور ان داغوں کو دیکھ دیکھ کر اس کے دل میں گھن پیدا ہوتی رہی تھی۔اسی لئے کھانا کھا کر جب اس کا جیٹھ کمر سیدھی کرنے کیلئے زمین پر ہی لیٹ گیا تو اس کے دل میں آئی تھی کہ گندگی کے اس ڈھیر سے پتہ نہیں کب جان چھوٹے گی۔وقت بے وقت یہیں پڑا رہتا ہے اور پھر اس نے خود ہی یہ بھی سوچا تھا کہ آخر بے چارہ جائے کہاں۔نہ گھر،نہ باہر،نہ بیوی نہ بچے۔آخر ہمارے سوا اس کا کوئی اپنا ہے کون؟کوئی بھی تو نہیں۔

اور پھر وہ بھی کھانا کھانے کے بعد دروازہ بھیڑ کر دیوار کی طرف منہ کر کے وہیں لیٹ گئی تھی جہاں اس کا شوہر لیٹا ہوا تھا۔اسکے بعد اسے پتہ نہیں چلا کہ اس کا شوہر کب اٹھ کر

چلا گیا اور وہ خود لیٹی لیٹی جیٹھ کے اتنے قریب چلی گئی یا وہ اس کے قریب آگیا کہ اس کے جسم سے نکلتی رنگ روغن کی ساری بدبو اس کے جسم میں منتقل ہو گئی۔

دو دن ہو گئے۔ ایک تو وہ اپنے تن بدن سے اس بدبو کو چھڑا نہیں پا رہی اور پھر اوپر سے یہ اڑوسنوں پڑوسنوں کی کھا جانے والی نظریں۔

''وہ آخر جائے تو کہاں جائے۔ کرے تو کیا کرے''؟

اور پھر کمرے میں بڑی امس ہو رہی ہے۔

اور کمرے کے باہر؟ وہ جانتی ہے کہ کمرے کے باہر کیا ہے۔ لیکن پھر بھی آخر وہ کب تک اپنے آپ کو کمرے کی چار دیواری کے اندر بند کر کے رکھ سکتی ہے۔ وہ باہر نکلی تو وہی ہوا۔ جس کا اسے ڈر تھا۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر ہی چار پانچ عورتیں اس کے دروازے کی طرف دیکھتی ہوئی کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس سے نکلی تو ان کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اپنے دھیان چلتی ہوئی ڈیوڑھی کو پار کر گئی لیکن پھر بھی اسے لگا جیسے ان پڑوسنوں کی نظریں برچھیاں بن کر اس کی پیٹھ کو چھید رہی ہوں۔ اور وہ لہو لہان ہوتی جا رہی ہو۔ تبھی اس نے اپنے اندر سے بدبو کا بگولا سا اٹھتا ہوا محسوس کیا۔ ان سب حالات کا ملا جلا دراب اس کے لئے برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ اسی وجہ سے اپنا جو قدم اس نے آگے بڑھنے کے لئے اٹھایا تھا اسی سے وہ آگے جانے کی بجائے پچھلی طرف مڑ پڑی۔ وہ عورتیں اب بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس نے بڑی دیدہ دلیری سے سب کی طرف دیکھا اور سینہ تان کر ان کے پاس آکر بولی۔

یہ کیا کھسر پھسر لگا رکھی ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اپنے شوہر کے بھائی کے ساتھ کیا ہے۔ تمہارا تو کچھ نہیں لیا ہے'' یہ کہتے ہوئے وہ غصے سے پاؤں پٹکتی ہوئی ڈیوڑھی کو پار کر کے باہر گلی میں آگئی۔

بی بی جی تھوڑا پانی ملے گا۔ بہت پیاس لگی ہے۔'' گلی سے گزرتا ہوا ایک مزدور قسم کا آدمی اُس سے پانی مانگ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر مزدور کی طرف دیکھا۔ پیاس کے مارے

اس کے ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی تھی۔

"ابھی پلاتی ہوں۔" اس نے کہا اور گھر کی طرف پانی لینے کے لیے مڑی۔ گھڑے سے جگ میں پانی انڈیلتے ہوئے اسے لگا کہ پڑوسنوں کے رویئے کی وجہ سے اس کے ہاتھ ہی نہیں اس کا سارا وجود آگ میں تپ رہا تھا۔ اسی لیے گھڑے کی ٹھنڈک اس کی انگلیوں کی پوروں کے ذریعہ اس کے وجود میں تحلیل ہوئی تو اس کے دل کو کچھ سکون ملنا شروع ہوا۔ ایسا ہوتے ہی اس نے اس بات کی بھی پرواہ نہ کی کہ شام کی چائے کے لیے چینی نہیں بچے گی۔ اس نے جگ بھر کر شربت بنایا اور مزدور کو پلا دیا۔ مزدور کو بھر پیٹ شربت پلاتے ہوئے اسے بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ مزدور غٹ غٹ شربت پی رہا تھا اور وہ ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے اس کی ٹھنڈک کہیں اس کے اندر بھی اترتی جا رہی ہے۔

مزدور کو پانی پلا چکی تو اس کے دِل میں آیا کہ اپنے جیٹھ کیساتھ اس نے آخر کیا کیا ہے۔ یہی نہ کہ اس کی برسوں کی عمر بھر کی پیاس مٹا دی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کا من کچھ ہلکا ہوا۔ خالی جگ اٹھا کر وہ واپس مڑی تو بے دھیانی میں اس کا پاؤں اپنی ہی شلوار کے پائینچے میں اٹک گیا اور وہ لڑکھڑا کر وہاں گر پڑی جہاں گندی نالی کا پانی باہر بہہ نکلنے کی وجہ سے تھوڑا کیچڑ ہو رہا تھا۔ اُسے گرتے ہوئے دیکھ کر ایک بوڑھی عورت اُسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھی اور دوسری عورتوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ارے کوئی کیچڑ میں گر جائے تو اسے اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے کھڑی کھڑی تماشہ دیکھ رہی ہیں۔ کسی سے یہ نہیں ہوتا کہ بے چاری کو اٹھانے میں مدد کرے۔

اُس بوڑھی عورت سے ہمدردی کے دو بول سن کر اُسے ایسے لگا جیسے وہ دو بول اس کے لیے گنگا جل تھے جس نے اُس کے جسم سے لپٹی ہوئی ساری بدبُو دُھو ڈالی ہو۔ اسی لیے محلّے کی عورتوں کے پاس سے گزرتی ہوئی جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تب وہ بڑی ہلکی پھلکی محسوس کر رہی تھی۔ تبھی اپنے جیٹھ کو کمرے کے اندر آتے ہوئے دیکھ کر اس نے جھٹ سے گھونگھٹ نکالا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "جی آپ ڈیوڑھی میں ہی بیٹھا کریں آپ کا کھانا میں وہیں بھجوا دیا کروں گی۔ ☆☆

سپنادر سپنا

گرمیوں کی بھری دوپہر میں جب گڈریے کو یقین ہو گیا کہ اس کی ساری بھیڑیں پیڑوں کے جھنڈ کے نیچے آرام کرنے کے لئے اکٹھی ہو گئی ہیں تو اس نے بھی اپنے انگوچھے سے بندھی ہوئی سوکھی روٹیاں اور اچار نکالا۔ اس نے آہستہ آہستہ چبا کر دو روٹیاں ایسے کھائیں جیسے اپنی بھیڑوں کی طرح جگالی کر رہا ہو۔ پھر پیڑ کی کھوہ میں رکھے مٹی کے گھڑے کو انڈیل کر اوک سے اتنا پانی پیا کہ روٹیوں کے کم ہونے کا احساس جاتا رہا اور پھر روٹیوں والا انگوچھا زمین پر بچھا کر اور پیڑ کی جڑ کا تکیہ بنا کر تھوڑی دیر ستانے کے لیے لیٹ گیا۔

لیٹتے ہی اسے گہری نیند آ گئی اور وہ سپنا دیکھنے لگا۔

سپنے میں کیا دیکھتا ہے کہ وہ ایک برگد کے پیڑ کے تنے پر بیٹھا ہے، اور اس کے نیچے دور دور تک خالی زمین دھوپ میں نہائی لیٹی ہے۔ پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے تنے کے نیچے ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا بہنے لگا۔ یہ دریا کہاں سے آ گیا؟ ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ایک اور عجوبہ ہوا اس کے اوپر سے پیڑ کا ایک ہرا پتہ ٹوٹا اور اس کی نظروں کے سامنے ہوا میں لہراتا ہوا

نیچے گرنے لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ پتہ نیچے گرنے سے پہلے ایک خوبصورت سنہرے رنگ کی لڑکی کے سانچے میں ڈھل گیا اور وہ لڑکی دریا کے کنارے جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ سونے کے رنگ والی وہ لڑکی اپنے جسم پر گہرے ہرے رنگ کا لباس پہنے تھی، جس کی کناری پر چاندی کے رنگ کا گوٹا چمک رہا تھا۔ دریا کے پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھے ہوئے اس لڑکی نے ایک دلفریب مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور اپنی کمر پر جھولتے ہوئے لمبے سنہرے بالوں میں جب اس نے انگلیاں پھیریں تو اسے لگا کہ لڑکی کے بال سونے کے تاروں کے بنے تھے اور ان میں رنگ برنگے ہیرے موتی زیوروں کی طرح جڑے تھے۔

ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ پیڑ سے اتر کر لڑکی کے پاس جائے یا نہ جائے کہ اتنے میں اس نے دیکھا کہ زمین کے جس حصے پر وہ لڑکی بیٹھی ہے، اس میں دراڑ پڑ گئی ہے اور وہ کٹ کر کسی بھی وقت دریا میں گر جائے گا۔ اور ساتھ ہی وہ لڑکی ڈوب کر مر جائے گی۔ اس خطرے کو بھانپتے ہی اس نے تنے سے سیدھے زمین پر چھلانگ لگائی اور جلدی سے لڑکی کو اپنے بانہوں میں بھر کر وہاں سے ہٹا دیا۔ جیسے ہی وہ دونوں وہاں سے ہٹے، زمین کا وہ ٹکڑا دھپ سے گر گیا اور وہاں ایک بڑا ہی خوبصورت پھاٹک نظروں کے سامنے ابھر آیا۔

لڑکی اسے لے کر اس پھاٹک کے اندر داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہاں اطلس کمخواب اور خوبصورت پھولوں سے سجایا ہوا ایک شاہانہ رتھ کھڑا تھا، جس کے آگے دس پانچ کلیانی گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ رتھ کے دونوں طرف دس دس خوبصورت پریاں باندیوں کی طرح ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں اور ان میں سے کچھ ماحول میں عطر کی بوچھار کر رہی تھیں۔ ان دونوں کے رتھ میں بیٹھتے ہی گھوڑے ہوا میں اڑنے لگے اور پلک جھپکتے ہی وہ ایک ایسے محل کے باغ میں اترے جہاں زمین مخملی تھی اور ہوا میں میٹھا سنگیت بھرا ہوا تھا۔ محل میں داخل ہوئے تو اسے لگا کہ محل کیا تھا؟ خوشیوں کی دیواروں کے اندر سکھ مہک رہے۔ تنے اور زندگی چمک رہی تھی۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر دستر خوان کی طرف آئے تو سونے کے رنگ والی لڑکی نے ایک

پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو بہت کھاؤں گی۔ بہت بھوک لگی ہے۔“

لڑکی کے منہ سے بھوک کا لفظ سنتے ہی اس کی بھی جیسے یگوں یگوں کی بھوک جاگ گئی۔ اس نے کچھ یاد کرنا چاہا کہ اس سے پہلے اس نے کھانا کب کھایا تھا۔ اسے کچھ یاد نہ آیا۔ لیکن پھر بھی کچھ دبا دبا سا احساس تھا جیسے اس نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا ہو اور پوری طرح پیٹ بھر کر کھانے کا اسے پہلی مرتبہ موقع مل رہا ہو۔ اس خیال سے اس کی بھوک اور بڑھ گئی اور اس نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد اس پر ایسی غنودگی طاری ہوئی کہ پلنگ پر لیٹتے ہی اسے نیند آگئی اور اس نیند میں اس نے ایک اور سپنا دیکھنا شروع کیا۔

سپنے کے اندر آرہے اس سپنے میں وہ دیکھتا کیا ہے کہ وہ اپنے گھر کے آنگن میں بیٹھا ہے۔ اس کی بوڑھی ماں نے مٹی کی تھالی میں دو روٹیاں، پیاز اور نمک رکھ کر اسے کھانے کے لیے دی ہیں اور ابھی وہ پہلا لقمہ توڑنے ہی جا رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر اندر سے بند دروازے کی کنڈی خود بخود کھل گئی اور وہ سنہرے بالوں والی لڑکی اندر آکر اس کے ساتھ ہی ٹوٹی چارپائی کی پائنیتی پر بیٹھ گئی اور بولی۔ بڑی بھوک لگی ہے۔“

تم تو وہی سپنے والی لڑکی ہو جو مجھے اپنے پھولوں سے سجے رتھ میں بٹھا کر اپنے محل میں لے گئی تھی اور جس کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ کر میں نے کتنے ہی لذیذ پکوان پیٹ بھر کر کھائے تھے۔

”ہاں میں وہی ہوں۔ تم نے مجھے خوب پہچانا۔“

”تم میری یہ روکھی سوکھی روٹی کیسے کھاؤ گی؟“

”تم پیار سے کھلاؤ گے تو مجھے یہ اس سے بھی اچھی لگے گی۔“

اور اس نے اس کے ساتھ مل کر کھانا شروع کیا۔

”مزا آگیا۔“ کھانا ختم کرنے کے بعد وہ بولی۔ ”میرے دستر خوان سے یہ کھانا کہیں زیادہ لذیذ تھا۔ میں چاہتی ہوں کہ ایسا کھانا مجھے روز نصیب ہو۔ اس لیے میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“

وہ لڑکی کی بات کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا اس لیے اس نے سوالیہ نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب صاف ہے میں تمہارے سپنے کی دنیا سے نکل کر تمہاری حقیقی زندگی میں رہنا چاہتی ہوں۔ اجازت دیتے ہو بولو؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا اور پھر کہنے لگا۔ ”ایک تو یہ کہ میں زندگی کے پھول سے تلوؤں کے نیچے کانٹے نہیں بچھانا چاہتا اور دوسرے یہ کہ......“

”دوسرے کیا؟“

”دوسرے یہ کہ میرے سپنوں کی دنیا میری حقیقی زندگی میں آگئی تو میں سپنوں سے محروم ہو جاؤں گا۔ اور سپنوں سے محروم ہو کر میری زندگی اور بھی سونی ہو جائے گی“

”مجھے امید نہیں تھی کہ تم مجھے اس طرح ناکر دو گے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ لڑکی اٹھی اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گھر سے باہر نکل گئی۔

اس نے اٹھ کر اسے روکنا چاہا لیکن اس نے دیکھا کہ اس کے گھر کے باہر دور دور تک سناٹا تھا کہیں کسی کے قدموں کی چاپ نہیں تھی اور اس کی تھالی میں اس کی ماں کی رکھی دونوں روٹیاں ٹھنڈی ہو کر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

اس منزل پر آکر اس کا دوسرا سپنا ٹوٹ گیا اور اس نے خود کو سنہرے بالوں والی لڑکی کے پلنگ پر لیٹا پایا۔

اس نے دیکھا کہ اس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ اس کے پاس سے اٹھ کر دور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اسے آوازیں ہی دیتا رہ گیا لیکن ایک بار جب زندگی روٹھ جائے تو انسان ہاتھ ہی ملتا رہ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ یہی ہوا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سکھوں کی مہک ختم ہو گئی۔ خوشبوں کی دیواریں ہوا میں تحلیل ہو گئیں اور اس کا پہلا سپنا بھی ٹوٹ گیا۔

اسے لگا کہ پیڑ کی جڑ کا سخت سرہانہ اس کے سر میں جہاں گڑ رہا تھا وہاں بڑا درد ہو رہا تھا۔

اس نے جلدی سے اٹھ کر انگوچھا جھاڑا اور گھڑے سے ٹھنڈا پانی پی کر اپنی زندگی میں واپس آنے کی کوشش کی جہاں اس کی بھیڑیں منہ بائے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اس دن شام کو جب اس کی ماں نے دو سوکھی روٹیاں، پیاز اور نمک کے ساتھ مٹی کی تھالی میں پروس کر اس کے سامنے رکھیں تو وہ بہت دیر تک دروازے پر کسی دستک کا انتظار کرتا رہا۔

بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ وہ دن اور آج کا دن۔ وہ جب بھی روٹی کھانے لگتا ہے ایک بار تو اس کی نظریں دروازے کی طرف اٹھتی ہیں اور پھر مایوس ہو کر لوٹ آتی ہیں۔ اکثر وہ کسی برگد کے پیڑ کے تنے پر بیٹھ کر دور دور تک نگاہ دوڑاتا ہے۔ اس کے نیچے پھیلی ہوئی زمین پر کہیں کوئی دریا نہیں ابھرتا۔ دور دور تک زندگی دھوپ میں جھلتی دکھائی دیتی ہے، تو اس کی آنکھوں میں سنہرے بالوں والی لڑکی کو یاد کر کے آنسو تیرنے لگتے ہیں کیونکہ اب وہ اسے کہیں سپنوں میں بھی دکھائی نہیں دیتی۔

✓

حالات کے قیدی

ریٹائر منٹ کے بعد بیوی کی تیر تھ کی خواہش پوری کرنے کے لیے سکسینا صاحب نے اس طرح کا پروگرام بنایا کہ تیر تھ یاترا بھی ہو جائے، ہندوستان بھی گھوم پھر کر دیکھ لیں اور دوست احباب سے بھی ملاقات ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے ویسے بھی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ ان کا ایک بیٹا آسام میں تھا اور ایک بنگلور میں اور ایک ممبئی میں، بڑے بھائی کا بیٹا فوج میں اور اس وقت وہ کشمیر میں تھا۔ یوں کہہ لیجئے کہ ہندوستان کے چاروں کونے بازو پھیلا کر انھیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

روپے پیسے کی بھی کمی نہیں تھی، ریٹائر منٹ کے بعد ملنے والی اکٹھی رقم کا سود تھا اور پھر معقول پینشن۔ اس لیے انھوں نے پروگرام یہ بنایا کہ سب سے پہلے وہ دہلی سے جموں جائیں گے وہاں ویشنو دیوی کے درشن کرنے کے بعد کچھ دن شری نگر میں رہیں گے۔ اگر موقع ملا تو لداخ کی پہاڑیوں کی بھی سیر کر آئیں گے۔ پھر وہیں سے بذریعہ ہوائی جہاز چنڈی گڑھ ہوتے ہوئے دلی اور پھر کلکتہ اور گنگا مہا ساگر گھومتے گھماتے آسام جائیں گے۔ اتنا ہو جائے۔

انھوں نے سوچا۔ پھر آگے کا پروگرام وہیں سے بنالیں گے۔ یہی پروگرام انہوں نے اپنے شری نگر اور آسام والے بیٹوں کو لکھ دیا۔ چٹھیاں ڈاک کے حوالے کر کے وہ بینک گئے اور بیس ہزار روپے بریف کیس میں رکھ کر اپنی کار میں بیٹھ کر انجن میں چابی لگائی ہی تھی کہ انھیں لگا جیسے کوئی انھیں رکنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ اس کی بات سننے کے لیے انھوں نے جیسے ہی بائیں طرف والے دروازے کا شیشہ نیچے کیا ویسے ہی ایک نوجوان دروازہ کھول کر ان کے ساتھ ہی آگے کی سیٹ پر بیٹھ گیا اور پستول دکھا کر بولا ''اگر شور مچاؤ گے تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے' اس لیے گاڑی اسٹارٹ کرو اور جدھر میں کہتا ہوں چلو'' یہ کہتے ہوئے اس نے ان کا بریف کیس بھی دوسرے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ انھوں نے سوچا بیس ہزار روپیہ جاتا ہے تو جائے۔ جان تو بچی رہے گی۔ اسلئے انھوں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

کدھر؟ انھوں نے پوچھا۔

''گریٹر کیلاش کی طرف'' لیکن پہلے اپنا شیشہ پوری طرح اوپر چڑھالو۔ اور یہ یاد رکھو کہ اگر تم نے ذرا بھی آواز نکالی تو پستول کی گولیاں تمہارے سینے میں اتار دوں گا۔

تھوڑا آگے جا کر اس لڑکے نے اپنے ایک اور ساتھی کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھا لیا۔ نئے آنے والے نے پوچھا کِدھر سے آنا ہو رہا ہے۔

''کچھ نہیں۔ بینک گیا تھا۔ کچھ پیسے نکلوانے۔ اتنے میں دیکھا کہ انکل نے بیس ہزار روپے نکلوائے ہیں۔ اس لیے اپّن نے سوچا اب اور پیسے نکلوا کر کیا کرنا ہے اسی سے گزارہ کرلیں گے۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب جا کدھر رہے ہو۔

انکل سے کہا ہے کہ وہ مجھے گریٹر کیلاش ڈراپ کر دیں۔ تم چل رہے ہو نا وہاں تک؟

پہلے انکل سے تو پوچھ لو، کہاں رہتے ہیں۔ کیوں انکل؟

"گل مہر پارک"

کس نمبر میں۔

چودہ سو ایک

اور انکل آپ کے گھر میں کون کون ہے؟

صرف میری بیوی۔

اور کوئی نوکر؟

نہیں۔

کوئی کتا؟

نہیں۔

سچ بتا رہے ہیں کہ:

ارے یار۔ دو دو پستول سر پر لٹک رہے ہوں تو کوئی جھوٹ تھوڑی بولے گا۔ کسی پر وشواش بھی کرنا چاہیئے۔

اچھا بھائی۔ کیا وشواش۔ تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ ہم لوگ گل مہر پارک ہی اتر جاتے ہیں۔ انکل کو اس بڑھاپے میں کیوں پریشان کیا جائے۔

ہاں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔

"آپ کہاں اتریں گے۔" مسٹر سکسینا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

چلیئے۔ آپ کے گھر ہی چلتے ہیں۔ آنٹی ایک کپ چائے تو پلا ہی دیں گی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی ان میں سے ایک نے کہا۔ "آنٹی دروازہ اندر سے بند کر لیجیے۔ آج کل چور اچکوں کا کوئی بھروسہ نہیں کہ گھر میں کب داخل ہو جائیں۔

مسز سکسینہ نے سوالیہ نظروں سے پتی کی طرف دیکھا تو دوسرا لڑکا خود ہی اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ میں نے انکل کو بیس ہزار کی رقم بریف کیس میں رکھتے ہوئے دیکھا تو سوچا۔ زمانہ خراب ہے اتنی بڑی رقم کوئی چھین نہ لے۔ اس لئے ہم انھیں گھر تک

چھوڑنے چلے آئے۔ "یہ کہتے ہوئے اس نے روپیہ والا بریف کیس میز پر رکھ دیا" آنٹی اب آپ یہ کیجیے کہ جو زیور پہنا ہوا ہے، وہ اتار کر اس بریف کیس میں رکھ دیجیے اور لاکر میں جو کچھ رکھا ہے وہ بھی نکال لائیے۔

جس بیچ مسز سکسینہ لاکر کا زیور اور نقدی بریف کیس میں رکھ رہی تھیں اس بیچ دوسرا لڑکا مسٹر سکسینہ کو ساتھ لے کر شو کیس میں رکھی تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے یہ معلومات حاصل کر لی تھیں کہ ان کا ایک لڑکا آئیل انڈیا آسام میں ہے اور دوسرا بنگلور کے کسی دفتر میں۔

"اچھا تو اب چلیں"۔ پہلے لڑکے نے دوسرے سے پوچھا۔

چلتے ہیں یار۔ جلدی کیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ آنٹی نے میز پر کھانا لگا رکھا ہے سوچتا ہوں دو دو روٹیاں کھا ہی لی جائیں۔

خیر اگر انکل اور انٹی ایسا کہتے ہیں تو ہم انھیں مایوس نہیں کریں گے۔

کھانا کھانے کے بعد پہلے والے لڑکے نے بریف کیس اٹھا لیا جس میں زیورات اور پیسہ رکھا تھا اور دوسرا لڑکا کار کی چابی لیتے ہوئے بولا۔

انکل آپ کی کار ہم لے جا رہے ہیں۔ مگر یہ آپکو واپس مل جائے گی۔ اس وقت دو بج رہے ہیں۔ ٹھیک پانچ بجے کار آپ کے دروازے پر ہوگی۔ اور یہ ہم ابھی سے بتا دیں کہ ہمارے جانے کے بعد نہ تو شور مچانے کی کوشش کی جائے اور نہ ہی کار کے واپس آنے تک پولس کو اطلاع دیجیے گا۔ ورنہ یہ تو ہم نے پتہ لگا ہی لیا ہے کہ آپ کے بیٹے کہاں کہاں ہیں۔ بس اتنا یاد رکھیے کہ ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں"۔

یہ کہتے ہوئے وہ دونوں چلے گئے۔ مسٹر اور مسز سکسینہ نے عافیت اسی میں سمجھی کہ پانچ بجے کار کا انتظار کیا جائے۔ ہم تو پریشان ہیں ہی انھوں نے سوچا۔ بچوں کی زندگیوں کو کیوں خطرے میں ڈالا جائے۔ پانچ بجنے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے کہ ان کی کار گیٹ پر آکر

رُکی۔ ان کے پیچھے پولیس کی بھی تین گاڑیاں تھیں۔

مسٹر سکسینہ آپ ہی ہیں؟" پولیس آفیسر نے پوچھا۔

جی ہاں۔

اور یہ کار؟

یہ بھی میری ہے۔

تو پھر آپ کو تفتیش کے لئے میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے دو آتنکوادی دس لوگوں کو جان سے مار کر اسی گاڑی سے فرار ہو رہے تھے۔

مسٹر سکسینہ کہتے ہی رہ گئے کہ آج جب وہ بینک سے پیسہ لے کر باہر آئے تو ان کے ساتھ کیا بیتی۔

آپ لوگ اس گھر میں کتنے آدمی ہیں؟ پولیس آفیسر نے ان کی بات کو بے دھیانی سے سنتے ہوئے پوچھا۔

جی صرف دو ہی۔ میں اور میری بیوی۔

تو پھر آج آپ کے دو اور مہمان کون تھے۔ وہی آتنکوادی۔ ہے نہ" پولیس آفسر غصے سے کھانے کی میز کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں کھانے کی چار جوٹھی پلیٹیں ان کے خلاف گواہی دے رہی تھیں۔

آدھی سے زیادہ رات بیت گئی تھی، جب مسٹر سکسینہ پولیس کے سوالوں کی بوچھار کا سامنا کرنے کے بعد تھکے ہوئے واپس لوٹے۔ ان چند گھنٹوں میں وہ اپنی عمر سے دس سال زیادہ بوڑھے ہو چکے تھے۔

اس سانحے کو ہوئے دو سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اب بھی پولیس یا سی آئی ڈی کا کوئی نہ کوئی آدمی تفتیش کے لیے آتا رہتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے دوبارہ تیرتھ یاترا کا پروگرام نہیں بنایا۔ ایک مرتبہ دبی زبان میں بیوی نے اشارہ کیا تو مسٹر سکسینہ جھنجھلا اٹھے تھے۔

دیکھ نہیں رہی ہو۔ ملک کے چاروں کونوں میں آگ لگی ہوئی ہے...... وہ ایک پل کے لیے رکے۔ بیوی کی طرف ہمدردی بھری نظروں سے دیکھا اور پھر رُک رُک کر بولے۔

تم اپنا اگلا جنم سنوارنے کے لیے تیرتھ یاترا کرنے کی بات سوچ رہی ہو اور یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ ہم ایسے حالات کے قیدی بن گئے ہیں کہ یہ جنم بھی بگڑتا جا رہا ہے۔

✓

عمر کا حسن

دادا نے دادی کے جنم دن پر جو تحفہ دیا تھا اس پر سب کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔
بیٹے، بہوئیں، پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں، دوست احباب سب کے سب دادی کی جوانی کی قد آدم تصویر دیکھ کر خود تصویر بن گئے تھے۔

"ہائے دادی آپ اتنی خوبصورت تھیں۔" بڑی پوتی دادی کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول گئی اور اس کے جھریوں بھرے گال کو ہلکے سے چوم لیا۔

بھئی دادا جی نے تصویر بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

بس جان ہی نہیں ڈالی۔ باقی تو......

اور کیا جان ڈالنی تھی۔ ہمیں تو لگتا ہے۔ دادی کی تصویر اب بولی کہ بولی۔

"ارے یہ کس چھوکری کی تصویر دیکھ رہے ہو تم بڑبڑ" دادی بول پڑی۔

زوردار قہقہوں کی آواز سے کمرا گونج گیا۔ لو اب بات کرو۔ ہم وہاں ہیں جہاں اپنی ہی خبر نہیں ہوتی۔

"ارے دادی یہ تمہاری تصویر ہے۔ تمہاری جوانی کی تصویر"

"ہائے میں مر گئی۔ یہ میں ہوں۔" دادی نے اپنی موتیابند والی داہنی آنکھ کو ذرا سا بند کر کے اور بائیں آنکھ کو کچھ زیادہ ہی کھول کر تصویر کی طرف غور سے دیکھا۔

سب لوگ تصویر کی تعریف کر رہے تھے۔ دادا جی نے وہ تصویر بنائی بھی بڑی محنت سے تھی۔ پچھلے چھ مہینوں سے وہ گھنٹوں ایزل کے پاس کھڑے ہو کر تصویر میں رنگ بھرتے رہتے تھے۔ خوش قسمتی سے انھیں وہ تصویر مل گئی تھی جو دادی کے مایکے والوں نے لڑکی کے پسند کرنے کے لیے بھیجی تھی۔ پتلی دبلی سی، تیکھے نین نقشوں والی لڑکی پہلی ہی نظر میں انھیں بھا گئی تھی۔ بڑی ہی لجائی سی، شرمائی سی کھڑی تھی وہ تصویر میں۔ اسی تصویر کو سامنے رکھ کر انہوں نے قدآدم تصویر بنانے میں دن رات ایک کر دیئے تھے۔ اور اب اس کا نتیجہ ظاہر تھا۔ ہر شخص تصویر کی تعریف کر رہا تھا۔

"دادا جی آپ نے تصویر کو کوئی ٹائیٹل نہیں دیا"۔

"ہاں بھئی۔ کوئی نہ کوئی ٹائیٹل تو ہونا ہی چاہیے۔ اتنی خوبصورت تصویر کا"۔

سب لوگ دادا جی کی طرف دیکھنے لگے۔

"بھئی جو تمہاری دادی کا نام، وہی تصویر کا نام۔ رام دُلاری"۔ دادا جی نے کہا۔

نہیں بھئی۔ یہ بھی کوئی نام ہوا۔ رام دلاری۔ دادی رام کی دلاری تھوڑی ہی ہے۔ وہ آپ کی دلاری ہے۔

"اس اعتبار سے تو اس کا نام ہونا چاہیے مائی بیلوڈ" میں نے رائے دی۔

دادا جی بھی اب کچھ موڈ میں آگئے تھے۔ اگر ایسا ہے تو تصویر کا نام رکھتے ہیں "میری جند۔ میری جان"

سب نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ ہاں تصویر کا یہ عنوان اچھا ہے۔ اور سب مل کر میری جند میری جان" کے بول گاتے ہوئے دادی کے گرد ناچنے لگے۔ آگے آگے دادا جی تھے اور ان کے پیچھے باقی سب لوگ۔ ناچ رہے تھے، گا رہے تھے، چہک رہے تھے اور ان سب کے

بیچ گھری دادی بیٹھی تھی۔

ایسے موقعوں پر عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ دادی خود بھی رنگ رلیوں کا حصہ بن جایا کرتی ہے۔ ابھی تو صرف چار مہینے کی بات ہے کہ سب سے بڑے پوتے کی شادی کے موقعے پر دادی نے اپنے دوپٹے کو اپنے سر پر پگڑی کی طرح باندھ لیا تھا اور دلہا کا سوانگ بھر کر ایک لڑکی کے ساتھ دلہا دلہن کا ناچ ناچا تھا۔ اور گاتی تو وہ اور بھی اچھا ہے۔ پرانی طرز کے لوگ گیت بڑے رس لے لے کر گاتی ہے۔ لیکن اس وقت اپنے پریوار والوں کے ساتھ مل کر ناچنا تو بہت دور رہا۔ اس کے ہاتھ تو تالی کی تھاپ دینے کے لیے بھی نہیں اٹھے تھے۔

اتنے میں ایک پوتے نے دادی کو بھی اپنے ناچ میں شامل کرنے کے لیے دادی کی طرف دیکھا تو اس کی کرسی خالی تھی۔ کسی کو پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ دادی کب ان کے بیچ سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔

یہ پتہ لگتے ہی کہ دادی ان کے بیچ نہیں ہیں۔ ناچنے والوں کے قدم رک گئے۔ باہر لان میں جب سارے انتظام پورے ہو گئے تو سب کا بلاوا آ گیا۔ دادی کو خاص طور سے ڈھونڈا جا رہا تھا۔ وہی تو اس دن کی دلہن تھی۔ کیک تو اسی کو کاٹنا تھا۔

سب دادی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ مگر دادی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ دادا، دادی کے ساتھ ایک عمر گزارنے کے بعد دادی کے مزاج کو اچھی طرح جانتے تھے۔ لیکن وہ بھی یہ اندازہ نہیں لگا پا رہے تھے کہ دادی ان کے بیچ سے اٹھ کر کیوں چلی گئی ہے۔ اور کہاں۔ اس کی تلاش میں جب وہ دادی کے کمرے کی طرف گئے تو انہوں نے دیکھا کہ کمرہ اندر سے بند ہے۔

شاید دادی، پارٹی کے لیے کپڑے بدل رہی ہوں گی۔ اس لیے انھوں نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ اور پھر دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے دادی کو آواز دی۔ ”ارے بھی جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے۔

پانچ چھ مرتبہ پکارنے کے بعد دادی نے دروازہ کھول تو دیا مگر وہ پھر پلنگ پر

جا کر لیٹ گئیں۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے''۔ دادا نے دادی کے ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی۔

دادی نے غصے سے دادا کا ہاتھ جھٹک دیا۔ تب ان کا ماتھا ٹھنکا کہ دادی کسی بات پر ناراض ہے۔

''ارے بھئی۔ میری جان کو کسی نے کیا کہہ دیا''۔ دادا نے خالص ڈرامائی انداز میں انہیں خوش کرنے کی کوشش کی۔

'' آپ کی جان تو وہ لڑکی ہے، جس کی آپ نے تصویر بنائی ہے۔ یہ بوڑھی عورت تو آپ کو کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

''وہ لڑکی آخر ہے تو اسی عورت کا جوان روپ۔ ''اس میں برا ماننے کی کیابات ہے''

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ساری عمر اس سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی سے پیار کرتے رہے اور وہ عورت جو آپ کے بچوں کی ماں بنی، آپ کے پوتوں کی دادی بنی، وہ کبھی دکھائی نہیں دی۔ اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، وہ ایک پل کے لیے رُکی اور پھر بولی۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ہر پل جو نئی عورت میرے اندر پیدا ہوتی رہی، اسے تو آپ نے دیکھا ہی نہیں۔

دادا نے نظر بھر کر دادی کے جھرّیوں بھرے چہرے کی طرف دیکھا۔

جھرّیوں میں لپٹا ہوا ان کا مکمل حسن تہہ در تہہ پرتیں کھولتا ہوا دمک رہا تھا۔

''یہ عورت تو اس جوان لڑکی سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے''۔ ایسا کہتے ہوئے دادا نے آگے بڑھ کر دادی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور لجاتی، شرماتی ہوئی دادی اپنی کمر سے دادا کے ہاتھ کو الگ کرتی ہوئی خوش خوش باہر لان کی طرف چل دی۔

✓

انجان وادی

بخار کی حرارت تیز ہوتے ہی میرا ذہن ایک انجان وادی کی طرف بھٹک گیا۔ جب میں نے اس انجان وادی میں قدم رکھا تو مجھے ایسا لگتا تھا جیسے یہ وادی اسی جگہ سے شروع ہوتی ہو۔ لیکن جیسے ہی میں نے ایک نظر پیچھے کی طرف دیکھا تو وادی کی کوئی حد نظر نہیں آرہی تھی۔ حیران ہو کر میں نے چاروں طرف دیکھا تو ہر طرف افق تا افق وہی وادی پھیلتی چلی گئی تھی، مجھے لگا جیسے میں کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔

"بڑی ہی خوبصوت وادی ہے"۔ میرے دل کی رائے میرے ہونٹوں نے خود بخود ادا کردی۔

اور میں؟ گہرے کالے مگر چمکتے رنگ اور تیکھے نین نقش جاذب نظر آنکھوں والی بڑی ہی خوبصورت حسینہ اپنی دلفریب مسکراہٹ سے مجھے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

""آپ"" میں ایک پل کے لیے رُکا اور پھر کہا""آپ کی موجودگی نے اس وادی کو اور بھی خوبصورت بنادیا ہے""۔

میرا جواب سنکر وہ کھل کر کھلکھلا کر ہنسی تو اس کے موتیوں سے دانت دیکھ کر مجھے لگا جیسے اس کے ہونٹوں سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ "آپ بڑے دلچسپ انسان ہیں مجھے آپ کا جواب بڑا اچھا لگا۔ مجھے ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو اپنے دل کی بات الفاظ میں ادا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔" وہ ایک پل کے لیے رکی۔

آیئے آپ کو اپنی وادی کی سیر کراتی ہوں۔"

میں اس کے ساتھ چل دیا۔

واقعی! بڑی ہی خوبصورت وادی تھی وہ۔ ہم جس طرف گئے۔ اُدھر زمین پر مخملی گھاس بچھی ہوئی تھی۔ ہر طرف ہرے بھرے آسمان کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے پیڑ، پیڑوں کی جھولتی ہوئی ڈالیاں، ڈالیوں پر لہلہاتے پتے دیکھ کر خیال آتا تھا جیسے ہر ارنگ اپنے ہزاروں روپ دکھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ زمین سے اٹھ کر پیڑوں کے گرد لپٹتی ہوئی لتائیں یوں دور تک پہنچ گئی تھیں، جیسے پیڑوں کے انگ انگ کی خوبصورتی کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ نیلا آسمان تو جیسے اس وادی کی خوبصورتی کو دیکھنے کے لیے نیچے جھک آیا تھا۔ اور سورج کی کرنیں اس وادی کی ٹھنڈک سے لطف اندوز ہونے کے لیے پیڑوں کی ڈالیوں سے چھن چھن کر جہاں کہیں زمین پر پہنچ سکیں تھیں، وہاں وہ دھوپ بن کر یوں پسر گئی تھیں جیسے ہزاروں لاکھوں کروڑوں گوریاں لمبے سفر کے بعد تھک کر آڑی ترچھی لیٹی آرام کر رہی ہوں۔

وادی کے چاروں طرف پیڑوں سے ڈھکا ہوا سلسلہ چلا گیا تھا۔ پہاڑ کی طرف دیکھتے تو لگتا تھا کہ ہم وادی کی آخری حد تک پہنچ رہے ہیں، مگر جیسے ہی ہم اس کی تلہٹی تک پہنچتے، وادی حد نظر تک پھیلتی چلی جاتی، پہاڑوں کی گود سے پھوٹتے ہوئے پانی کے جھرنے، ان کی بلندیوں سے گرتے ہوئے پانی کے جھرنے۔ جھرنوں کے پانی سے فضا میں بکھرتی ہوئی پانی کی پھوہار، ساپنوں کی طرح بل کھا کر رینگتے ہوئے ندیاں اور نالے، ان پانیوں میں گرتے ہوئے پہاڑوں کے سائے، ان سایوں کے بیچ میں جکڑی ہوئی آسمان کی تصویر یہ سب دیکھ کر لگتا تھا

جیسے ہم کسی جادو نگری میں پہنچ گئے ہوں۔

''آپ انگور کھانا پسند کریں گے''؟اس حسینہ کے ان الفاظ نے اس جادو کے اثر کو توڑا، تو مجھے احساس ہوا کہ اب ہم وادی کے اس حصے سے گزر رہے تھے۔ جہاں انگوروں کے گچھوں سے لدے ہوئے پیڑ اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ وہ حسینہ ایک پیڑ کے نیچے رک گئی، اور مجھ سے پوچھنے لگی۔ ''بولو کون سا گچھا توڑوں''؟

میں نے کافی اونچائی پر جھولتے ہوئے ایک پکے ہوئے گچھے کی طرف اشارہ کر دیا۔ اسی وقت وہ گچھا ٹوٹ کر اس کے ہاتھوں میں آگرا، اور اس نے اسے میری طرف بڑھا دیا۔

میں دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کہ ایسا کیسے ہو گیا کہ جس گچھے کی چاہ کی وہ خود بخود ٹوٹ کر ہاتھوں میں آ گیا۔ مجھے اس طرح حیران ہوتے دیکھ کر شاید میری توجہ بٹانے کے لئے، اس نے ایک نئی طرف اپنے قدم موڑ دیے۔ اب ہم پھولوں کی گھاٹی میں داخل ہو گئے تھے۔ ہر طرف رنگ برنگے پھول اپنا نظارہ دکھا رہے تھے ایک نظر دوڑانے پر ایسا لگتا تھا جیسے وہاں رنگوں کا میلا لگا ہوا ہو، ہر رنگ، نسل کے پھول ہنستے کھیلتے اس میلے میں آ گئے تھے۔ اور اب ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے وہ اٹھکھیلیاں کر رہے تھے۔ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اپنی خوبصورتی کا ان پر ایسا نشہ طاری تھا کہ جھولتے جھومتے، ناچتے ہوئے ان کے قدموں کی تھرکن کہیں رک نہیں پا رہی تھی۔ ان پر ایسا سرور طاری تھا جس کا نشہ کبھی نہیں ٹوٹتا ابد تا ابد جاری رہتا ہے۔

ہم اس پھولوں کی گھاٹی سے باہر نکلے تو ایک راستہ بڑی خاموشی سے پہاڑ کی چوٹی کی طرف جاتا تھا۔ اس راستے پر قدم بڑھاتے ہوئے اس حسینہ نے مجھ سے پوچھا ''پہاڑ پر چڑھنا پسند کرو گے''؟

''مجھے پہاڑ پر چڑھنا بہت اچھا لگتا ہے''۔ اس نے کہا۔ ''ایک دفعہ ایسے ہی پہاڑ پر چڑھتے ہوئے ایک دیہاتی حسینہ نے مجھے اوک سے چھاچھ پلائی تھی۔ وہ چھاچھ ابھی تک امرت

کی لہریں بن کر میرے اندر دوڑ رہی ہے۔ میرے من میں مٹھاس بھر رہی ہے"۔

"یہ امرت کیا ہوتا ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "کیا امرت چکھ کر لوگ واقعی ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے ہیں؟

امر ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اگر امر ہونے کا مطلب ہمیشہ زندہ رہنے سے لیا جائے، تو کوئی نہ کوئی انسان تو ایسا ہوتا جو پرانے وقتوں سے لیکر آج تک جیتا چلا آتا"۔

"تو پھر آپ کے نزدیک امرت کیا ہے؟"

"میرے خیال میں تو وہ ہر کام امرت ہے، وہ ہر بات امرت ہے، جو دوسرے کے من میں پھولوں کی مہک بن کر ڈھل جائے۔ شہد کی مٹھاس بن کر گھل جائے۔ پانی کی پھوہار بن کر اسے ٹھنڈک پہنچاتی رہے، اور لطیف سے سنگیت کی جھنکار بن کر اس کے من میں ہمیشہ گونجتی رہے۔

پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو وہاں کی فضا اور بھی دلفریب تھی سب سے پہلے میری نظر پہاڑ کی چوٹی پر موجود ایک تالاب پر پڑی۔ میں تو یہی دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ پہاڑ کی چوٹی پر بھی تالاب ہو سکتا ہے۔ اور وہ تالاب تو تھا بھی بڑا خوبصورت۔ لگتا تھا جیسے چوٹی کا وہ حصہ پھول کی طرح کھل اٹھا ہو اور پھر اس کے اندر امرت بھر گیا ہو۔ اس تالاب کے چاروں طرف پھولوں کی لتائیں تھیں۔ ان لتاؤں کا عکس پانی میں پڑ کر اس میں ہزاروں لاکھوں رنگ بھر رہا تھا۔ مجھے ایسے لگا کہ سورج کے کرنوں کے جسم والی وہ گوریاں جن کو میں نے وادی میں داخل ہونے کے تھوڑی دیر بعد پیڑوں کے سائے میں آڑے ترچھے لیٹے آرام کرتے دیکھا تھا۔ وہ جاگ کر تازہ دم ہونے کے لیے اس تالاب میں نہانے کے لئے چلی آئی ہوں۔

وہاں کے جادوئی ماحول کے زیر اثر مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ اس حسینہ کے پاؤں میں کب تھرکن آ گئی تھی۔ یہ تھرکن دیکھتے ہی دیکھتے ناچ میں تبدیل ہو گئی۔ اس کا انگ انگ ناچ رہا تھا۔ اس کے پاؤں کی تھرکن اس کی کمر کی لچک اس کے جسم کی اٹھان پھولوں کی شاخوں کی طرح

بل کھاتی ہوئی اس کی باہیں ان سب کا مجموعی حسن اس کے چہرے کے عکس سے عیاں ہو رہا تھا۔ پل پل خوبصورت سے خوبصورت ہوتے جارہے اس کے حسن کی تاب لانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے دیکھا کہ ناچتے ناچتے اس کے جسم کا رنگ کالے رنگ سے تانبے رنگ کا ہوا پھر تانبے سے چاندی رنگ میں تبدیل ہو گیا، اور پھر چاندی سے سونے کے رنگ میں، تبھی مجھے احساس ہوا کہ اس حسینہ نے اپنے اصلی رنگ کو کالے رنگ کی آڑ میں چھپا رکھا ہے۔ اس کا ناچ جب اپنے عروج پر پہونچا تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ اس کا رنگ کون سا ہے۔ وہ کالے رنگ کی ہے یا تانبے رنگ کی۔ اس کا رنگ چاندی کا ہے یا سونے کا۔ کبھی لگتا وہ ایک ہے۔ کبھی ایسا لگتا جیسے چار رنگوں کی چار حسینائیں ناچتے ناچتے ایک ہو گئی ہیں۔ اس موقعے پر میں نے تالاب کے پانی میں جھانک کر دیکھا تو وہاں طوفان آیا ہوا تھا۔ تالاب کا پانی ہلکورے کھا کھا کر ناچ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ، ناچ رہی تھیں وہ ہزاروں لاکھوں کرنوں کے جسموں والی گوریاں جو اس میں نہانے چلی آئی تھیں۔ تبھی میری نظر ارد گرد کے ماحول کی طرف گئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نہ صرف یہ کہ وہ پہاڑ جھوم رہا تھا جس کی چوٹی پر میں کھڑا تھا بلکہ پوری وادی ناچ رہی تھی جہاں تک نظر جاتی تھی وہاں تک میں نے دیکھا پہاڑ جھوم رہے تھے۔ پیڑ جھوم رہے تھے۔ ندی نالوں کی سرمستی کا تو یہ عالم تھا کہ ان کا پانی کبھی ایک طرف کو لڑھک جاتا۔ کبھی دوسری طرف کو۔ جھومتے جھومتے جھرنوں کا پانی ایک دوسرے میں یوں گڈمڈ ہو رہا تھا جیسے پہاڑی لڑکیاں ناچتے وقت ایک دوسری کے ہاتھ پکڑ لیتی ہیں۔

اب کی میں نے اس کی طرف دیکھا تو پتہ چلا کہ اس کے سونے رنگ کے جسم میں ہزاروں لاکھوں رنگوں والے نگ اور موتی دمک رہے ہیں۔ رنگوں کی اس آمیزش سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے وجود سے رنگ برنگی شعاعیں یوں پھوٹ رہی ہوں جیسے سورج سے کرنیں پھوٹا کرتی ہیں۔

اس طرح اس کا ناچ اپنے عروج کو چھو کر جب آہستہ آہستہ دھیما پڑا اس کے رنگوں کی تھرکن مدھم پڑی اور اس کے پاؤں رُکے تو میرے سامنے وہی کالے رنگ کی حسینہ کھڑی

مسکرا رہی تھی۔

"اب چلیں"؟ میں نے اشارہ کیا۔

وہ ایک بار پھر مسکرائی اور آگے بڑھ کر چلنے کے لئے اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا مجھے ایسے لگا جیسے میرا ہاتھ برف کے گالے پر پڑ گیا ہو۔

جلد ہی ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے میں اس وادی میں داخل ہوا تھا۔

میں نے الوداع لینے کی خواہش سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ مسکرائی۔ "میری وادی میں رہنے کے لئے کب آؤ گے"؟ اس نے پوچھا۔ جب اپنے خاکی وجود کو سونے کے رنگ میں ڈھال کر اس میں موتیوں کی سی چمک دمک پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔

"میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں"۔

وہ ایک دفعہ پھر مسکرائی اور اپنے سونے کے رنگ والے بازو کو لہراتے ہوئے اس نے اشارہ کیا اور بولی۔ "آپ کا راستہ اس طرف سے ہے"۔

بخار کی حدت ختم ہونے کے بعد جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میری بیوی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ کس حسینہ کی خوبصورتی کی اتنی تعریف ہو رہی تھی۔

میں نے اب تک اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا جواب سن کر وہ یقیناً اداس ہو جائے گی۔ اسی لئے میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اس کالی حسینہ کی وادی میں آدمی تو آدمی کوئی پرندیا چڑیا بھی دکھائی نہیں دی تھی۔

✓

دیوار

جس جھگڑے کے ڈر سے بڑی حویلی کے اندر تقسیم کی دیوار کھینچی گئی تھی اس سے فائدہ کچھ نہیں ہوا۔ الٹا یہ ہوا کہ کئی نئے جھگڑے پیدا ہو گئے۔

یوں بڑے چوہدری تقسیم کے حق میں کبھی نہیں تھے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے دونوں بیٹے اپنے اپنے گھر میں چوہدری بننے کا شوق پورا کرنے کے لئے حویلی کے اندر دیوار کھینچنے کے لیے بضد ہیں تو آخر انھوں نے بھی ہار مان لی اور گلی کے باہر بیٹھک میں جا کر یوں رہنے لگے جیسے انھیں حویلی کے جھمیلوں سے کوئی سروکار نہ ہو۔

ادھر حویلی میں یہ ہوا کہ اس کے بیچ دیوار جو کھینچی تو دونوں بھائیوں کی شکایتیں کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئیں۔ اور یہ تو ہونا ہی تھا۔ دیوار کھینچی تو کسی کا کوئی کمرہ چھوٹا ہو گیا تو کسی کا بڑا۔ کسی کو کھڑکیاں دوسرے کے حصے میں چلے جانے کی وجہ سے ہوا کی کمی محسوس ہونے لگی تو دوسرے کے گھر میں اندھیرا اس لئے پھیل گیا کہ روشن دان دوسرے کے طرف رہ گئے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ گھر کی بنیادی ضرورتوں والی جگہیں جیسے رسوئی غسل خانہ، یہ

سب تو ایک ایک ہی تھے۔ اب ایک کے حصے میں رسوئی آئی تو دوسرے کے حصے میں غسل خانہ۔ دونوں کو روزمرہ کی زندگی میں شروع سے ہی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک کو نئی رسوئی بنوانے کے لئے پیسہ چاہیئے تھا تو دوسرے کو نیا غسل خانہ بنوانے کے لیے۔ بات یہیں تک رہ جاتی تب بھی کوئی بات نہیں تھی۔ کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آتا۔ لیکن حویلی کو دو حصوں میں بانٹنے والی دیوار حویلی کے اندر کی تمام چیزوں کو بھی دو حصوں میں بانٹتی ہوئی نکل گئی۔ رضایاں تلائیاں گھر کے برتن کپڑے لتے چرخے، یہاں تک کہ چرخے کی پونیاں رکھنے والی چھوٹی چھوٹی ٹوکریوں میں سے ہوتی ہوئی تقسیم کی دیوار دو دلوں کے بیچ کی دیوار بنتی چلی گئی۔ تقسیم کے اس سلسلے کی اک بات کو لے کر تو لوگ اب تک ہنستے ہیں۔ دادی کی چرخی ایک تھی۔ سوال یہ تھا کہ اسے کیسے بانٹا جائے؟ لحاظہ یہ ہوا کہ چرخی کو توڑا گیا۔ چرخی والا حصہ بڑے پوتے نے لیا اور ہتھی اور تکلے والا حصہ دوسرے پوتے کے حصے میں آیا۔ ایسی صورت میں چرخی چلے تو کیسے؟ زندگی کا سُوت کتے تو کیسے؟

اس لئے جھگڑے تو ہونے ہی تھے۔

تمہارے پلنگ بڑے ہیں، میرے چھوٹے ہیں۔

چھوٹے ہیں تو کیا ہوا۔ ان میں گل کاری کا کام ہے۔ زیادہ قیمتی ہیں۔

تمہاری میز ساگوان کی ہے۔

یہ تو خیر عارضی جھگڑے تھے۔ دو چار دس دن بعد ٹھنڈے پڑ گئے۔ لیکن کچھ مسئلے ایسے بھی تھے جو حل ہونے کی بجائے طول پکڑتے چلے گئے۔ بڑے بھائی کی طرف آنگن میں گلاب کے پھولوں کی بیل کا ایک پرانا پودا تھا، جس کی شاخیں بڑھتی پھیلتی چھوٹے بھائی کے طرف جھک گئی تھیں۔ اب یہ کیسے برداشت کیا جا سکتا تھا کہ پودے کی جڑوں میں پانی تو ایک بھائی دے اور پھول جا کر دوسرے کے گھر میں کھلیں۔ شاخوں کو کاٹ کر دیکھا گیا۔ لیکن گلاب کی شاخوں کی بُری عادت یہ ہے کہ جتنا کاٹو اس سے دگنی چوگنی ہو کر پھیلتی ہیں۔ بھائی کے گھر میں بہار بھی چوگنا ہو کر اتر گئی۔ دوسری طرف خالی تنا ہی تنا تھا جس کو دوسری طرف

گل کھلاتے دیکھ کر بڑے بھائی کے دل میں برچھیاں چبھتی رہتی تھیں۔ اب بے چاری گلاب کی بیل کو یہ تھوڑی پتہ تھا کہ جب دلوں کے بیچ دیوار کھنچ جائے تو دوسری طرف نہیں جایا جاتا۔

پھر ایسے موقعوں پر یہ بھی اکثر ہوتا کہ دوسرے بھائی کے گھر کی طرف سے پرنالے کا پانی دھار بن کر اس طرف گرتا، تو گندے پانی کے چھینٹے تن بدن کو آگ لگا جاتے۔

''تم تو اس کے گھر میں پھولوں کی خوشبو بھیجتے ہو اور وہ......

''وہ جوب میں پرنالے کا گندا پانی پھینکتا ہے، بڑا بھائی جل بھن کر بیوی کے جملے کو پورا کرتا اور پھر کہتا۔ اس کا بھی کچھ علاج کرنا ہوگا۔

تم سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں کہتی ہوں۔ بیل کو جڑ سے کاٹ کر پھینک دو۔

کیسے کاٹ دوں، اس کی جڑیں بڑی گہری ہے۔

تو پھر پرنالہ اکھاڑ کر پھینک دو۔ اس کی جڑیں تو گہری نہیں ہیں۔ وقت بے وقت گندگی تو سر میں آکر نہیں گرے گی۔

پرنالہ نکال دیا تو چھت کا پانی دیوار میں بھرنا شروع ہو جائے گا۔ اگر دیوار ڈھے گئی تو اور مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔

یہ مصیبت تو ساری عمر کے لیے کھڑی ہو گئی ہے' بیوی نے دیور کو چھت پر کھڑے دیکھ کر اسے سناتے ہوئے کہا۔

وہ بھلا کہاں خاموش رہنے والا تھا۔ اپنی بیوی کو آواز دیتے ہوئے بولا۔ یہ پھولوں کی بیل ہمیشہ کا سر درد ہے۔ کلہاڑی دو تو اسے سرے سے کاٹ ہی دوں۔

بیوی تیکھی مرچ ہے۔ آگ میں تیل ڈالتے ہوئے بولی۔ بیل کاٹنے سے بات نہیں بنے گی اس بیل کو پانی ڈالنے والے ہاتھ کاٹنے پڑیں گے۔ تبھی اس سے نجات ملے گی۔

دونوں بھائیوں کے دلوں کی یہ کدورت آہستہ آہستہ ان کے بچوں کے دلوں میں بھی گھر کرنے لگی۔ ایسا نہیں کہ وہ پہلے سے اس سے ناواقف تھے۔ لیکن پھر بھی اب تک

انہوں نے مل کر کھیلنا یا کتابوں کا پیوں کا آپس میں تبادلہ کرنا نہیں چھوڑا تھا۔ اب یہ ہونے لگا کہ کھیل کے میدان میں وہ مل کر کھیلتے ضرور مگر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہنے لگے۔ پہلے انہیں کھیل میں یا پڑھائی میں ایک دوسرے کی مدد کرنے میں جو خوشی حاصل ہوتی تھی وہی خوشی اب انہیں ایک دوسرے کی کھنچائی کا موقعہ ملنے پر ہونے لگی۔ گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے ایک ٹل مار کر جب گلی کو بہت دور پھنک دیتا تو جتنا اسے اپنے اچھے کھیل پر ناز ہوتا اس سے زیادہ اس احساس سے خوشی ہوتی کہ باپ کے دشمن کے بیٹے کو زیادہ پدنا پڑ رہا ہے۔

ان حالات کا دوسروں کا گھر جلا کر تماشہ دیکھنے والوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔

ایک صاحب نے اپنی بے کار پڑی بندوق ایک بھائی کے ہاتھوں بیچ دی۔ ہاں بھائی اپنا سر اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ مارنے والے کی لاٹھی ٹوٹ جائے۔ اس نے بندوق بیچتے وقت یہی سمجھایا تھا۔ ایسا ہونے پر دوسرا ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا۔

لیکن دوسرے نے ایسی ہمت کی کہ پہلے والے کے ہاتھ کے طوطے تو اڑ ہی گئے ہاتھ میں پکڑی بندوق بھی بڑی مشکل سے گرتے گرتے بچی۔

ہوا یہ کہ جب بیوی نے اسے بتایا کہ اب تمہارا بھائی بندوق خرید لایا ہے اور اب ہر روز گھر کی چھت پر بیٹھ کر اور اپنی بندوق کی نالی کا رخ ہمارے گھر کی طرف کر کے اسے گھنٹوں صاف کرتا رہتا ہے تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسی وقت بیوی کے گلے کا ہار اور سر کا چوک پھول اتارا اور اسے بیچ کر نہ صرف بڑھیا قسم کے دو پستول لے آیا بلکہ ساتھ ہی سنڈے بازار سے پرانی فوجی وردی بھی خرید لی اور اسے پہن کر اور کمر کے دائیں بائیں دونوں پستول لگا کر گھر کی چھت پر یوں قواعد کرنے لگا جیسے دشمن ملک پر اپنی قوت کا رعب جمانے کے لیے فوجیں پورے ساز و سامان کے ساتھ گشت کیا کرتی ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ بیوی نے موقعے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے پہلے تو فوجوں کو سٹینڈ ایٹ ایز ہونے کا حکم دیا اور پھر مارچ کرتی ہوئی فوجوں کو چھت کے مورچے سے نیچے اتار کر کمرے کے اندر لے گئی اور شوہر کے پہلے غصّے کا جوش اپنی جان پر جھیل گئی۔

لیکن اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔

وجہ؟

وجہ بتانے کے لیے آپ کو اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ جس گاؤں میں میں پیدا ہوا اور بڑا ہوا تھا وہاں ہمارے پڑوس میں چاچا میلا سنگھ رہا کرتے تھے۔ پوجا پاٹھ کرنے والے اور اہنسا میں ایمان کی حد تک اعتقاد رکھنے والے نامدھاری سکھ تھے۔ ان کو نامدھاری سکھ کہہ کر میں ان کی ذات کے گرد حد بندیوں کی دیوار نہیں کھینچنا چاہتا۔ کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ چہرہ لمبا اور لال سرخ۔ ان کی آنکھوں میں ہر وقت ستارے جھلمل جھلمل کیا کرتے تھے۔ چہرے پر نور دمکتا تھا۔ بولتے تھے تو لگتا تھا کہ ہونٹوں سے امرت جھڑ رہا ہو۔ ان کا قد میں نے اپنے تصور میں ہمیشہ افق کے آخری سرے پر کھڑا کر کے ہی ناپا ہے۔ وہاں ان کے قدم زمین کو چھوتے ہیں اور سر آسمان کی بلندیوں میں دمک رہا ہوتا ہے۔ واقعی اتنا لمبا قد تھا ان کا۔ یہی سردار میلا سنگھ ایک دن میرے سر پر آکے کھڑے ہو گئے۔ میں نے میلے سے ایک دھیلے کا کاغذ کا بنا کالا سانپ خریدا تھا اور اسی سے اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو ڈرا رہا تھا۔

"نہیں بیٹے۔ بچے سانپ سے نہیں کھیلتے" میں نے آواز سن کر سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان کی بلندی پر بھگوان کے دو ہونٹ ہل رہے تھے۔ اور ان ہونٹوں سے نکلتے ہوئے امرت سے بول میرے کانوں میں رس گھول رہے تھے۔

یہ تو کاغذ کا سانپ ہے چاچا جی۔ اصلی تھوڑے ہے۔" میں نے ہمت کر کے کہا تھا۔

"بُری چیز کا تو سایہ بھی بُرا ہوتا ہے۔"

میں نے اسی وقت اس سانپ کو گھر کے کسی اندھیرے کونے میں پھینک دیا تھا۔ پھر بہت دن بعد ایک دن اچانک اس پر نظر پڑی تو میرا دل سردار میلا سنگھ کی کہی ہوئی بات بھول کر اس سانپ کو اٹھانے کیلئے مچل پڑا۔ اس سانپ پر ہاتھ پڑتے ہی میری روح کانپ گئی۔ کاغذ کا سانپ تو کہیں غائب ہو چکا تھا اور اب زندہ سانپ میری انگلیوں کی گرفت میں پھنکارے مار رہا تھا۔

وہ تو کاغذ کا سانپ تھا جو اصلی سانپ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ لیکن ان دونوں بھائیوں

کی بندوق اور پستولیں تو اصلی تھیں۔ ان کو تو ایک نہ ایک دن چلنا ہی تھا۔ چھٹ پٹ جھگڑوں کے علاوہ دو مرتبہ تو ایسی جنگیں ہوئیں کہ دیوار کے دونوں طرف حویلی کی دیواریں لہو کے چھینٹوں سے پٹ گئیں۔ اور زندہ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے دوزخ کے نقشے کھینچ گئے۔ جھگڑے نے ایسا طول پکڑا کہ جائیداد کے بٹوارے کے سیدھے سادھے دیوانی مقدمے کی مسلیں مار دھاڑ، ڈکیتی اور قتل کے کاغذات سے اتنی بھاری ہو گئیں کہ ان کو وکیلوں اور کورٹ کچہری میں لے جاتے لے جاتے دونوں بھائیوں کے کندھے دکھنے لگے۔ خرچ اور قرض کا بوجھ اتنا بڑھا کہ وہ حویلی جس میں تقسیم سے پہلے ہن برستا تھا وہ دو حصوں میں بٹ کر جنے کھنے کی محتاج ہو گئی۔ بچے اپنے اپنے باپ کی موجودگی میں ہی یتیم دکھنے لگے۔ لگتا تھا سوہاگنوں نے شوہروں کے سامنے ہی بیوگی کے جوڑے پہن لئے ہیں۔ ان کی عزت ڈھانکنے والی سفید شفاف چادریں میلی ہو کر پھٹ پھٹا گئیں اور ان کے چھیدوں سے باہر نکل کر روکھے سوکھے اڑتے ہوئے بال بلا بولے ہی ان کی بدحالی کی کہانی کہنے لگے۔ بڑی حویلی کی وہ رسوئی جس کے لذیذ کھانوں کی خوشبو کبھی سارے محلے کو خوش آمدید کہا کرتی تھی اس کے بھائیں بھائیں کرتے خالی برتن شرمندگی کے مارے منہ چھپائے اوندھے پڑے رہتے۔

انہی بیچارگیوں سے تنگ آ کر ایک دن ایک بھائی تیکھی نوک والی گینیتی لے کر گھر کے باہر کی طرف چلا تو بیوی بچے یہ کہتے ہوئے پیچھے بھاگے کہ پاپا غصے میں باہر نہ جاؤ۔ دوسری طرف شور سن کر دوسرا بھائی بھی پھاوڑا لے کر اسی وقت باہر آ گیا۔ دونوں بھائیوں کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں۔ دونوں کے ہاتھ ایک ساتھ اٹھے اور پھر دونوں دھائیں دھائیں کرتے ہوئے بٹوارے والی دیوار کو توڑنے لگے۔

"نفرت کی دیواریں گینیوں اور پھاوڑوں سے نہیں محبت کے اظہار سے ڈھا کرتی ہیں"۔ یہ آواز سردار میلا سنگھ کی آواز تھی جو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ وہ وہیں زمین پر کھڑا ہے اور اس کا لمبا قد افق تا افق آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ اس کے چہرے کا نور روشنی بن کر حویلی کے دونوں طرف کچھ اس طرح بکھر رہا تھا کہ وہ دیوار وہاں موجود ہونے کے باوجود کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ☆☆

ایک تلخ حقیقت

"کچھ دنوں سے ایک گورو گھنٹال جیل میں آیا ہے۔ تمہارے سارے کے سارے شاگرد پیشہ قیدی اسی کے گرد چکر گھنی ہو رہے ہیں۔ اگر ہو سکے تو تم بھی سنتری کو بیڑی پلا کر باہر آؤ اور اس کے درشن کر آؤ۔ آج بھی نہیں آئے گا ہاں آں ..."

مسخرہ قیدی ایک ہی سانس میں سب کہہ گیا اور اپنا معمول کا راگ الاپنے لگا۔

ہولاں بھن تے گنے چوپ

لمّی تان تے مسکا مار

قید میں سکھ سے رہ میرے یار۔

ہولاں بھن تے گنے چوپ"

ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے قتل کے الزام کا وہ قیدی من ہی من سوچ ہی رہا تھا کہ پتہ نہیں کیا بات ہے کہ پچھلے آٹھ دس روز سے شاگرد پیشہ قیدیوں میں سے کوئی بھی اس سے چاقو مارنے کا گر سیکھنے کیوں نہیں آیا۔ اور اب مسخرہ قیدی ایک نئی بات سنا گیا۔ چلو خس کم

جہاں پاک۔ جان چھوٹی سالوں سے۔ ورنہ دھوپ ابھی اس کی کوٹھری کی سیڑھیوں کے بہت پیچھے ہوتی تھی اور وہ آدھمکتے تھے۔ اس وقت دھوپ سیڑھیاں چڑھ کر جنگلے پر کتنی اونچی چلی گئی تھی اور برآمدے کے باہر کب کی سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھی تھی اور اب تک کسی کی صورت دکھائی نہیں دی تھی۔

ویسے ان کا آنا اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ شروع شروع میں تو اسے الجھن بھی ہوتی تھی۔ غصہ بھی آتا تھا۔ من میں آتا تھا کہ دوں سالوں کو زور کا ہاتھ۔ بڑے آئے چاقو مار بننے۔ لیکن جس کے ہاتھ اور پاؤں جکڑے ہوئے ہوں اس کا ایسا سوچنا فضول تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ ان کے آنے سے اس کی تنہائی بھی کم ہوتی تھی۔ ورنہ جیل کی کال کوٹھری کا سناٹا تو موت کے سناٹے سے بھی زیادہ بھیانک ہوتا ہے۔

اس نے سوچا۔ شاید کوئی اس سے بھی بڑا قاتل ہوگا جسے یہ آپنے مسخرے پن میں گورو گھنٹال کہہ رہا ہے۔ تم تو ہر بات کو مذاق میں لے لیتے ہو۔ سچ مچ بتاؤ اس نے کتنے قتل کیے ہیں؟"

اس نے مسخرے قیدی سے پوچھا۔

ارے بھئی نیتا کہیں قتل کرتا ہے۔ وہ تو کرواتا ہے۔ سنا ہے اس کی کسی حرکت سے ملک میں دنگے فسادوں کی باڑھ آگئی تھی۔ ہزاروں مارے گئے لاکھوں اجڑے اور کروڑوں کا مال اسباب لٹ گیا۔

"تو وہ اس جرم میں جیل میں آیا ہے۔"

"جرم" مسخرہ ہنسا۔ تم تو لگتا ہے۔ واقعی گنے چوستے رہتے ہو۔ ارے بھائی۔ نیتا لوگوں کی کسی حرکت کی وجہ سے ایسا کچھ ہو جائے تو اسے جرم نہیں کہتے۔ یہ تو ان کے ارتھوں میں سماج سیوا کہلاتی ہے۔ سماج سیوا۔ کچھ سمجھے۔ قتل تو ہما شما کے جرم کو مانا جاتا ہے۔

ہولاں بھن تے گنے چوپ
لمی تان نے مسکا مار

قید میں سکھ سے رہ میرے یار

ہولاں بھن تے گنے چوپ

مسخرہ قیدی اپنا نعرہ بلند کرتا ہوا واپس لوٹ گیا تو اسکی آواز بہت دیر تک اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔ اس کے نعرے کے بول اور لفظ اس کے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے۔ ہولاں بھن تے گورو گھنتاں۔ جرم۔ نیتا کا جرم، گنے چوپ، جرم نہیں ہوتا۔ سماج سیوا لمی تان، قید میں ہولاں بھن، سماج سیوا کر۔ قید میں سکھ سے رہ میرے یار"

اس کے پاؤں کی بیڑیاں پنڈلیوں میں گڑھنے لگیں۔ بڑے زور کا درد اٹھا اور سانپ کی طرح بل کھاتا اس کے رگ و ریشے میں پھنکارے مارنے لگا۔

یہ مسخرہ بھی عجیب قسم کا آدمی ہے۔ ایسے ہی بے پر کی اڑائے رہتا ہے۔" اس نے سوچا ضرور۔ لیکن اس کے دل میں دھک دھکی لگی رہی۔ چل کے دیکھنا چاہئے لیکن اس کا من نہیں ہوا۔

دراصل ادھر کچھ دنوں سے اس پر اداسی چھائی ہوئی ہے۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ جب اسے یاد آتا ہے کہ کسی بھی دن فیصلہ سنایا جانے والا ہے اس کے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ کیا پھانسی کی سزا ہوگی اور زندگی ہمیشہ کے لئے اندھیرے میں ڈوب جائے گی۔ • کیا عمر قید ہوگی۔ اور ایک لمبی مدت تک اس کال کوٹھری کی چاروں دیواریں اس کی حیات کو بچھوؤں کی طرح ڈستی رہیں گی۔ کیا چھوٹ جاؤں گا اور..... اور.....وہ کچھ سوچ نہیں پایا اور پھر ایک بھیانک فکر۔ ایک جانا پہچانا سا ڈر پھر اس کے دل میں درد کی رو بن کر دوڑ گیا۔ کیا وہ اپنے ماتھے سے کیے ہوئے قتل کا داغ مٹا سکے گا؟ وہ جدھر بھی جائے گا لوگ کہیں گے وہ جا رہا ہے قاتل۔ اس سے تو یہ جیل ہی اچھی ہے اسے کسی کے سامنے شرمندہ تو نہیں ہونا پڑتا۔ بس میں ہوں اور یہ چار دیواریں اور وہ مسخرا اور جیل کے دوسرے قیدی۔ سب اس جیسے۔ کوئی چور، کوئی اچکا کوئی اٹھائی گیر، سب کالے منہ والے۔ کوئی کسی کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔

وہ اداس ہو گیا۔ اپنے ہی خیالات کے دھارے میں ڈوبے ہوئے اس نے دیکھا کہ

ایک مکوڑا تیز تیز چلتا ہوا باہر سے اندر کی طرف آرہا تھا۔ لیکن جیسے ہی اس کال کوٹھری کے لوہے کے پھاٹک کے پاس آیا تو وہ ٹھٹھکا جیسے اس نے کال کوٹھری کے اندر کے خطرے کو سونگھ لیا ہو۔ پھر اس نے اپنی اگلی ٹانگیں کھڑی کیں منہ گھمایا اور پھر جتنی تیزی سے وہ آرہا تھا اس سے دگنی تیزی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس لوٹ گیا۔

سب ڈرتے ہیں اس کال کوٹھری کے اندر آنے سے۔ تبھی اس نے دیکھا کہ ایک چڑیا پھدکتی ہوئی آئی اور جنگلے کے اوپر وہاں بیٹھ گئی جہاں دھوپ آکر بیٹھی تھی۔

"آ میری چڑیا۔" اس نے چڑیا سے دل بہلانے کی کوشش کی۔ پھر اس نے سوچا اگر یہ چڑیا میری کوٹھری کے اندر آکر باہر کی طرف گئی تو وہ چھوٹ جائے گا اور اگر یہ چڑیا جنگلے سے باہر کی طرف اڑ گئی تو اسے سزا ہو جائے گی۔

چڑیا نے گردن گھمائی۔ ایک دو مرتبہ اس نے اندر کی طرف دیکھا اس سے نظریں ملائیں اور پھر پنکھ پھڑپھڑاتی باہر کی طرف اڑ گئی۔

مجھے سزا ہو جائے گی۔" یہ سوچ کر وہ اداس ہو گیا۔

اچھا ہے ہو جائے۔ باہر تو وہی لعنت اور ملامت ہے اپنی عزت بچانے کے لئے ایک قتل کیا ہو گیا۔ میرے ماتھے پر جیسے کالا داغ لگ گیا ہو۔ آم کو کالا داغ لگ جائے اس نے سوچا تو اندر سے گل سڑ جاتا ہے اس نے اپنے آپ کو سونگھ کر دیکھا بدبو تھی پتہ نہیں پسینے کی، جسم کی میل کی یا کون جانے اندر سے گل سڑ رہے وجود کی۔

نہیں وہ اندر سے گلا سڑا نہیں۔ اس کا من تو کہہ رہا ہے کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ اب اگر کوئی جان لینے پر ہی تل جائے تو کیا مجھے اپنی جان بچانے کا بھی حق نہیں ہے یہ سوچ کر اسے اپنے اندر کچھ طاقت سی ملی۔ جینے کی طاقت، ہر حال میں جینے کا حوصلہ۔

ویسے جیل نے اسے جینے کا حوصلہ دیا تھا۔ ورنہ باہر کی دنیا نے تو اسے مار ہی ڈالا تھا اس نے سوچا۔ جیل کے اندر اور باہر کی دنیا کتنی مختلف ہے جیل کے اندر کی قدریں اور اور جیل کے باہر کی قدریں ایک دوسری سے بالکل الگ۔

جیل کے باہر تو دنیا اسے ایسے دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی خونخوار شیر یا چیتا ہو۔ شیر اور چیتا جو نزدیک پھٹکنے پر پھاڑ کر کھا جاتا ہے اسے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ پیشی کے موقع پر وہ کچہری کے برآمدے میں بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا تو ایک ننھا سا بچہ اسے دیکھ کر چیخیں مار مار کر رونے لگا اور اسے چپ کرانے کے لئے اس کی ماں اسے وہاں سے دور لے گئی۔ کتنی شرم آئی تھی اس وقت اسے اپنے آپ سے۔ بچے کیا؟ بڑے کون سے اس کی طرف ہمدردی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ دیکھتا تھا۔ سب کی نظروں میں اس کے لئے لعنت ہے، ملامت ہے، نفرت ہے، اس کا خیال تھا کہ کوئی سزا ہونے سے پہلے ہی دنیا والوں کی نظریں اسے ڈس لیں گی۔ کھا جائیں گی وہ تو غنیمت ہوئی کہ جیل کے ماحول نے اسے جینے کا حوصلہ دیا۔ یہ اور بات ہے کہ ادھر آٹھ دس روز سے کوئی نہیں آیا ورنہ اس کے جیل میں آتے ہی شاگرد پیشہ قسم کے قیدیوں کے دلوں پر اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔

"بڑا ہی جی دار مرد ہے"

"مرد ہو تو ایسا۔ اکیلے نہتے نے مارنے کے لئے آنے والوں کے سینے انھی کے چاقو سے چیر کر رکھ دے۔

گورو ایک آدھ ہاتھ ہمیں بھی سکھا دو تو قسم خدا کی جس نے میری بیڑیوں میں بٹے ڈالے ہیں میں ان کے سارے جہاز ڈبو کر رکھ دوں گا۔

"بیٹھ بے لکڑ بگھے کی اولاد۔" "کیا پدی کیا شوربہ پہلے اپنی اوقات تو دیکھ۔ بڑا آیا استاد سے چاقو مارنے کا گر سیکھنے۔ اس کے لئے تو استاد سا لوہے کا شریر بھی چاہئے۔ کوئی دوسرا ٹوکتا۔

شریر واقعی اس کا لوہے کا بنا ہوا تھا۔ بیڑیوں میں جکڑا ہوا جب وہ ٹانگیں چوڑی کر کے شاگرد پیشہ قیدیوں کے بیچ چلتا تو لگتا تھا جیسے کوئی سورما چل رہا ہو۔ جیسے وہ ان سب کا سرتاج ہو۔ اس احساس نے اسے جینے کا حوصلہ دیا تھا۔

مسخرے قیدی کی آواز پھر سے دور سے آتی سنائی دی۔

ہولاں بھن تے گنے چوپ

لمبی تان تے مسکا مار

قید میں سکھ سے رہ میرے یار

ہولاں بھن تے گنے چوپ"

اس مسخرے کو میرے بارے میں کوئی سن گن تو نہیں مل گئی۔ آج یہ دسری بار ادھر آرہا ہے "اس کے دل میں ڈر سا پیدا ہوا۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

یہ تو ایسے ہی بک بک کرتا رہتا ہے۔ ہر وقت"

اس نے دیکھا مکوڑا بھر لوہے کے پھاٹک کے پاس آیا اور وہیں سے پہلے کی طرح واپس مڑ گیا۔

چڑیا پھر پھدکتی ہوئی آئی۔ جنگلے کی سلاخ پر بیٹھی اس نے امید بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ گردن گھماتی ہوئی پھر باہر کی طرف اڑ گئی۔

برآمدے کے باہر کسی کا سایہ ابھرا اور لمبا ہوتا چلا گیا پھر بھاری بوٹوں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ دوسرے ہی لمحے جیل سپرنٹنڈنٹ خود اس کے سامنے کھڑا تھا۔

تمہیں عمر قید کی سزا ہوئی ہے لیکن تم اس کے خلاف اپیل کر سکتے ہو۔" اس نے یہ الفاظ یوں ادا کئے جیسے وہ یہ خبر اسے نہیں اس کی کوٹھری کی دیواروں کو سنا رہا ہو۔ جیل کی دیواروں کو کہہ رہا ہو تمہیں عمر قید دی جاتی ہے تم اس وقت تک جیل میں رہو گی، جب تک گر نہیں جاتیں... پھر بھی ہماری ہمدردی تمہارے ساتھ ہے۔

"آپ کیا کر سکتے ہیں سرکار۔ میری قسمت ہی خراب ہے یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں زمین کی طرف گر گئیں۔ جب تک وہ اوپر سر اٹھا کر دیکھے تب تک جیل سپرنٹنڈنٹ واپس جا چکا تھا۔

ہولاں بھن تے گنے چوپ

لمبی تان تے مسکا مار

قید میں سکھ سے رہ میرے یار

ہولاں بھن۔تے گنے چوپ

مسخرا قیدی اپنی مستی کا راگ الاپتا ہوا پھر اس کی کوٹھری کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ گردن گرانے سے نہیں، من اٹھانے سے، من کو تگڑا کرنے سے یہ بات بنے گی، یہ عمر قید ہے۔ عمر قید، اس طرح گھبرانے سے تو یہ بہت لمبی ہو جائے گی اور اگر جگرا کرو گے تو آنکھ جھپکتے میں بیت جائے گی، حوصلہ کرو، حوصلہ کرو۔

جیل کے باہر سے جے جے کار کی آوزایں آرہی تھیں۔

"یہ کس کی جے جے کار ہو رہی ہے" اس نے اپنا دھیان بٹانے کے لئے مسخرے قیدی سے پوچھا۔

وہی نیتا چھوٹ کر جارہا ہے۔ اسی کی جے جے کار ہے۔ ہولاں بھن تے گنے چوپ۔ ہزاروں آدمیوں کو مروانے والا تو چھوٹ کر جارہا ہے اس کی جے جے کار ہو رہی ہے اور ایک دو آدمیوں کے قاتل کو عمر قید۔ ہولاں بھن تے گنے چوپ۔

مسخرا قیدی اپنی دھن میں نہ جانے کیا کیا بکے جارہا تھا اور وہ خود عمر قید کاٹنے کے لئے اپنے من کو تگڑا کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن لوہے کی سلاخوں پر اس کی پکڑ کمزور ہو رہی تھی۔

بیسویں صدی کا صدر بازار

بازار میں بک تو سب کچھ رہا تھا، اور وہ خریدنا بھی بہت کچھ چاہتا تھا لیکن جب بھی وہ کسی چیز پر انگلی دھرتا، یا نظر ٹکاتا تو اسے پتہ چلتا کہ اس چیز کے دام بھاری ہیں اور اس کی جیب ہلکی۔ ایسا شروع سے ہو رہا تھا۔ یعنی جب سے اس نے اس بازار میں قدم رکھا تھا۔

سب سے پہلے بازار میں داخل ہوتے ہی اسے ایک لڑکی پسند آئی تھی۔ لڑکی کیا تھی۔ اسے لگا تھا جیسے وہ اس کی اپنی جند جان کا حصہ ہو۔ جیسے اس کے بغیر اس کا وجود ادھورا ہو۔ اسی لئے ہوا یہ تھا کہ جب اس نے پہلی نظر سے لڑکی کو دیکھا تو اسے محسوس ہوا جیسے لڑکی کا جسم خوشبو میں تحلیل ہو کر آنکھوں کے ذریعے اس کے وجود میں اترتا چلا گیا ہو اور سر سے لے کر پیروں تک اس کے انگ انگ میں اس کے رگ و ریشے میں اس کے خون کے کن کن میں اس طرح رچ بس گیا ہو کہ اب اسے اس سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ جب سے اس نے اس لڑکی کو دیکھا تھا، اس پر وجد کی سی کیفیت طاری تھی۔ اسے لگا تھا جیسے وہ ایک بہتا ہوا دریا ہے۔ دوسری طرف سے ایک اور ندی آئی اور دونوں کی لہریں یکجا ہو کر قل قل کرتی ملن

کا گیت گاتی چل دی ہوں۔ اسے لگا تھا جیسے دو مختلف سازوں کی دھنیں ایک دوسری میں گڈمڈ ہو کر میٹھی سی سورلہری میں تبدیل ہو گئی ہوں، جیسے دو مختلف ہوائیں ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک دوسری سے ملیں اور ملن کی خوشی میں سرگم خود بخود بج اٹھا ہو۔

جب وہ اپنی تصور کی دنیا سے واپس آپنے آپ میں آیا تو اس نے بڑی اپنائیت سے لڑکی کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ لڑکی نے اسکے ساتھ چلنے کے لئے پہلا قدم اٹھانے کے بجائے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ لاکر سامنے والی دوکان کی طرف دیکھا جہاں خوبصورت کپڑے اور قیمتی زیور بک رہے تھے۔ مطلب صاف تھا کہ پہلے وہ اس کے لئے وہ زیور اور ملبوسات خرید کر لائے اس کے بعد وہ اس کے ساتھ چلے گی۔

وہ بڑے بھاری قدموں سے زیورات کی دوکان کی طرف بڑھا۔ وہاں جا کر اس نے پایا کہ ان کی قیمت ان کی چکاچوند سے بھی کئی گنا زیادہ تھی۔ اور اس کی جیب ان کی قیمت سے کئی گنا ہلکی۔ وہاں سے قدم بڑھاتے ہوئے اس نے بڑی حسرت سے ایک نظر اس لڑکی کی طرف دیکھا، ایک نظر ان زیوروں کی طرف اور پھر آگے بڑھ گیا۔

یوں آگے بڑھنے کی اس کی ہمت نہیں تھی۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ذرا سا آگے بڑھا تو اسے ایک ایسی دوکان نظر آئی جس میں کوئی سامان نہیں تھا صرف ایک خوبصورت سی میز بچھی تھی اور کرسی پر ایک شخص اپنے سامنے کچھ کاغذات لے کر بیٹھا تھا۔ اسے تعجب ہوا کہ یہ شخص بھلا کیا بیچتا ہوگا۔ دوکاندار نے اسے پرکشش نظروں سے دیکھا اور وہ اپنے دل میں تجسس اور امید لئے اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ دوکاندار نے اس کے سامنے ایک سے ایک خوبصورت مکانوں کے نقشے پھیلا دئے۔ یہ سب مکان تیار ہیں۔ آپ چاہیں تو ابھی اسی وقت ان کا قبضہ دیا جا سکتا ہے۔ اسے ان میں سے ایک مکان پسند بھی آ گیا۔ اس کے سامنے چھوٹا سا باغیچہ تھا اور پیچھے چھوٹا سا تالاب اور تھوڑی سی زمین سبزی اگانے کے لئے۔ مکان چاروں طرف سے کھلا اور ہوادار بھی تھا۔ اسے وہ مکان اتنا پسند آیا، اتنا پسند آیا کہ اس نے تصور کی دنیا میں داخل ہو کر اس لڑکی کے ساتھ وہاں زندگی بھی گذارنی شروع کر

دی۔ وہ اپنے گھر کے سامنے باغیچے میں بیوی کے ساتھ بیٹھا ہے، ان دونوں کے اوپر ایک خوش نما چھتری جھول رہی ہے۔ وہ کوئی اخبار پڑھ رہا ہے۔ بیوی اپنے لمبے بال سکھاتی ہوئی بچی کی سویٹر بن رہی ہے، اور بچی پھولوں کی کیاریوں کے اوپر اڑتی ہوئی تتلیوں کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ اچانک اس نے دیکھا کہ اس کی بچی ان کے باغیچہ میں لگے پہلے گلاب کے پھول کو توڑنے جا رہی ہے۔ اس نے وہیں سے بیٹھے بچی کو پھول توڑنے سے منع کرنا چاہا۔

''نہیں'' اس کے منہ سے نکلا۔

نہ ناں کیجئے صاحب دوکاندار بولا۔ بہت اچھا مکان ہے۔ ایسا مکان تو کسی خوش قسمت کو ہی ملتا ہے۔ وہ اپنی تصور کی دنیا سے واپس حقیقی دنیا میں آ گیا۔ دوکاندار کے سامنے بیٹھے بیٹھے اس نے نہ صرف یہ محسوس کیا کہ اس کی جیب ہلکی ہے، بلکہ یہ کہ اس دنیا کے بازار میں اس کا وجود ہی دوسروں کے مقابلے میں بہت ہلکا ہو گیا ہے۔ بہت چھوٹا پڑ گیا ہے۔ اسے اپنے اس طرح چھوٹے ہونے، اپنی ہی نظروں میں گر جانے کے احساس سے دل ہی دل میں بڑی ندامت سی محسوس ہوئی۔ اور وہ دوکاندار کے روکتے روکتے، وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

آگے بھی بازار اسی طرح پرکشش تھا۔ پلنگ اور بیٹھنے اٹھنے کے ساز و سامان پر ایسی ایسی گلکاری کہ کہیں نظر نہیں ٹھہرتی تھی، خوبصورت سے خوبصورت ترین برتن، لذیذ سے لذیذ تر کھانے پینے کی اشیا، گھر کی سجاوٹ کی چیزیں، وہ ان سب کے بیچ سے افسردہ سا من مسوستا ہوا ایسے گزر رہا تھا جیسے وہ خاردار جھاڑیوں کے بیچ سے نہیں بلکہ کانٹوں کے اوپر چل رہا ہو۔ ہر تمنا کے جاگتے ہی اس کا وجود لہولہان ہو رہا تھا۔ اس کی کیفیت میٹھے اور صاف و شفاف پانی کے دریا میں سے گذرتے ہوئے اس شخص کی سی تھی جس کی قسمت میں اس امرت کی ایک بھی بوند نہیں تھی۔

اس لئے وہ آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے محسوس کیا جیسے بازار کا آخری سرا آ گیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اس نے صرف چاہا ہی تھا کہ بازار کا آخری سرا آ جائے اور اسے

واپس لوٹنے کا بہانہ مل جائے۔ بازار ختم ہوا تھا یا نہیں اس کے بارے میں وہ پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ وہ بازار کے ختم ہونے کا احساس لئے واپس لوٹنے ہی جارہا تھا کہ ایک چھوٹی سی دوکان کے مالک کی نظروں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"لے لیجئے صاحب، بس ایک ہی بچا ہے۔ سستا دے دوں گا"

"سستے" کے لفظ نے اس میں کچھ اعتماد سا پیدا کیا۔ اسے لگا جیسے وہ بھی کچھ خریدنے کی قوت رکھتا ہے۔

دوکاندار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہا تھا۔

"اس چاقو کے بلیڈ بٹن سے کھلتے ہیں"۔ یہ دیکھئے اس نے بٹن دبایا۔

بلیڈ کھلتے ہوئے چمکا تو اس کی آنکھوں کے سامنے بجلیاں کوند گئیں۔ "اور یہ اپنے آپ بند نہیں ہوتا۔ بٹن دبانے پر ہی بند ہوگا۔ جب آپ چاہیں گے تب"۔ یہ کہتے ہوئے دوکاندار نے چاقو میں لگے چار بلیڈ اور ایک چھوٹا سا ئیزہ باری باری کھول کر دکھائے اور پھر چاقو بند کر کے اس کی طرف بڑھا دیا۔

اور پھر یہ ہوا کہ خوبصورت کپڑے پہنے، قیمتی زیورات سے لدی پھندی اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ جب وہ اپنے نئے گھر میں داخل ہوا تو اس کا ہر گوشہ بازار کی ایک سے ایک خوبصورت چیزوں سے آراستہ تھا۔

✓

روپ متی کی گپھائیں

میں ان جنگلوں میں روپ متی کی ان گپھاؤں کو دیکھنے نکلا ہوں جن کا راستہ اس علاقے کے رہنے والے آدی باسی بھی نہیں بتا سکے۔ میں نے جب بھی کسی سے راستہ پوچھا ہے تو وہ میرا سوال سن کر پہلے تو ناخوش ہو گیا ہے، پھر مسکرا دیا ہے اور اس کے بعد اداس ہو گیا ہے، اور مجھ سے کہا ہے آپ کسی بڑے بوڑھے سے پوچھئے۔ شاید بتا دے“

کسی بڑے بوڑھے سے پوچھا تو اپنے جھریوں بھرے چہرے پر کمزور بینائی والی آنکھوں کو میرے چہرے پر گڑھا کر اس نے کہا۔

”بابو ہم بھی ساری عمر روپ متی کی گپھائیں تلاش کرتے رہے ہیں۔ ہماری پیڑھی کے سبھی لوگ چاہتے تھے کہ وہ گپھائیں مل جائیں تو شاید دنت کتھا سچی ہو جائے۔ لیکن ہم کو تو کہیں ملی نہیں“۔ یہ کہتے ہوئے وہ دور افق کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے اگر وہ گپھائیں اسے آسمان کی بلندی پر مل جائیں تو وہ انہیں سورج کی کرنوں پر سوار کر کے زمین پر اتار لائے۔

”وہ دنت کتھا کیا ہے بابا۔“میں نے پوچھا۔

پتہ نہیں کیا ہے ؟ اور کیا نہیں ہے " ؟ بوڑھے نے جیسے اکتا کر کہا۔ پھر بولا۔ اگر ہے تو بہت کچھ ہے، کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ روپ متی کی گپھائیں مل جائیں تو وہاں کا سارا روپ ہماری زندگیوں میں اتر آئے۔ ہمارے مکان خوبصورت ہو جائیں ہر چیز افراط میں ملے۔ کہتے ہیں سب کے گھروں میں کام دھیو گائے ہوگی۔ دودھ گھی کی نہریں ہوں گی۔ جو چاہیں گے وہ ملے گا۔ " یہ کہتے کہتے وہ امیدوں کی دنیا سے نکل پھر مایوسی کی مورتی بن گیا اور بولا آج کی طرح تھوڑی ہوگا کہ لوگ باگ پیٹ پر رسی باندھ کر سوتے ہیں تاکہ بھوک نہ ستائے۔"

وہ ایک پل کے لئے پھر رکا اور بولا "لیکن روپ متی کی گپھائیں کہیں دکھائی تو دیں۔ ہم تو ڈھونڈتے ڈھونڈتے بوڑھے ہوگئے۔ اس سے پہلے ہمارے پرکھے، اس سے پہلے پرکھوں کے پرکھے۔ پتہ نہیں کتنے ہزار سال بیت گئے۔ اس بیچ ہماری زندگی پیڑوں سے گرے ہوئے پتوں کی طرح سوکھ گئی۔" بوڑھا پھر اداس ہو گیا تھا۔

"وہ دیکھو۔ اسنے اپنی نوجوان لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ پندرہ سال کی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ۔ میں اس کے چہرے پر جوانی کے آثار ؟ لگتا ہے جیسے جوانی، جوانی میں ہی بوڑھی ہو گئی ہو اور اس کی جو حالت ہے وہ صرف اس کی نہیں، ان کی ساری پیڑھی کی ہے۔ بس یوں سمجھو کہ دور دور تک اندھیرا ہے۔ اور اس اندھیرے میں ہمارے قد اتنے چھوٹے ہو گئے ہیں کہ......

میں نے کہا۔ میں اس علاقے میں بالکل نیا ہوں۔ کوئی میرے ساتھ راستہ بتانے والا ہو جاتا تو اچھا تھا۔

"منزل کا پتہ ہو تو کوئی راستہ بھی بتائے۔ ویسے ساتھ لے جانے کے لئے تم اسی لڑکی کو لے جاؤ۔ اسی بہانے چار پیسے مزدوری کے کمائے گی۔ ویسے اسے بھی تو کسی نہ کسی دن روپ متی کی گپھاؤں کی تلاش میں نکلنا ہی ہے۔ چلو اس کا یہ سفر آج سے ہی شروع ہو جائے گا"

"آپ نہیں چلیں گے ہمارے ساتھ"؟ میں نے پوچھا۔

میں اب بوڑھا ہو گیا۔ جنگلوں میں بھٹکنے کے اب میرے دن نہیں۔ ویسے ہم بوڑھے بھی گھروں میں بیٹھے بیٹھے روپ متی کو تلاش کرتے رہتے ہیں۔"

میں بوڑھے سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے روپ متی کی گپھاؤں کو کیسے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن بوڑھے کی لڑکی تیار ہو کر آگئی تھی، اس لیے ہم چل دیے۔

گھر سے باہر نکل کر لڑکی نے کوئلہ لے کر دروازے کے سامنے کچھ آڑی ترچھی لکیریں کھنچیں۔ دو چار لکیروں کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ ایک عورت کی تصویر کا خاکہ بن گیا ہے۔ ناک، منہ، نین نقش سب کچھ۔ اب اس نے اس تصویر کے چاروں طرف چار لکیریں کھینچیں اور پھر ترنم میں بولی۔

روپ متی کی مورتی
کرنی اچھا پورتی
اپنی گپھا سے باہر آ
ہم کو اپنا درس دکھا
جائیں، آئیں، تم کو پائیں
بول روپ متی کدھر کو آئیں

یہ بولتے ہوئے اسنے چار چھوٹے چھوٹے تنکے اٹھا کر مورتی کے چاروں طرف رکھ دیے۔

ذرا سی دیر میں ایک تنکا ہلا تو وہ بولی۔ بس ادھر کا تنکا ہلا ہے۔ روپ متی نے ہمیں اس طرف آنے کا آدیش دیا ہے۔

ہم اسی طرف کو چل دیے۔

روپ متی کی گپھاؤں کے بارے میں ذہن میں بہت سے سوال تھے۔ یہ گپھائیں کب بنیں، کیسے بنیں، کس نے بنائیں، ان سب کے بارے میں اس لڑکی نے مجھے ایک

دنت کتھا سنائی۔

ایک تھی روپ متی اور ایک تھا اس کا وہ''

''وہ کون''۔ میں نے بات کو سمجھتے ہوئے بھی اس سے سوال کر دیا۔

''اس کا وہ یعنی اس کا پریمی''

''اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا کوئی وہ ہے''۔ میں نے بات میں ذرا رنگینی پیدا کرنی چاہی۔

''روپ متی کی بات کرتے کرتے اپنے ''وہ'' کی بات نہیں کی جاتی۔ پاپ لگتا ہے۔

''کیا پاپ لگتا ہے؟''

''پھر اپنا وہ بھی کہیں اس طرح گم ہو جاتا ہے جیسے روپ متی کا وہ گم ہو گیا تھا۔''

''وہ کیسے ہوا تھا؟''

پوری بات سنو گے تو خود ہی پتہ چل جائے گا۔ بیچ بیچ میں بتانے لگوں گی۔ تو میں سب بھول جاؤں گی۔ اور جب روپ متی کی کہانی بھول جائے تو پھر لوگ راستہ بھی بھول جاتے ہیں۔ اگر ایک مرتبہ ایسا ہو گیا تو پھر ساری عمر اس جنگل میں بھٹکتے رہ جاؤ گے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے پھر سے روپ متی کی کہانی شروع کر دی۔

''ایک تھی روپ متی اور ایک تھا اس کا وہ۔

''وہ کا نام کیا تھا۔'' میں نے پوچھا۔

وہ کا نام اپنے اپنے علاقے میں اپنا اپنا ہے۔ لوگ اسے جس بھی نام سے چاہے، پکار لیتے ہیں۔

''ہاں تو روپ متی اور وہ بالی عمر سے ہی ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھیلتے تھے، مٹی کے گھر بناتے تھے، گڈے اور گڑیا کے کھیل کھیلتے تھے جب وہ بڑے ہوئے تو میری طرح کلہاڑی اور رسی لے کر ایک ساتھ جنگل میں لکڑی کاٹنے جایا کرتے تھے۔'' اس نے اپنے کندھے پر لٹکی رسی اور اس کے ساتھ بندھی کلہاڑی کی

طرف اشارہ کیا۔

لیکن وہ جو روپ متی کا وہ تھا اسے لکڑی کاٹنا پسند نہیں تھا۔ لگتا تھا جیسے مجبوری میں جاتا ہے، اس لئے جاتا ہے۔ وہ تو زمین پر، پیڑوں کے تنوں پر، اور پتھروں پر طرح طرح کی لکیریں کھینچتا رہتا تھا۔ وہ لکیریں کھینچتا اور دیکھتے ہی دیکھتے تصویر بن جاتی۔

''ارے اٹھ''۔ روپ متی کہتی۔ اپنے لئے لکڑی کاٹ مجھ سے نہیں کاٹی جاتیں تمہارے لئے لکڑیاں روز روز۔ بے کار لکیریں کھینچتا رہتا ہے۔ جدھر دیکھو ادھر لکیریں۔

''دیکھ میں تیری تصویر بنا دوں گا۔ یہاں۔ پیڑ کے اس تنے پر اور پھر جب یہ بہت بڑا ہو گا تو اس کے ساتھ تیری تصویر بھی بڑی ہو جائے گی'' وہ کہتا۔

''مجھے نہیں بنوانی اپنی تصویر''۔ روپ متی کہتی۔ تو اٹھ اپنے لئے لکڑیاں کاٹ۔

''دیکھ روپ متی۔ میں پیڑوں پر کلہاڑی مارتا ہوں تو مجھے درد ہونے لگتا ہے''

جب بازو ہلاؤ گے ہی نہیں تو ایک دن کلہاڑی چلانے پر بازو درد تو کریں گے ہی۔'' روز روز کلہاڑی چلاؤ گے تو محنت کے عادی ہو جاؤ گے۔ پھر بازو درد نہیں کریں گے۔''

''ارے نہیں ری۔ میں بازوں کے درد کی بات نہیں کر رہا۔ دل کے درد کی بات کر رہا ہوں۔ میں جب پیڑ پر کلہاڑی مارتا ہوں تو لگتا ہے جیسے کسی زندہ انسان کو مار رہا ہوں۔

ارے یہ کیوں نہیں کہتا کہ تمہیں آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے سے فرصت نہیں ملتی۔

''ہاں یہ بات بھی صحیح ہے۔ سچی بات تو یہ ہے۔ میرا دل کرتا ہے کہ ساری دھرتی کو سارے آسمان کو اپنی ان تصویروں سے بھر دوں''۔

''اور اتنی ساری تصویریں تم بناؤ گے کس کی؟

''صرف تمہاری۔''

''دیا رے دیا'' میری اتنی ساری تصویروں کا تو کیا کرے گا۔

''سب کو اپنے دل میں بھر لوں گا''

اس نے یہ بات کہہ دی تھی۔ روپ متی نے اس کی بات سن لی تھی۔

لیکن ان دونوں کو یہ نہیں پتہ تھا کہ وہ ایک دوسرے سے پیار کرنے لگے ہیں۔ ایسا پیار کہ جب دو جنے نہیں رہتے۔ انجانے میں ہی وہ مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ ایسے جیسے پانی کی دو لہریں آپس میں مل کر ایک ہو گئی ہوں۔

ان کے لئے یہ سب بس موہوم سی چاہت کا احساس تھا۔

پھر ان کو اس بات کا کب پتہ چلا کہ وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ میں نے سوال کیا۔

سوال نہ کرو بابو۔ اگر میں کہانی بھول گئی تو ہم دونوں اسی جنگل میں بھٹکتے رہ جائیں گے۔

''ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ ایک دن ایسے ہی وہ دونوں ایک پتھر کی چٹان پر بیٹھے تھے۔ وہ پتھر پر روپ متی کی تصویر بنا رہا تھا اور روپ متی اسے تصویر بناتے ہوئے غور سے دیکھ رہی تھی کہ آسمان میں ایک چیخ سی گونج گئی۔ دونوں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ایک باز نے جھپٹا مار کر ایک چڑیا کو پکڑ لیا تھا اور وہ اس کے نکیلے پنجوں میں جکڑی لہولہان ہوئی سٹپٹائی چیخ رہی تھی۔

''یہ اچھا شگن نہیں ہے'' روپ متی کا دل اندر سے کانپ گیا اور وہ ڈر کے مارے اس سے چمٹ گئی۔

''بچے اس طرح ڈرا کرتے ہیں۔ اس نے اسے دھیرج بندھاتے ہوئے اس کی پیٹھ کو سہلایا۔

روپ متی کو دھیرج دیتے ہوئے اچانک اسے محسوس ہوا تھا کہ ایک میٹھی سی نرمی ہے جو خوشبو بن کر اس کے جسم میں کہیں اتر گئی ہے۔ اسے لگا تھا جیسے روپ متی کا سارا جسم خوشبو بن کر اس کے دل کی گہرائیوں میں جا کر بیٹھ گیا ہو۔

یہاں تک کہ جب روپ متی اس سے الگ ہوئی تب بھی اسے لگا کہ روپ متی تو اس

کے اندر ہی بیٹھی ہے اور اب اس کے سامنے کوئی اور لڑکی کھڑی ہے۔

بڑا خوبصورت تھا یہ احساس۔

اگلے دن اس احساس کو آنکھوں میں بھر کر اس نے روپ متی کی تصویر بنائی تو روپ متی کبھی اپنی تصویر کو دیکھے اور کبھی اپنے آپ کو، اور کبھی اپنے اس کو۔

اس نے شرم کے مارے وہاں سے بھاگ جانا چاہا۔ وہ بھاگتی چلی گئی، لیکن اس کے اس نے یہ محسوس کیا جیسے روپ متی اس سے دور نہیں بلکہ اس کے قریب آتی جا رہی ہے۔

پھر یہ کہانی یہاں تک پہنچ کر اندھیرے میں بھٹک گئی۔

کیا ہوا تھا۔

ایک تھا باز بہادر۔ وہ ایک دن نہ جانے کہاں سے آیا اور گاؤں والوں کے دیکھتے دیکھتے روپ متی کو اپنے گھوڑے پر اڑا کر لے گیا۔

اڑا کر لے گیا۔

ہاں۔ باز بہادر جنگل کے پتھر پر بنی اس کی تصویر کو دیکھ کر ہی اس پر موہت ہو گیا تھا۔ اور جب اسے گوشت پوست کی روپ متی دکھائی دے گئی تو موقع پا کر وہ اسے اڑا لے گیا۔

پھر کیا ہوا۔

ہوا کیا تھا۔ پہلے تو روپ متی کا "وہ" باز بہادر کے گھر تک گیا لیکن وہ گھر نہیں بلکہ ایسی حویلی تھی جس کی دیواریں بہت مضبوط اور بہت اونچی تھیں۔ جب وہ انہیں پھاند نہ سکا تو پھر کسی کو پتہ نہیں کہ اسے جنگل کھا گیا کہ پہاڑ کھا گئے کہ ہوا نگل گئی۔

اور روپ متی کا کیا ہوا۔

لوگ بتاتے ہیں کہ باز بہادر نے روپ متی کو بہت دکھ دیئے۔ اس نے اسے مارا، پیٹا، ڈرایا، دھمکایا لیکن اس نے باز بہادر کی بننے سے انکار کر دیا۔ یہ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ روپ متی مری نہیں زندہ ہے۔ ہمارے گھروں میں جب دکھ تکلیف کے موقع پر کوئی روتا ہے تو کئی کہتے ہیں اس کے رونے میں روپ متی کے رونے کی آواز بھی شامل ہو جاتی ہے۔

یہاں تک کہ شادی بیاہ جیسے خوشی کے موقع پر جب شہنائیاں بجتی ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ شہنائی کی آوازوں میں بھی روپ متی کا درد شامل ہو جاتا ہے۔

پھر روپ متی کے ''وہ'' کا کچھ پتہ چلا۔

لوگ کہتے ہیں کہ وہ اب بھی روپ متی کی گپھا کے اندر رہتا ہے اور اس کی دیواروں پر روپ متی کی تصویریں بنا رہا ہے۔

کیسی ہیں وہ تصویریں۔ دیکھی ہیں کسی نے وہ۔

کبھی دیکھی ہوں گی کسی نے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان گپھاؤں میں صرف روپ متی کی ہی نہیں بلکہ اس دور کی پوری زندگی کی تصویریں بنی ہیں۔

پالنے میں ہنستی روپ متی

ماں کی گود میں روپ متی

گھٹنوں چلتی روپ متی

گڑیوں کا کھیل کھیلتی روپ متی جنگل میں پھولوں کی بیلوں کے ساتھ کھڑی روپ متی۔

اور نہ جانے اس کے کتنے روپ اور پھر اس کے ساتھ اس زمانے کے لوگ۔ کہتے ہیں کئی تصویریں ایسی بھی ہیں کہ جیسے روپ متی ہیرے موتیوں کے زیور پہنے کام دھینو نام کی گائے کا دودھ دھو رہی ہے۔ دودھ دوہتے دوہتے وہ اپنے اس کی یاد میں کھو گئی اور دودھ بالٹی سے باہر نکل کر زمین پر بہہ نکلا اور پھر سارے علاقے میں اس دودھ کی نہر بہہ نکلی۔

اس کا مطلب ہے وہ باز بہادر بڑا امیر تھا۔

باز بہادر نہیں۔ یہ اس کے بچپن کی اپنے باپ کے گھر کی تصویر ہے۔ تب آدی باسی بڑے امیر ہوتے تھے۔ بڑے بڑے گھروں میں رہتے تھے۔ اور سب کے گھروں میں ایک ایک اپنی کام دھینو گائے ہوا کرتی تھی۔

پھر یہ اتنی غریبی کیسے چاروں طرف پھیل گئی کہ پیڑ کی شاخیں تو کیا تنے تک

سوکھ گئے۔

ارے بابو جب کوئی باز بہادر زندگی سے روپ متی کو چھین کر لے جاتا ہے تو پھر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیل جاتا ہے۔

اب تک ہم بہت تھک گئے تھے۔ اس لئے سوچا کہ کہیں تھوڑا بہت ستا لیں۔ بھوک بھی بڑی لگ رہی تھی۔

کھانا کھا کر ہم دونوں تھکے ہونے کی وجہ سے گہری نیند سو گئے۔ میں ابھی سو ہی رہا تھا اور سپنے میں بھی روپ متی کی گپھاؤں میں بھٹک رہا تھا کہ اس آدی باسی لڑکی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

"کیا ہوا"۔ میں نے سوچا، جیسے میں ابھی سپنا ہی دیکھ رہا ہوں اور روپ متی نے مجھے جگا دیا ہو۔

آنکھیں ملنے پر احساس ہوا کہ یہ وہی آدی باسی لڑکی تھی اور کہہ رہی تھی کہ دیکھو کسی نے اس چٹان پر میری تصویر بنا دی ہے۔

میں نے اٹھ کر پہلے تصویر کی طرف دیکھا اور پھر اس آدی باسی لڑکی کی طرف۔

"ہاں تصویر تو واقعی ہو بہو تمہاری ہی ہے" ارے اس کے نیچے تو کچھ لکھا بھی ہے۔

کیا لکھا ہے بابو۔ پڑھ کر سناؤ۔ مجھے تو پڑھنا نہیں آتا۔

میں نے جو لکھا تھا وہ پڑھ کر سنایا۔

روپ متی جیئے ہے اب بھی

اور جیتا ہے اس کا وہ

ساکشات دیکھو گے ان کو

اپنے اندر جھانکو تو

اس لکھے ہوئے کو سن کر وہ آدی باسی لڑکی سوچ میں ڈوب گئی اور پھر اپنی سوچ سے ابھر کر بولی تو اس کا مطلب ہے کہ روپ متی کی گپھائیں ہمارے دل میں ہیں۔

وہ سوئی سوئی جیسے جاگ سی گئی اور پھر یہ ہوا کہ مریل اور کمزور سی لڑکی جو اس کے باپ کے لفظوں میں جوانی میں ہی بوڑھی ہو گئی تھی، اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ اس کے چہرے پر زندگی کے ایسے رنگ بکھر رہے تھے جیسے اس کو سچ مچ روپ متی کی گپھائیں مل گئی ہوں۔ اور اس نے جاگتی آنکھوں سے ایک سپنا دیکھنا شروع کر دیا کہ اس کا ایک بڑا سا گھر ہے۔ گھر کے دروازے پر کام دھینو گائے بندھی ہے، وہ اس کا دودھ دوہ رہی ہے، اور بالٹی بھرنے کے بعد دودھ زمین پر بہتا دودھ کی ندی بن گیا ہے۔ دودھ کی ندی جو سارے علاقے میں دوڑ رہی ہے۔

وہ آدی باسی لڑکی اب ساری دنیا کو بتانا چاہتی ہے کہ اسے روپ متی کی گپھائیں مل گئی ہیں۔ اسی لئے وہ اپنی بستی کی طرف اتنی تیزی سے بھاگ جا رہی ہے۔ کہ میرے لئے اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا دشوار ہو رہا ہے۔

✓

"پچھلے جنم کی بات"

اب کی دہلی میں میری تصویروں کی نمائش لگی تو پہلے دن ہی ایک بوڑھی عورت نے ایک تصویر خریدلی۔ قیمت کے پانچ ہزار روپے بھی ادا کر دیئے اور میری یہ شرط بھی مان ہ گئی کہ وہ اسے نمائش کے آخری دن آکر لے جائے گی۔

میرے جیسے نوجوان آرٹسٹ کے لئے یہ بڑا ہی نیک شگون تھا۔

اس کے بعد وہ روز ہی میری نمائش دیکھنے کے لئے آتی رہی۔ ایک مرتبہ دیکھی ہوئی تصویروں کو بار بار دیکھتی۔ مجھے اکیلا پاکر میرے ساتھ تصویروں کے رنگوں کی آمیزش اوراس سے پیدا ہونے والے اثرات پر بھی بات کرتی۔ یہاں تک کہ پمفلٹ میں چھپے میری زندگی کے مختصر سے حالات پڑھنے کے بعد اس نے یہ بھی جاننا چاہا کہ بچپن میں کون سے ایسے حالات تھے جنھوں نے مجھے ایک پینٹر کا مزاج بخشا۔ گھر میں کون کون تھا کس کس نے اور کیسے میرے ذہن کو متاثر کیا۔

روز کے اس معمول سے فرصت پا کر وہ زیادہ دیر تک اسی تصویر کو دیکھتی رہتی جو

اس نے خریدی تھی۔ ایسا روز ہی ہوتا رہا۔

نمائش کے آخری دن وہ آئی تو چائے پیتے ہوئے اس نے خواہش ظاہر کی "کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آج شام آپ بھی میرے ساتھ گھر چلیں تاکہ مجھے مشورہ دے سکیں کہ اس تصویر کو کمرے میں کس جگہ رکھا جائے۔ میرا مطلب ہے۔ تصویر پر روشنی کتنی پڑے، کس زاویے سے پڑے کہ پہلی نظر میں ہی دیکھنے والے پر اسکا سارا حسن اجاگر ہو جائے۔

یہ بات اس نے اتنے پیار سے اور میٹھے انداز میں کہی کہ میں انکار نہ کر سکا۔ ویسے بھی میں نے سوچا کہ حوصلہ افزائی کرنے والے لوگوں سے بنا کر رکھوں گا۔ تو اور بھی تصویریں بکنے کا امکان بنا رہے گا۔

مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس نے نوکرانی سے چائے بنانے کے لئے کہا اور خود کپڑے بدلنے چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس نے اپنا جوڑا کھول دیا تھا اور اس کے چاندی کی طرح سفید کھلے بال کولہوں سے بھی نیچے جا رہے تھے۔

میرے ساتھ بیٹھتے وقت چائے بنانے والی کیتلی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے سر کو جھٹکا اور پیٹھ پر بکھرے ہوئے سارے بال داہنے کندھے پر جھولتے ہوئے اس کے گھٹنوں پر آرہے۔ کندھے سے جھولتے ہوئے سفید بال دیکھتے ہوئے ایسے لگتا تھا جیسے اس نے پتلی مہین چاندی کے تاروں کا شال کندھے پر ڈال لیا ہو۔

ان چاندی کے بالوں سے گھرے ہوئے میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو محسوس کیا کہ بالوں کو کھلا چھوڑ دینے سے اس کی شخصیت میں چار چاند لگ گئے تھے۔ اب اس کا چہرہ لمبوترا نہیں بلکہ بیضوی لگتا تھا اور بالوں نے اس کے گالوں کے جھریوں والے حصے کو بھی چھپا لیا تھا۔ اب وہ ساٹھ سال کی بڑھیا کے بجائے ادھیڑ عمر کی ایسی عورت لگ رہی تھی جس کے چہرے پر ابھی بڑھاپے نے اپنی چھاپ چھوڑنی شروع نہ کی ہو۔

"آپ تو اس عمر میں بھی بے حد خوبصورت ہیں"۔ یہ جملہ میرے ہونٹوں میں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو روکتے ہوئے میں نے چائے کے گرم گرم

پیالے کو اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔

چائے پینے کے بعد وہ مجھے اپنے بیڈروم میں لے گئی جہاں وہ اس تصویر کو ٹانگنا چاہتی تھی۔ مجھے اس نے ایک دیوار سے لگی آرام کرسی پر بٹھایااور خود سامنے والی دیوار کے بیچ و بیچ میری بنائی ہوئی تصویر کو رکھ دیا۔ اس میز کے ساتھ ہی قدآدم آئینہ ٹنگا ہوا تھا۔ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اسنے شیشے کے عین اوپر والی چھوٹی ٹیوب لائیٹ کو روشن کر دیا اور خود سر کے بالوں کو جھٹکا دے کر بالوں کو آگے کی طرف لے جاکر شیشے کے سامنے ذرا سا جھکی تو شیشے میں اس کے چہرے کے عکس کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

شیشے میں جھلکتی اس کی تصویر میری تصویر والی لڑکی سے بالکل ملتی جلتی تھی۔

میری تصویر میں ایک لڑکی جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں اپنے عکس کو دیکھ رہی ہے۔ اور اس کے عکس پر چاند کا عکس اس طرح آکر ٹھہر گیا ہے کہ عکس اصلی چہرے سے زیادہ روشن دکھائی پڑتا ہے۔

اس وقت قد آدم شیشے میں بالکل وہی عکس تھا۔ وہی نین نقش، وہی جھلملاتی آنکھیں۔ وہی لمبے بال جو جھیل میں بہت دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔

"میری تصویر تو آپ کی شکل سے بالکل ملتی جلتی ہے۔

"ملتی جلتی نہیں۔ آپ نے میری ہی تصویر بنائی ہے۔ میری جوانی کی تصویر۔ اس نے شیشے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے، میں تو آپ کی جوانی کے وقت پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ میں ایک لمحے کیلئے رکا۔ وہ میری طرف دیکھتی ہوئی مسکراتی جارہی تھی۔

"میں آپ کی تصویر کیسے بنا سکتا ہوں میں نے تو آپ کو اس سے پہلے دیکھا ہی نہیں کبھی"

"یہ ٹھیک ہے کہ تم نے مجھے نہیں دیکھا۔ مگر پھر بھی دیکھا ہے۔ کچھ یاد کرو اور بتاؤ کہ تم نے یہ تصویر کیسے بنائی؟ کس لڑکی کو سامنے رکھ کر بنائی۔"

''کسی کو بھی نہیں۔ غالباً یہ تصویر میرے لاشعور میں ایک عرصے سے بسی ہوئی تھی۔ میرا ذہن تصور ہی تصور میں کسی لڑکی کے نین نقش بناتا رہا اور جب وہ تصویر میرے ذہن میں پوری طرح واضح ہو گئی۔ تو میں نے اسے اپنے کینوس پر اتار دیا۔ اسی لئے میں حیران ہوں کہ میری تصویر کی آپ کی شکل سے اتنی مشابہت کیوں ہے۔''

''ٹھہرو میں بتاتی ہوں۔ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی اور شیلف سے اپنی جوانی کی تصویر اٹھالائی۔ اس تصویر کو دیکھ کر تو میں کرسی پر بیٹھا بیٹھا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں نے اس تصویر کو سامنے رکھ کر اس کی نقل تیار کی ہے۔

وہ میری طرف دیکھتی ہوئی مسکرائے جا رہی تھی۔

دونوں تصویریں ہو، بہو، ایک سی تھیں۔ ذرا بھی تو فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میں کبھی ہاتھ میں پکڑی ہوئی تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی اپنی بنائی ہوئی تصویر کی طرف۔

''اچھا! تم! اس پلنگ پر آ کر بیٹھو۔ بلکہ اس پلنگ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر کے سوچو اور پھر بتاؤ کہ کچھ یاد آتا ہے۔''

مجھے اس کی یہ بات کچھ اٹ پٹی سی لگی۔ لیکن پھر بھی میں اس کے پلنگ پر لیٹ گیا اور ایک بچے کی طرح اس کی بات مان کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ پہلے تو میرے سامنے اس کرسی پر بیٹھی جس پر پہلے میں بیٹھا تھا۔ پھر وہاں سے اٹھی اور میرے پاس ہی آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

''کچھ یاد آتا ہے''۔ اس نے بالوں کو ایک جھٹکا دیا۔ اور وہ چاندی کا شال دائیں کندھے سے ہٹ کر بائیں کندھے پر ٹک گیا۔

''کچھ یاد آیا؟'' اس نے اپنا سوال پھر دہرایا

میں آنکھیں بند کیے بہت پیچھے اپنے بچپن میں جھانک رہا تھا۔ مگر کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ پھر یکایک مجھے کچھ یاد آیا تو بولا: ''مجھے خود تو کچھ یاد نہیں۔ مگر میرے ماں باپ مجھے بتاتے ہیں

کہ پیدا ہونے کے بعد جب میں نے سال ڈیڑھ سال کی عمر میں باتیں کرنی شروع کیں تو ان سے یہ کہا کرتا تھا کہ یہ گھر میرا نہیں ہے۔ میرا گھر تو دلی کے فلاں محلے میں ہے"۔

"ہاں، ہاں کہو۔"

"اور وہ شاید مجھے دہلی لائے بھی تھے اور اپنے محلے میں پہنچ کر میں خود ہی اپنے گھر پہنچ گیا تھا اور ایک عورت کو دیکھ کر میں نے کہا تھا کہ یہ میری بیوی ہے۔"

"پھر کیا ہوا تھا"۔ اس نے پوچھا۔

"اس کے بعد تو میں سب بھول بھال گیا۔ مجھے اب کچھ بھی یاد نہیں۔"

"میں وہی عورت ہوں اور اس وقت تم اپنے پچھلے جنم کے بیڈروم میں لیٹے ہو۔"

میں لیٹا لیٹا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ میں نے اس جنم میں اپنے پہلے جنم کی بیوی کی تصویر بنائی۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔"

اس کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ تم تو بچپن میں مجھے پچھلے جنم کی بات کہہ کر بھول گئے لیکن میں تمہیں کبھی نہ بھول سکی۔ اس دن تم نے جب اپنے ماں باپ اور گاؤں کا پتہ بتایا تو میں اسی وقت سمجھ گئی تھی کہ تم وہی ہو۔ اسی لئے میں تمہیں اپنے بیڈروم میں لے آئی تھی تاکہ شاید اپنے پچھلے جنم کے گھر کے ماحول کو دیکھ کر تم کچھ یاد کر سکو۔

وہ میرے پچھلے جنم کی باتیں کرتے کرتے کبھی ہنس دیتی تھی، کبھی رو پڑتی تھی۔

اس دن اپنے گھر سے وداع کرتے ہوئے اس نے مجھے دوبارہ آتے رہنے کے لئے کہا اور پھر مجھے گلے سے لگا کر چوم لیا۔ اس چمن میں بیوی کا پیار بھی شامل تھا اور ماں کی ممتا بھی۔

✓

''رُلدو پاتشاہ''

ایک تھا بادشاہ

اپنی لمبی عمر بِتا کر جب وہ بوڑھا ہو گیا، بہت بوڑھا تو اسے بیماریوں نے آگھیرا اور اسے احساس ہو گیا کہ اب اس کا آخری وقت قریب آگیا ہے۔

اس احساس کے ساتھ ہی اسے ایک اور فکر لاحق ہو گئی۔ اور وہ یہ کہ ساری عمر تو شاہی ٹھاٹ باٹ سے گذری، عیش و آرام سے گذری، اور اب مرنے کے بعد پتہ نہیں میں نرک میں جاتا ہوں یا سورگ میں۔ سورگ مل گیا تو ٹھیک ہے، اس نے سوچا لیکن اگر نرک میں جانا پڑا۔ تب تو بڑے دکھ سہنے پڑیں گے۔ نرک کے دکھوں کے تصور سے ہی اس کی روح کانپ گئی تو اس نے سوچا۔ ''میں خواہ مخواہ خوف کے مارے کانپ رہا ہوں۔ پہلے پنڈت جی کو بلا کر پوچھا تو جائے کہ قسمت میں کیا لکھا ہے۔

پنڈت جی بلائے گئے۔ پنڈت نے بڑے دھیان سے راجہ کا ہاتھ دیکھا۔ ماتھے پر لکھی تقدیر پڑھی۔ جنم کنڈلی سے گرہوں کے چکر کو دیکھا، حساب لگایا۔ اور پھر وہ فکر مند سا ہو

کر راجہ کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

پنڈت کو یوں خاموشی سے اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر راجہ نے سوالیہ نظروں سے پنڈت کی طرف دیکھا، پنڈت چپ۔

جب راجہ نے تیسری بار پوچھا تو پنڈت نے کہا۔ ”راجن جان بخشی ہو تو عرض کروں۔“

جو کچھ ہماری قسمت میں ہے، سچ سچ بتاؤ۔

راجن گرہ کہتے ہیں کہ آپ کو مرنے کے بعد نرک میں جانا پڑے گا۔

راجہ، پنڈت کو خاموش دیکھ کر دل ہی دل میں کچھ بھانپ تو گیا تھا لیکن اب پنڈت کی بات سن کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ آخر راجہ نے پنڈت سے پوچھا۔ ”کوئی اپائے ہے؟“

”ہاں سرکار اپائے ہے“ پنڈت، راجہ کے اس سوال کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ اس لئے اس نے اپنی پتری کو دیکھتے ہوئے گرہوں کے ہندسوں کی گنتی کر لی تھی۔

”راجن آپ نے اپنے راج میں صرف اپنے ہی سکھ کی بات سوچی ہے۔ عام جنتا کی بھلائی کے لئے کچھ نہیں کیا۔ اس لئے ان کو بہت کشٹ سہنے پڑے ہیں۔ پرماتما کی نظر میں یہ سب سے بڑا اپرادھ ہے۔ اس لئے آپ کو کوئی دوسرا جنم ملنے سے پہلے سات جنم کی عمر کے برابر نرک میں رہنا ہے اس کے لئے اپائے یہ ہے کہ آپ اپنی رعایا کے سب سے غریب دردر ایک آدمی کو اتنا دھن دیں اتنا دھن دیں کہ اس کی سات پشتیں سکھ سے رہ سکیں، تب آپ کا یہ نرک کا یوگ ٹل سکتا ہے۔

بس پھر کیا تھا، اسی وقت راجہ کا رتھ تیار کیا گیا۔ روپے اور سونے اور چاندی سے بھر کر سات تھیلیاں تیار کی گئیں۔ راجہ کے امیر اور وزیر ساتھ ہو لئے اس نیک کام کے لئے۔ یہ قافلہ ہمارے گاؤں کے لئے چل دیا، جہاں گاؤں کے سب سے دردر رلدو کو یہ دولت دی جانی تھی۔

اس شاہی سواری کو اپنے گاؤں کی طرف آتے دیکھ کر گاؤں کے چوہدری سرپنچ سب کے سب حیران رہ گئے اور اسے دیکھتے ہی استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دیرے میں برگد کے نیچے چارپائیاں بچھ گئیں۔ حقے تازے کئے جانے لگے۔ دیرے میں گرے برگد کے سوکھے پتے سمیٹ کر جلدی سے چھڑکاؤ ہونے لگا۔ کوئی بھاگ کر شربت تیار کرنے کے لئے گڑ اور شکر لے آیا۔ یہاں تک کہ ساتھ لگی مستریوں کی بیٹھک میں پلنگ پر بستر بچھا دیا گیا۔

شاہی سواری نہیں ہو سکتی۔ کوئی فوجی دستہ معلوم ہوتا ہے۔" کسی نے اڑتی ہوئی دھول میں نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

شاہی سواری ہی ہے۔ رام قسم، ایک نوجوان پورے جوش کے ساتھ بولا۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ آگے آگے شاہی جھنڈا پیچھے ہاتھی۔ پھر گھوڑے۔ جس رتھ پر راجہ بیٹھا ہے، اس پر چھتر جھول رہا ہے۔ اس کے پیچھے وزیروں اور امیروں کے گھوڑے ہیں۔ باادب باملاحظہ، ہوشیار۔"

"شاہی سواری ہی ہے۔" گاؤں کا چوہدری بولا۔ اتنے میں شاہی سواری کافی قریب آ گئی۔ شاہی جھنڈا، ہودے والا ہاتھی، اور چھتر والا رتھ صاف صاف دکھائی دیا اور وہ سب لوگ گاؤں کی کچی پکی، آڑھی ترچھی گلیوں سے ہوتے ہوئے گاؤں کے آخری سرے پر بنی رُلدو کی جھونپڑی کے باہر پہنچ گئے۔

اس وقت رُلدو کی بیوی اپنے مٹی کے چولھے میں، اپنے ہاتھ کی انگلیاں جلاتے ہوئے آگ کو تیز کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن توے پر رکھی روٹی کو ذرا بھی سینک نہیں لگ رہا تھا۔ آگ ذرا سی جلتی تو اسکی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو، پانی بن کر چولھے میں جلتی ہوئی آگ کو بجھا دیتے۔ آنسوؤں کے گرتے ہی شاں شاں کی سی آواز آتی اور چولہے سے اٹھتا ہوا دھواں، جھونپڑی کی گھاس پھوس کی چھت سے اوپر اٹھتا ہوا، ہوا میں منڈرانے لگتا۔ اس دھوئیں کو دیکھ کر باہر سے دیکھنے والے کو ایسے لگتا جیسے جھونپڑی کو آگ لگ گئی ہے اور دھواں چاروں طرف پھیل رہا ہے۔

یہ منظر دیکھ کر راجہ کو ایسے لگا جیسے وہ جیتے جی نرک میں پہنچ گیا ہو، اور اس کے چاروں طرف نرک کی آگ پھیل رہی ہو۔

اندر جھونپڑی میں رلدو کی بیوی کی چھاتی سے دودھ پیتے ہوئے بچے کی آنکھوں میں یہ دھواں گڑنے لگا تو اس نے ماں کی چھاتی کو اپنے دودھ والے دانتوں کے نیچے دبا کر زور سے کاٹ لیا۔ رلدو کی بیوی جو کل سے بھوکی تھی اور جس کی چھاتی میں دودھ تھا ہی نہیں، بچے کے اس طرح کاٹنے سے تڑپ اٹھی اور اس نے چولھے سے سلگتی ہوئی ایک لکڑی نکال کر غصے سے رلدو کی طرف پھینکی جو شراب کے نشے میں چور اتنا دن چڑھ آنے پر بھی اوندھا پڑا تھا۔

اتفاق سے اسی وقت راجہ کا سپاہی اندر داخل ہو کر سامنے لیٹے رلدو کی طرف بڑھ رہا تھا کہ وہ جلتی ہوئی لکڑی سپاہی کی ٹانگ سے جا لگی۔ رلدو کا بڑا بیٹا جو ایک طرف الف ننگا بیٹھا ہوا ہاتھ میں خالی طشتری لیئے روٹی کے پکنے کا انتظار کر رہا تھا، وہ سپاہی کو درد کے مارے ٹانگ سہلاتا دیکھ کر کھی کھی کرتا ہنس دیا۔ لڑکے کے بلاوجہ کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز سن کر رلدو کی بیوی نے ادھر نظر اٹھا کر دیکھا تو بھونچکی رہ گئی۔ کمرے میں پھیلے دھوئیں کے غلاف میں لپٹا کوئی آدمی رلدو کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

"رلدو پاتشاہ۔ راجہ صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ باہر کھڑے ہیں۔"

لکڑی کے کسی کو لگنے کی آواز سے چونک کر رلدو جو اب تک اوندھا لیٹا تھا، اب سیدھا ہو کر لیٹ گیا تھا۔ اس سے جو کچھ کہا گیا تھا، وہ اس کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔ اس لیے وہ اپنی پوری طاقت سے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سپاہی نے پھر کہا۔ رلدو پاتشاہ"

"رلدو تو پاتشاہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کا نشہ جوان ہو۔ اب تو نشہ ٹوٹ چکا ہے۔ اور جب رُلدو کا نشہ ٹوٹا ہوتا ہے تو رلدو دو کوڑی کا بھی آدمی نہیں ہوتا۔ وہ تو راستے میں پڑے تنکے سے بھی گیا گذرا ہوتا ہے۔ "رُلدو کی بیوی، تم نے دیکھا نہ چولھے کی جلتی ہوئی لکڑی سے مارتی ہے۔ یہ دیکھو، مجھے یہاں چوٹ لگی ہے۔ یہاں چوٹ لگی ہے"۔ یہ کہتے ہوئے

رلدو گردن گھما کر اپنی ننگی پیٹھ آنے والے کو دکھانے لگا اور ساتھ ہی اپنے دونوں ہاتھوں میں منہ دے کر پھپھک پھپھک کر رو پڑا۔

آپ روئیں نہیں۔ رلدو پاتشاہ۔ آپ کے تو دن بدل گئے ہیں۔ راجہ صاحب خود آپ کے دوار پر کھڑے ہیں۔

اس آدمی کا رلدو کو رلدو پاتشاہ کہہ کر مخاطب کرنا رلدو کے لڑکے کو بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس لئے وہ پھر کھلکھلا کر ہنس دیا۔

ادھر رلدو کی بیوی کے چولھے میں آگ نہیں جل رہی تھی۔ توے پر پڑی روٹی ویسے ہی کچی کی کچی تھی اور اس کی چھاتی نوچ رہے بچے کو زور زور سے منہ مارنے پر بھی دودھ نہیں مل رہا تھا۔ اس لئے اس نے ایک مرتبہ پھر ماں کی چھاتی کو زور سے کاٹ لیا۔

رلدو کی بیوی کو درد تو بہت ہوا۔ لیکن کسی پرائے مرد کی موجودگی میں اس نے چلانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے بچے کے منہ سے دودھ نکالا اور پھٹے ہوئے دوپٹے سے اپنی چھاتی کو ڈھانکنے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے آنے والے کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے جھونپڑی میں پھیلے ہوئے دھوئیں کو اپنے ہاتھ کی مدد سے اپنی آنکھوں کے سامنے سے ذرا ہٹایا تو آنے والے آدمی کو وردی میں دیکھ کر اس کی روح کانپ گئی۔

دینا رے۔ دینا۔ یہ تو راجہ کا سپاہی ہے"۔ اس نے ڈر کر یوں کہا جیسے اس نے کوئی خوفناک درندہ دیکھ لیا ہو۔

رُلدو جو ابھی تک آرام سے لیٹا تھا، بیوی سے سپاہی کا نام سن کر ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے گھبرا کر دوسرے بچے کو جلدی سے یوں لپک کر گود میں اٹھالیا۔ جیسے کسی خونخوار درندے کو دیکھ کر کوئی اپنے بچے کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

اپنے ٹوٹتے ہوئے نشے سے ماؤف ذہن سے رلدو ابھی کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ صبح ہی صبح اس پر کون سی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے کہ اتنے میں راجہ صاحب خود اپنے وزیر اور اہلکاروں کے ساتھ اس کی جھونپڑی کے اندر آگئے۔

"رُلدو پاتشاہ۔ راجہ صاحب یہ سارے روپے تمہیں دے رہے ہیں۔" کسی اہلکار نے روپوں سے بھری تھیلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کہاں رلدو در در کہاں راجہ، وزیر، اہلکار، روپوں کی تھیلیاں۔ لیکن رلدو کی حالت تو محاورے والے گنگو تیلی سے بھی گئی گذری ہے۔ گنگو اگر تیلی تھا تو ظاہر ہے وہ تیل نکالتا ہوگا۔ تیل نکالتا ہوگا تو تیل بیچتا بھی ہوگا۔ تیل بیچتا ہوگا تو اسے کچھ آمدنی بھی ہوتی ہوگی۔ لیکن رلدو کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ادھر ادھر بھٹک کر جنے کھنے کی بیگار کر کے جو مل جائے سو مل جائے۔ وہ تو کہو موسم میں مہوے کا پھل جنگل سے بہت مل جاتا ہے۔ اور اسکی شراب وہ خود ہی بنالیتا ہے، ورنہ وہ تو......

اور یہ راجہ، یہ وزیر، یہ روپوں کی تھیلیاں، اور رلدو کی جھونپڑی جس میں دھواں بھرا ہے۔ توے پر کچی روٹی رکھی ہے، جو پک ہی نہیں رہی۔ ایک بچہ بھوک کے مارے ماں کی چھاتی کو کاٹ رہا ہے دوسرا ننگا، الف ننگا۔ یہ سپنا ہے صدیوں کی پشتوں کی غریبی کا سپنا جو اس کے پرکھوں نے دیکھا تھا، اور اب وہ دیکھ رہا ہے۔ "ضرور سپنا ہے" یہ سوچ کر رلدو نے اپنے گال پر زور سے تھپڑ مارا اور وہ خود ہی درد سے چلا اٹھا۔ باپ کو خود ہی اپنے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے دیکھ کر لڑکا پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ یہ کھلکھلانے کی آواز اور رلدو کے درد کے مارے چلانے کی آواز آپس میں گڈمڈ ہو کر کچھ اس طرح کی آواز بن گئی جیسے دھوئیں سے بھری ہوئی جھونپڑی کراہ اٹھی ہو۔ ایسے میں رلدو نے وزیر اور اہلکاروں کے ہاتھوں میں اٹھائی روپوں کی تھیلیاں دیکھیں تو اسے یوں لگا جیسے بہت سے کالے ناگ پھن پھیلائے اس کے سامنے اچانک نمودار ہو گئے ہوں۔ وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ کر جھونپڑی کی دیوار سے سٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی بیوی اور ننگا بچہ بھی اس کے پاس سمٹ آئے۔

رلدو پاتشاہ لے لو۔ راجہ جی یہ سب تمہارے لئے لائے ہیں۔

نہ بابا نہ۔ ایک بار، سات آٹھ پیڑھی پیچھے ہمارے کسی سسرے پرکھے نے کسی سے پانچ روپے لیئے تھے۔ پتہ نہیں کاہے کے لئے۔ سات پشتیں مل کر بھی وہ قرض ہم ابھی تک

نہیں اتار پائے۔ اب اتنا روپیہ لے لیا تو۔۔۔۔

تب تو ہم قیامت تک ادا نہیں کر پائیں گے۔ رلدو کی بیوی نے رلدو کا جملہ پورا کر دیا۔

یہ قرض نہیں ہے۔ یہ تو راجہ صاحب اپنی خوشی سے۔۔۔۔

رلدو اور رلدو کی بیوی، رلدو کا بچہ سب سہم کر سکڑ کر کھڑے کے کھڑے رہے۔ ان میں سے کوئی بھی پیسے لینے کیلئے آگے نہ بڑھا۔ ان کے سر متواتر نہ میں ہل رہے تھے۔

راجہ نے سمجھایا۔ اس کے امیروں وزیروں نے سمجھایا۔ گاؤں کے سرپنچ اور چوہدریوں نے بھی بڑا زور ڈالا لیکن رلدو نے ایک نہ پکڑ لی تو پھر نہ ہی پکڑ لی۔

آخر جب مایوس ہو کر شاہی سواری چلی گئی اور رلدو نے پیسے نہیں لئے تو گاؤں کے چوہدری نے کہا۔ رلدو تم تو مورکھ کے مورکھ ہی رہے۔ تم نے گھر آئی لکشمی کو ٹھکرا دیا۔ راجہ خود تمہارے گھر میں اتنی دولت لے کر آئے اور تم نے نہ کر دی آخر کیوں؟'' گاؤں کا چوہدری حیران ہو رہا تھا۔

کچھ نہیں چوہدری۔ راجہ میری غرض پوری کرنے کے لئے دے رہا ہوتا تو میں لے لیتا لیکن وہ تو

''وہ کیا؟'' کسی نے پوچھا

''راجہ یہ سب دھن دولت اپنی غرض کو دے رہا تھا۔

''راجہ کی غرض؟ وہ کیسی؟'' بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی'' چوہدری نے کہا۔

''تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی چوہدری'' رلدو بولا۔ ''دراصل راجہ اب مرنے والا ہے کسی جیوتشی نے اسے بتایا ہے کہ مرنے کے بعد تم نرک میں جاؤ گے۔ اس نرک سے بچنے کا اپائے جیوتشی نے یہ بتایا تھا کہ کسی دردر کو اتنا پیسہ دان میں دو۔۔۔ میں نے راجہ کے اہلکاروں کو کھسر پھسر کرتے خود سنا ہے۔

اس سے تمہیں کیا فرق پڑتا۔ ایک تو پن ہو جاتا، دوسرے پھلیاں۔ راجہ نرک

جانے سے بچ جاتا اور تم امیر ہو جاتے۔" چوہدری نے کہا

زندگی کے پورے پچاس سال میں نے اسی راجہ کے راج میں نرک میں کاٹے ہیں۔ اور تم کہتے ہو کہ میں اسے مرنے کے بعد سورگ دلانے میں مدد کروں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ مر کر ہی سہی وہ نرک بھوگے تو اسے پتہ چلے کہ ہم غریبوں پہ کیا بیتتی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے رلدو نے جھونپڑی کے کونے میں سلگتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور بیوی سے کہا۔ آگ جلائے۔ توے پر پڑی روٹی سوکھ رہی ہے۔

✓

مت جاؤ

آج صبح، میں سیر کرتے کرتے جنگل میں پہنچا، اور معمول کے مطابق بانسوں کے اس جھنڈ کی طرف مڑ گیا جس میں لیٹ کر تھوڑی دیر آرام کرنے کیلئے میں نے بانس کے سوکھے پتوں کا بستر بچھا رکھا ہے۔ اس جھنڈ کی طرف جانے والی اوبڑ کھابڑ سی پگڈنڈی کے دونوں طرف کانٹے دار جھاڑیاں ہیں۔ ان میں سے ایک جھاڑی کی ایک ٹہنی، پگڈنڈی پر پوری طرح جھکی ہوئی ہے۔ وہ اکثر میرا راستہ روک کر کہتی ہے۔ ''تم سے کتنی بار کہا ہے کہ ادھر مت آیا کرو۔'' اور میں ہر مرتبہ اسے چھڑی سے، یا ہاتھ سے ہٹا کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ لیکن آج اس نے نہیں روکا۔ بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ آج مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کب اس کے پاس سے نکل کر آ گیا۔ اس کے بعد تھوڑے فاصلے پر ایک بانس کی ٹہنی بھی ایسا ہی کہتی ہے۔ وہ تو اکثر میری پگڑی میں آکر پھنس جاتی ہے۔ ایک مرتبہ تو اس نے میری پگڑی کو پوری طرح اتار لیا تھا، اور پھر ہنستے ہنستے دوبارہ میرے سر پر رکھ دیا تھا۔ آج وہ بھی جیسے مجھے آتے ہوئے دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ اس کے پاس سے گذر کر میں ایک قدم آگے بڑھا تو میں

نے دیکھا کہ ایک بوڑھا تیتر میرے آگے آگے چل رہا تھا، جیسے مجھے میرے پتوں کے بستر تک پہنچانے کے لئے میری راہنمائی کر رہا تھا۔

جب میں بستر تک پہنچ کر اپنے جوتوں کے تسمے کھولنے لگا تو وہ تیتر پاس ہی بانس کے اس جھنڈ کے نیچے کھڑا ہو کر میری طرف دیکھنے لگا جس پر میں نے اپنی چھڑی کو ٹانگ دیا تھا۔

بستر پر بیٹھ کر میں نے کچھ دیر ہاتھ، پاؤں اور گردن کا یوگا ابھیاس کیا اور پھر آخر میں لمبے لمبے سانس لینے کے بعد جب میں اپنے پتھر کے تکیئے پر سر ٹکا کر لیٹ گیا تو دیکھا کہ دھوپ کی دو تین چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں، پتہ نہیں اس گھنے جھنڈ کے کون کون سے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے ہوتی ہوئی میرے پاس آکر بیٹھ گئی تھیں۔

"تم کب آئیں؟" میں نے دھوپ سے پوچھا۔

"بس یہ ابھی آئی ہے" میرے ارد گرد پھیلے ہوئے سائے نے دھوپ کے آنے پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کتنی دیر ہو گئی ہے مجھے آئے ہوئے دھوپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جب انہوں نے آنکھیں بند کر کے پہلا لمبا سانس لیا تھا میں تو تبھی آگئی تھی۔ تم ہی بتاؤ بیس بار لمبی سانس لینے میں کچھ وقت لگتا ہے یا نہیں؟

"اچھا بابا، تم کہتی ہو تو میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ تم تو رات بھر یہیں بانس کی ٹیسی پر بیٹھی تھی۔ بس صبح ہوئی اور نیچے اتر آئی"

دل تو میرا بھی کرتا ہے کہ ایک رات تمہارے ساتھ اس جھنڈ میں گزار کر دیکھوں کہ کیسا لگتا ہے؟... لیکن سورج دیوتا ہے کہ مانتا ہی نہیں۔ "نہ بابا نہ۔ دن بھر چاہے جہاں رہو، لیکن رات کو میرے پاس ضرور آجاؤ۔"

"ایسا کیوں؟" سائے نے اپنی آواز میں تجسس بھر کر کہا۔

"اس لئے کہ تب وہ مجھے اس طرف بھیج دیتا ہے جدھر رات ہوتی ہے"

"خوش قسمت ہو۔ اندھیروں کو دور کرتی ہو۔ روشنی پھیلاتی ہو۔ دنیا میں اس سے اچھا کام اور کیا ہو سکتا ہے؟"

سائے اور دھوپ کی یہ خاموش گفتگو مجھے بڑی اچھی لگی۔ اب تک کچھ دھوپ اور آ گئی تھی۔ پتوں کے سائے اور اس سے چھن کر آتی دھوپ کے تانے بانے نے جو چادر بن دی تھی، میں نے اسے اپنے تن پر اوڑھا تو ایسا لگا جیسے سارے جہان کی مسرتیں مجھ پر نچھاور ہو رہی ہوں۔ میں نے خوشی سے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد کھولیں اوپر دیکھا تو احساس ہوا کہ بانس کے پتوں نے میرے اوپر ہری سی چھت تان دی ہے۔ ان ہرے پتوں کی چھت کے چھوٹے چھوٹے جھروکوں سے دکھائی دینے والا نیلا آسمان وہاں نیچے اتر کر پتوں سے لدی ٹہنیوں کی چھت کے ذرا سا اوپر آ کر ٹک گیا تھا۔ کیا منظر تھا۔ ہرے پتوں کے بیچ سے دکھائی دیتے ہوئے آسمان کے ٹکڑے ایسے لگ رہے تھے جیسے نیلے یاقوت بانسوں کی ٹہنیوں کے اوپر لٹکتے ہوئے چمک رہے ہوں، دمک رہے ہوں۔

پتہ نہیں کب تک میں اس حیران کن منظر کو دیکھتا، اپنے آپ میں کھویا رہتا کہ شبنم کا ایک قطرہ، امرت کی بوند بن کر میرے ماتھے پر آ ٹپکا۔ پھر کچھ اور بوندیں میرے وجود پر ٹپکیں اور مجھے ایسے لگا جیسے قدرت مہربان ہو کر مجھ پر امرت کی بارش کر رہی ہو۔ مجھے لگا جیسے میرا وجود سرشار ہو رہا ہو۔ ایک ٹھنڈک تھی جو میرے جسم میں اتر رہی تھی۔ ایک سکون تھا جو میرے رگ و ریشے میں اتر کر میرے لہو میں رچ بس کر میرے اندر دوڑ رہا ہو۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ مجھ پر ایک کیف کا سا عالم طاری ہو گیا۔ ایک وجد تھا جو میرے پورے حواس پر چھایا ہوا تھا۔ ایک خوشبو تھی جو مجھے اپنے اندر سمیٹے کسی انوکھی دنیا میں لئے جا رہی تھی۔ کہیں حد نظر تک سارے کرۂ ارض پر پھول ہی پھول اگ آئے تھے۔ کہیں ساری دھرتی پر سبزہ ہی سبزہ تھا۔ ہرا رنگ لاکھوں رنگوں میں ڈھل کر کرۂ ارض کو ایک خوبصورت تصویر بنا رہا تھا کہیں ساری دھرتی میٹھی روٹی میں بدل گئی تھی اور سمندر کا سارا پانی دودھ بن گیا تھا اور خدا کی تمام مخلوق اپنی جنم جنم کی بھوک کو مٹا کر عجیب سی تسکین اور سکھ

کے تجربے سے گزر رہی تھی۔

پتہ نہیں اس بانس کے پتوں کے بستر پر لیٹے لیٹے، پتھر کے تکیے پر سر رکھے اپنی بند آنکھوں سے میں کس حسین وادی میں پہنچ گیا تھا کہ بوڑھے تیتر نے اپنے پنکھ پھڑ پھڑائے۔

بوڑھے تیتر نے پنکھ پھڑ پھڑائے تو مجھے ایسا لگا جیسے بانسوں کے جھنڈ میں موجود سناٹے نے مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہو۔ یوں اس سناٹے کی آواز کو میں نے اس جھنڈ میں اکثر سنا ہے۔ اکثر یہ سناٹا اپنے خاموش قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس آتا ہے مجھ سے باتیں کرتا ہے۔ ان خاموش سناٹے نے کتنی ہی خاموش کہانیاں مجھے سنائی ہیں۔ کتنی ہی درد بھری آنسوؤں سے بھیگی ہوئی کہانیاں مجھ سے سنی ہیں۔ یہ وہ کہانیاں میں جن میں یہ سناٹا ہی میرا ہمراز ہے، میرا ہم خیال ہے، میرا ہمدرد ہے، میرے زخموں پر مرہم لگانے والا ہے۔ یہ میرے آنسوؤں کو پونچھتا ہے اور میرے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر کھلکھلا کر ہنستا ہے۔

لیکن اس وقت اس سناٹے کا رنگ کچھ اور ہے۔ میرے اوپر بانسوں کی ٹہنیوں کا جال ہے اور اس جال کے اوپر نگینوں سے جڑا ہوا جو آسمان تنا ہے اس میں سے ایک سوکھا پتہ ہوا میں لہراتا ہوا میرے اوپر آکر گر پڑا۔ اس پتے کے ٹوٹنے اور ہوا میں لہرانے اور میرے اوپر گرنے سے بھلا کتنی آواز پیدا ہو سکتی ہے۔ غالباً کچھ بھی نہیں۔ لیکن یہی باریک سی آواز میرے لئے سناٹے کی آواز بن گئی، اور میرے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگی.... جیسے کسی چناب کے کنارے بج رہی رانجھے کی بانسری کی آواز، ہیر کے کانوں میں محبت کی مٹھاس بن کر گھل رہی ہو، ایسے ہی میرے گرد پھیلے اس سناٹے کی آواز قطرہ قطرہ مٹھاس بن کر میرے وجود میں اتر رہی ہے۔ اور میرے دھڑکتے ہوئے دل کو وہ امرت مل گیا ہے جو فانی زندگی کو لافانی بنا دیتا ہے۔ جہاں زندگی موت کے سایوں سے آزاد ہو کر آنِ واحد میں ہوا کی لہروں میں گھل کر افق تا افق پھیل جاتی ہے۔ ایک نئی دھرتی وجود میں آجاتی ہے نیا آسمان بن جاتا ہے جہاں یگوں یگوں تک، ہر رنگ میں، ہر روپ میں زندگی کار فرما ہے۔

خوشی کے اس موقع پر ساز تو بجنے ہی چاہیں۔ بوڑھے تیتر نے ایک مرتبہ پھر پنکھ

پھڑ پھڑائے اور مجھے احساس دلایا کہ میں پتوں کے بستر پر پتھر پر سر ٹکائے لیٹا ہوں۔ لیکن اس کا احساس صرف میرے جسم کو ہی ہوا۔ میری روح تو بھرپور مسرت کے پنکھوں کے بل پر اڑتی ہوئی ساتوں آسمانوں کی سیر کر رہی تھی۔ تبھی جھنڈ میں ایک چڑیا چہچہائی۔ تھوڑی دیر بعد دوسری۔ دوسرے کونے سے ایک اور پکشی نے کوئی اور ہی راگ الاپا ہلکے سے۔ یہ آوازیں آہستہ آہستہ میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ جب پکشیوں کی چہچہاہٹ کا سنگیت میرے دل کی گہرائیوں تک پہنچا تو آسمانوں میں پرواز بھرتی میری روح نے بھی اسے سنا اور اس کی کشش سے کھنچی، وہ بھی میرے وجود میں اتر کر اس سنگیت کو سنتے ہوئے سر دھننے لگی۔

میں اپنے پتوں کے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دھوپ اور سائے کی کتنی ہی ٹولیاں میرے ارد گرد بیٹھی تھیں۔ میں، بانسوں کے پتوں کا بستر، ارد گرد بکھرے سوکھے پتے، پتے پر بیٹھی دھوپ اور سائے کی ٹولیاں بانسوں کے جھنڈ ان کی ٹیسی پر بنی ہری چھت کے اوپر اترا ہوا نیلا آسمان، سب کے سب مل کر پکشیوں کے اس سنگیت کو سننے میں محو تھے۔ ایک سکون تھا جو چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ امرت تھا جو ہر طرف برس رہا تھا۔

میں اس سکون کے لمحے کا کیا کروں؟" میں نے سوچا۔ کالی داس کی شکنتلا کے اداس دل پر اس سکون کا پھاہا اس وقت رکھ دوں جب وہ دشینت کے ہجر میں تڑپ رہی ہو۔ یا جب انسانیت کسی کی طرح کسی مار و قتل میں، آبلہ پا چل رہی ہو، تو اس سائے سے کہوں کہ بنی نوع انسان کے سر پر چھتری بن کر پھیل جائے۔ دھوپ کے ان نرم ٹکڑوں کو اٹھا کر سردی سے ٹھٹھرتے کسی انسان کے اوپر پھیلا کر اس میں زندگی کی حرارت بھر دوں۔

میں نے اس مقصد سے بالکل غیر ارادی طور پر اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے سائے کے ایک ٹکڑے کو اٹھایا ہی تھا کہ ایک چڑیا کسی اوپری شاخ سے زخمی ہو کر ٹھیک میرے پتوں کے بستر پر گر کر چیں چیں کرنے لگی۔ زندگی کی کربلا میں اسے کسی یزید نے زخمی کر دیا تھا۔

میں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سائے کی پٹی کو اس چڑیا کے زخم پر پھیلا دیا اور اسے واپس اس کے گھونسلے میں بٹھا کر میں بانسوں کے جھنڈ سے باہر جانے کیلئے چل دیا ہوں۔

جھنڈ سے باہر آتے ہوئے کانٹے دار جھاڑی کی وہ ٹہنی، جو جھنڈ کے اندر آنے سے منع کرنے کیلئے روز میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جایا کرتی ہے۔ وہ میرا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی ہے۔

کہتی ہے۔ "مت جاؤ"

✓

"ہسپتال بیمار ہے"

ہسپتال کو دیکھ کر میری بیوی کا صدیوں پرانا روگ اس طرح جاگ اٹھتا ہے جس طرح کالے کوسوں کی دوری پر پانی کی موجودگی کا شک ہوتے ہی ریگستان کے اونٹ میں زندگی مل جانے کی امید پیدا ہو جاتی ہے۔

اب اگر نخلستان ہی سراب کی شکل اختیار کر لے تو اس میں بے چارے اونٹ کا کیا قصور۔

وہ اچھی خاصی میرے ساتھ چلتی آ رہی تھی۔ اچانک اس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو پکڑا، اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے اور اس کے ساتھ ہی ہسپتال کے اندر جانے والے راستے پر اس کے قدموں کی رفتار تیز ہوئی تو آنے والے طوفان کا ڈر ہی جیسے ایک لمحے میں میرے وجود کو جھنجھوڑ گیا۔ میرا دل گھبراہٹ کے مارے تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جسم ٹھنڈے پسینے سے بھیگ گیا۔ رہی سہی طاقت بھی معدوم ہو گئی اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے میرے لئے ایک قدم بھی آگے بڑھانا ناممکن ہے۔ ایسے موقعوں پر میں اس کی

کوئی مدد نہیں کر پاتا۔ بلکہ کہنا یوں چاہیے کہ میں اس حالت میں ہی نہیں رہ پاتا کہ اس کی کچھ مدد کر سکوں۔ کسی اندرونی چبھن کے مارے میری اپنی حالت خیر ہونے لگتی ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ کوئی پانچ سات سو، ہزار سال پہلے، یا ممکن ہے اس سے بھی زیادہ عرصہ ہوا ہو، ہاں درد کی عمر کو کس نے ناپا ہے؟ ہاں! تو تب کہیں کسی خارزار راستے پر چلتے ہوئے میرے کسی پرکھے کے ننگے پاؤں میں ایک کانٹا چبھ گیا تھا، جو ہزار کوششوں اور "اوڑھ پوڑھ" کے باوجود نکالا نہ جا سکا اور وہ ساری عمر اس کانٹے کے درد کو اپنے جسم کے انگ انگ میں محسوس کرتا رہا۔ وہی چبھن نسل در نسل چلتی ہوئی مجھ تک پہنچی ہے۔ اور گھبراہٹ کے عالم میں جب وہ درد جاگ اٹھتا ہے تو... چھوڑیئے... بات تو میں اپنی بیوی کے درد کی کر رہا تھا۔

عین ہسپتال کے پھاٹک کے سامنے میری بیوی پر درد کا ایک شدید دورہ پڑا، اور وہ وہاں پر پٹ سے، چت گر گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اینٹھنے شروع ہو گئے۔ لیکن پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح دونوں ہاتھوں سے پیٹ کے درد کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اتفاق سے اس وقت ہسپتال میں پڑھنے والے نئے ڈاکٹروں کی ٹولی سفید کوٹ پہنے اور گلے میں مریض کو دیکھنے والا آلہ لٹکائے ہسپتال سے باہر آ رہی تھی۔ انہوں نے میری بیوی کو اس حالت میں دیکھا تو وہ جلدی سے اس کا معائنہ کرنے لگے۔ اس میں سے کسی نے پہیوں پر چلنے والی ایک چارپائی بھی منگوائی جس پر ڈال کر وہ میری بیوی کو ہسپتال کے اندر لے گئے۔

لیکن وہاں جس کمرے میں وہ انہیں لے جانا چاہتے تھے وہاں کا بڑا ڈاکٹر انہیں مریض کو اندر لے آنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ وہاں پہلے سے ہی ایک مریض اسی طرح کی پہیوں والی اونچی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور وہ بڑا ڈاکٹر اور اس کا سارا عملہ اس کا معائنہ کر رہے تھے۔

نئے ڈاکٹر لڑکے میری بیوی کی نبض پر ہاتھ رکھے تھے اور اسے حوصلہ دے رہے تھے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی اس کا بھی علاج شروع ہو جائے گا اور وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔

اور جہاں تک ٹھیک ہونے کا سوال تھا، اس سلسلے میں یہ بتا دینا نہایت ضروری ہے کہ میری بیوی کے لئے تو اس اونچے پہیوں والی چارپائی پر لیٹنا ہی ایک طرح سے پہلا تجربہ تھا اور وہ دل ہی دل میں بہت خوش تھی کہ صدیوں تک بیمار رہنے کے بعد آخر وہ ایسی جگہ پر آ پہنچی ہے جہاں کسی کو اس کی بیماری کی فکر ہے اور وہ اس کی بیماری کی تفتیش کرنے جا رہے ہیں۔

محض اس خیال نے ہی میری بیوی کے اندر ایک ایسا حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ پہلے کی نسبت، خود کو بہتر سمجھ رہی تھی اور میں محسوس کر رہا تھا کہ جس ڈاکٹر لڑکے نے میری بیوی کی نبض پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اس میں ضرور کوئی مقناطیسی کشش تھی جو میری بیوی کو درد سے راحت بخش رہی تھی یا کم از کم درد کو بہادری سے سہنے یا برداشت کرنے کا حوصلہ دے رہی تھی۔

لیکن بجائے اس کے کہ علاج شروع ہوتا، ہمارے انتظار کی گھڑیاں دنوں، ہفتوں، مہینوں، سالوں اور پھر صدیوں میں بدلنے لگیں۔ مریض کے بعد مریض آتے رہے۔ ڈاکٹر نرسیں اور ہسپتال کا سارا عملہ منہ پر پٹیاں باندھے، بے حد مصروف رہے، کسی مریض کو سوئی لگائی جاتی، کسی کو گلوکوز اور خون دیا جاتا، کسی کا چیر پھاڑ ہوتا، پٹیاں باندھی جاتیں اور لوگ شفا پا کر خوش خوش ہسپتال سے باہر بھی جاتے دکھائی دیتے، لیکن اگر باری نہیں آ پا رہی تھی تو میری بیوی کی تفتیش کی۔

وہ نئے ڈاکٹر جو میری بیوی کو ہسپتال کے اندر لے آئے تھے، وہ بھی اپنا سبق پڑھنے پڑھانے کے سلسلے میں آہستہ آہستہ اپنے اپنے کاموں سے چلے گئے۔

مجھ پر مایوسی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ یوں بھی اپنے جسم کے انگ انگ میں کانٹے کی جو چبھن محسوس کر رہا تھا، اس کی وجہ سے بھی میرے لئے وہاں ٹھہرنا اور انتظار کرنا دوبھر ہو رہا تھا۔

اس بیچ ان نئے ڈاکٹروں میں سے کوئی لڑکا تیز تیز چلتا ہوا، ایک بار جب ہمارے پاس

سے گذرا تو اسے کچھ تعجب بھی ہوا کہ ہم ابھی تک برآمدے میں پڑے پڑے انتظار کر رہے ہیں۔

پتہ نہیں اس کے دوبارہ کہنے پر یا خود بڑے ڈاکٹر کو فرصت مل جانے پر وہ باہر آ کر میری بیوی کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے میری بیوی کے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔

''درد کہاں ہوتا ہے؟ اس نے پوچھا۔

اس بیچ میری بیوی کا درد غالباً اس کے وجود کے اندر کہیں چھپ گیا تھا۔ اس لئے اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''درد ان کو ہوتا ہے۔ صدیوں پہلے ان کے کسی پرکھے کو کانٹا چبھا تھا اور

''درد ان کو ہوتا ہے اور اسٹریچر پر آپ لیٹی ہوئی ہیں؟'' ڈاکٹر نے پرکھے کے کانٹے والی بات یا تو سنی نہیں تھی، یا سنی تھی تو اسے سمجھا نہیں تھا یا سمجھا تھا تو اس پر غور نہیں کیا تھا۔ اس لئے وہ میری طرف مخاطب ہوا۔

''کہاں درد ہوتا ہے؟ کیسا درد ہے؟ کب سے ہے؟'' اس نے تابڑ توڑ کتنے ہی سوال کر دئے تھے

''جی! جب میری بیوی کے پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے تب.....

بیوی کہتی ہے۔ آپ کو درد ہوتا ہے۔ آپ کہتے ہیں، بیوی کو درد ہوتا ہے۔ یہ ماجرا کیا ہے؟''

''ڈاکٹر صاحب جلدی آؤ۔ فلاں صاحب نے ایک مریض کو بھیجا ہے۔''

اور وہ ڈاکٹر صاحب، ہماری تفتیش کو بیچ میں ہی چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

اس بیچ ہسپتال کا کوئی اور ملازم آیا اور اپنی پہیوں والی چارپائی خالی کروا کر لے گیا۔ کہنے لگا کہ اس کی کسی اور مریض کو اشد ضرورت ہے۔''

میں اور میری بیوی اب پھر وہیں کھڑے ایسے محسوس کر رہے ہیں، جیسے عمر کے خارزار درد بھرے راستے پر چل رہے ہوں۔

اپنے اور بیوی کے درد کو بھلانے کے لئے میں اسے ایک کہانی سنا رہا ہوں۔

ایک تھا راجہ۔ دیکھنے میں وہ پوری طرح تندرست تھا لیکن اندر ہی اندر اسے ایسا لگتا تھا، جیسے وہ اندر سے کھوکھلا ہوتا جا رہا ہو۔ جیسے کوئی اس کے جسم کی طاقت کو قطرہ قطرہ نچوڑ رہا ہو۔ وہ دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی صحت کے بارے میں جب اس کی تشویش بڑھ گئی تو وید کو بلایا گیا۔

وید نے ایک نظر راجہ کی طرف دیکھا اور پھر راجہ کے وزیروں اور درباریوں کی نبض دیکھنے لگا۔ راجہ نے وید کی اس عجیب حرکت کو دیکھا اور کہا۔ ''بیمار میں ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے۔ میں آپ کی بیماری کی ہی وجوہات جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔

راجہ حیران حیران سا وید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اور راجہ کے وزیر اور درباری جس کی نبض پر وید ہاتھ رکھتا تھا ان کے چہرے کے رنگ فق ہوتے جا رہے تھے۔

''کہانی کو لمبا کرنے کے بجائے یہ بتاؤ کہ وید نے راجہ کی بیماری کے بارے میں کیا بتایا؟'' میری بیوی، میری کہانی سے اکتا کر پوچھ رہی تھی۔

وید نے یہ بتایا کہ ''اے راجن آپ کی بیماری کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا دربار بیمار ہے۔ آپ اس کا علاج کر دیں تو آپ کو شفا مل جائے گی۔ آپ صحت مند ہو جائیں گے۔

''تم کہیں یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ یہ ہسپتال بیمار ہے، یہ صحت مند ہو جائے تو ہماری بیماری خود بخود ٹھیک ہو جائیگی؟

ناگ دیوتا

بہت سے لوگوں کی ایک بھیڑ میں آسمان سے ایک مرا ہوا سانپ گرا، اور نتیجے کے طور پر بھگدڑ مچ گئی، ایک درجن لوگ مارے گئے، اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔ اس سانحے کی کہانی ایک گھنی بستی کے بیچ وبیچ ایک کھلے میدان سے شروع ہوتی ہے جس میں اگے ہوئے ایک برگد کے پیڑ کی کھوہ میں دو ناگ رہا کرتے تھے۔ ایک ناگ ایک ناگن۔

ان ناگوں کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ یہ دونوں اچھادھاری سانپ ہیں۔ اور جب ان کا دل کرتا ہے یہ آدمی اور عورت بن کر، بستی میں گھومتے رہتے ہیں۔

ان کے بارے میں جتنے منہ اتنی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔

کوئی کہتا۔ ”میں نے خود دیکھا ہے، دونوں ناگ خوبصورت مرد اور عورت کی جوڑی بن کر برگد کے گرد بنے چبوترے پر بیٹھے تھے۔ کون اجنبی پیڑ کے نیچے بیٹھے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے اس طرف مڑا ہی تھا کہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ مرد اور عورت کالے ناگ بن گئے اور رینگتے ہوئے برگد کی کھوہ میں جا چھپے۔ میرے تو کاٹو تو خون نہیں۔

کسی نے کہا۔ ”میں نے دونوں کو بازار میں دیکھا تھا۔ دونوں آنکھیں نہیں جھپک رہے تھے۔ اچھادھاری سانپوں کی یہی نشانی ہوتی ہے۔ وہ تو کہو اُن کی نظریں میری نظروں سے نہیں ملیں۔ ورنہ پتہ نہیں کیا ستم ہو جاتا۔

دوسرے نے کہا۔ ”نہیں۔ اچھادھاری سانپوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بلاوجہ کسی کو کچھ نہیں کہتے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ان کی پوجا کرنے سے من چاہی مراد حاصل ہو جاتی ہے۔

ایک اور جگہ کسی کو یہ کہتے سنا گیا کہ وہ تو کئی ایسے لوگوں کو جانتا ہے جو ان ناگوں کی پوجا کرتے ہیں اور جن کے من کی مراد پوری ہوتی ہے۔ فلاں صاحب کا دھندے میں مندا ہی مندا چل رہا تھا۔ سونے کو ہاتھ لگتا تھا تو مٹی ہو جاتا تھا۔ پھر اس نے کسی کے کہنے پر ناگوں کے بیٹھنے کے لئے برگد کے گرد چبوترا بنوا دیا۔ تب سے اس کے ہاں روپے پیسے کی لہر بہر ہو گئی ہے۔

ان ناگوں کے تو پچھلے جنم کے بارے میں بھی ایک کہانی اکثر سننے کو ملتی ہے۔ کہتے ہیں۔ پچھلے جنم میں یہ دونوں ناگ بڑے پہنچے ہوئے سادھو تھے۔ انہوں نے ہمالیہ پہاڑ پر جاکر بڑی گھور تپسیا کی تھی۔ پرماتما کے گیان کی روشنی حاصل کرنے کے بعد جب یہ واپس لوٹ رہے تھے تو ایک جنگل سے گزرتے ہوئے بڑے طوفان نے انہیں آگھیرا۔ آندھی اور بارش سے سر چھپانے کے لئے انہوں نے ایک پہاڑ کی غار میں پناہ لی۔ غار میں یہ دونوں سردی کے مارے ٹھٹھر رہے تھے۔ اور اس سے بچنے کی کوئی ترکیب سوچ رہے تھے کہ ان کی نظر پتوں کے ایک ڈھیر پر گئی، جو ہوا کے زور سے لڑھکتے ہوئے وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہوں نے پتوں کے اس ڈھیر کو غنیمت جانا اور اس کی دھونی جلا کر اپنی جان بچائی۔ اب ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ پتوں کے ڈھیر کے نیچے ایک سانپوں کا جوڑا چھپا ہوا تھا۔ پتوں کے ساتھ وہ دونوں ناگ بھی جل گئے۔ ان ناگوں کی انجانے میں ہتیا کر دینے کے جرم میں، ان کا اگلا جنم ناگ کی جون میں ہوا۔ یہ دونوں ناگ دراصل پچھلے جنم کے سادھو ہیں، اس لئے ان کے درشن کرنے سے

منہ مانگی مراد ملتی ہے۔

ہوتے ہوتے ایک بار یہ افواہ پھیل گئی کہ آنے والی اماوس کے روز جب گودھول کی بیلا ہوگی جب گھروں میں چراغ جلنے کا وقت ہوگا، جب دن اور رات ایک دوسرے کے گلے مل رہے ہوں گے، اس وقت دونوں اچھادھاری سانپ اپنی کھوہ سے نکلیں گے اور انسانوں کے جامے میں آکر لوگوں کو درشن دیں گے۔ جو ان کے درشن کریں گے ان کے من کی مراد پوری ہو جائے گی۔ اور اماوس کون سی دور تھی۔ اس دن بعد دوپہر سے ہی اس میدان میں آکر لوگوں کی بھیڑ اکٹھی ہونی شروع ہو گئی۔ اچھادھاری سانپوں کے قریب سے درشن کرنے کے لئے لوگ چبوترے سے کچھ فاصلے پر آکر بیٹھ گئے۔ کئی لوگ تو سانپوں کو پلانے کے لئے اپنے ساتھ برتنوں میں دودھ بھی بھر کر لائے تھے۔ جیسے جیسے گودھول کا وقت قریب آرہا تھا وہاں پل پل بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر بھیڑ اتنی بڑھ گئی کہ کہیں تل دھرنے کو جگہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یہاں تک کہ اس میدان کی طرف آنے والی سڑکوں پر چھوٹے چھوٹے دوکانداروں نے مونگ پھلی، اور پھلوں کے ٹھیلے لاکر کھڑے کر دئے۔ نتیجے کے طور پر جہاں تک نظر جاتی تھی، چاروں طرف یا تو گھروں کی دیواریں دکھائی دیتی تھیں، یا پھر بھیڑ میں اکٹھے ہوئے لوگ۔

اچھادھاری سانپوں کے درشن کرنے کیلئے لوگ اس قدر بے چین ہو رہے تھے کہ ایک بھگت اندھیرا ہونے سے کافی پہلے ہی ایک دیپ جلا کر وہاں رکھ آیا جہاں منتظمین نے برگد کے چبوترے پر ایک چھوٹی سی میز اور دو کرسیاں لاکر رکھ دی تھیں۔

دیئے کے جلتے ہی لوگوں نے سوچا کہ شاید ناگوں کے کھوہ سے نکلنے کا وقت ہو گیا ہے۔ یا کون جانے وہ باہر آبھی گئے ہوں۔ لوگ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اچک اچک کر دیکھنے لگے۔

اتنے میں پرماتما کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ آسمان میں اڑتی ہوئی ایک چیل جس کے پنجے میں ایک مرا ہوا سانپ پھنسا ہوا تھا وہ بھیڑ کے اوپر سے گذری تو چیل کی گرفت ڈھیلی ہونے کی وجہ سے وہ مرا ہوا سانپ بھیڑ کے بیچ گر گیا۔

بس جی۔ سانپ کا گرنا تھا کہ جہاں وہ سانپ گرا تھا، یا جن لوگوں نے آسمان سے سانپ کو گرتے ہوئے دیکھا تھا وہ سب کے سب خوفزدہ ہو کر سانپ سانپ کہتے پیچھے کی طرف بھاگنے کی کوشش کرنے لگے۔

بھگدڑ مچی تو منچ پر انتظام کرنے والے دو بھگت کرسیوں پر چڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کو شانتی بنائے رکھنے کے لئے کہنے لگے۔

لوگوں نے سمجھا کہ کرسیوں پر کھڑے بھگت دراصل اچھادھاری سانپ میں جو ناگ سے انسان بن کر، کرسیوں پر کھڑے ہو کر بھیڑ کو درشن دے رہے ہیں۔

اب ان کے درشن کرنے والے آگے کی طرف دوڑ پڑے۔ آگے کی طرف اور پیچھے کی طرف بھاگنے والے لوگ آپس میں ٹکرائے تو جو لوگ اپنے ساتھ دودھ کے برتن بھر کر لائے تھے، وہ زمین پر لڑھک گئے۔ اس سے کہیں کہیں پھسلن بھی ہو گئی۔ اس طرح اس بھگدڑ میں کئی لوگ دب کر کچل کر مارے گئے۔ بہت سے زخمی ہو گئے۔

جس وقت پولیس والے ٹھیلے والوں کو ہٹا کر لوگوں کے نکلنے کے لئے راستہ صاف کر رہے تھے، تو کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ایک مرے ہوئے سانپ نے یہ مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ اگر زندہ سانپ کھوہ سے نکل کر چبوترے پر رکھی کرسیوں پر آ براجتے تو پتہ نہیں کون سی آفت کھڑی ہو جاتی۔

"داستان"

بات پرانے زمانے کی ہے"

ایک آدمی کو بہت بھوک لگی۔ روٹی کی نہیں۔ پیسے کی۔ اس نے اپنے گھر کے سکھ کو چھوڑا، بیوی بچوں کے ساتھ کو بھولا، اور اپنی بھوک مٹانے کے لئے گھر سے نکل پڑا۔ پردیس میں جاکر وہ مٹی کے ساتھ مٹی ہوا۔ اس کو چھل کپٹ بھی کرنے پڑے، ٹھگی یاری بھی کی، کئی تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے قتل بھی کیے۔ تب کہیں جاکر اس کی بھوک کسی حد تک مٹ پائی۔ اس کے پاس اتنا روپیہ پیسہ آگیا۔ اتنا روپیہ پیسا آگیا کہ اپنے گھر سے جو بڑا سا تھیلا لے کر چلا تھا وہ سارے کا سارا سونے کے سکوں سے بھر گیا۔ اب اس نے ایک گھوڑا خریدا۔ اپنا روپیہ پیسہ اس پر لادا اور خوش خوش گھر کی طرف چل دیا۔

اس کے راستے میں ایک بہت بڑا جنگل پڑتا تھا۔ اس جنگل میں وہ ایک پیڑ کے نیچے آرام کر رہا تھا تو اس پیڑ کی گھنی ٹہنیوں کے بیچ چھپے ہوئے ایک چور نے تاڑ لیا کہ اس آدمی کے پاس بہت پیسہ ہے۔ وہ اس پیسے کو ہتھیانے کی بات سوچنے لگا۔ اس نے سوچا کہ مسافر تھکا ہوا

ہے جب اس کی آنکھ لگ جائے گی تو میں اسے مار کر اس کا پیسہ اور گھوڑا لے کر چل دوں گا۔ مسافر کے سو جانے پر جب وہ پیڑ سے اتر کر اسے مارنے ہی جا رہا تھا تو ایک دوسرے آدمی نے اس کا تلوار والا ہاتھ پکڑ لیا اور قتل کے ارادے سے آئے چور کو اس نے مار دیا۔ اس ہنگامے میں مسافر کی نیند کھل گئی اور اس نے اپنے بچانے والے کا شکریہ ادا کیا۔

اب جان بچانے والے آدمی نے پیسے والے آدمی سے کہا یہ دنیا ایک طرح سے بہت بڑا جنگل ہے۔ اس میں جگہ جگہ ٹھگ، لٹیرے اور چور چھپ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ چلو میں تمہیں اس جنگل کے پار پہنچا دیتا ہوں۔ راستے میں میرا گھر پڑتا ہے۔ تم اگر چاہو تو وہاں کچھ دیر آرام بھی کر سکتے ہو۔

لیکن یہ جب یہ اس کے گھر پہنچا تو بچانے والے کی بیوی نے سوچا۔ میرا آدمی تو مورکھ ہے۔ اس آدمی کی جان بچا کر خوش ہو رہا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ اتنا پیسہ اگر مل جائے تو ہماری زندگی خوشیوں سے بھر جائے گی۔ اس لئے اس نے یہ کیا کہ دودھ کے دو گلاس بھر کر لائی۔ ایک میں اس نے موٹی ملائی ڈالی اور دوسرے میں پتلی۔ موٹی ملائی والا گلاس اس نے اپنے پتی کو دیا اور پتلی والا مسافر کو۔ مسافر کے گلاس میں اس نے زہر ملا دیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مسافر مر جائے گا تو سارا روپیہ ان کے ہاتھ لگ جائے گا۔

اب اس کا پتی کچھ زیادہ ہی شریف آدمی تھا۔ اس نے سوچا میری بیوی سے غلطی ہو گئی۔ اسے موٹی بالائی والا گلاس گھر میں آئے مہمان کو دینا چاہئے تھا اور اس نے گلاس بدل لئے۔

اب مسافر کیا دیکھتا ہے کہ دودھ کے پیتے ہی وہ فرشتہ سیرت انسان جس نے چور سے اس کی جان بچائی تھی وہ وہیں پر گر کر ڈھیر ہو گیا۔ مسافر سمجھ گیا کہ وہ ایک مرتبہ پھر موت کے منہ سے بچ گیا ہے۔

اب وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر آگے چلا۔ چلتا گیا، چلتا گیا، اس کی نیند حرام ہو گئی۔ ہر وقت چوکنا کہ کہیں چور اچکا یا لٹیرا تو اس کا پیچھا نہیں کر رہا۔

آخر اس نے لمبی مسافت طے کر لی۔ منزلیں مارتا چلا گیا۔ پیچھے چھوڑتا چلا گیا اور آخر وہ اپنے گھر پہنچ گیا۔

لیکن گھر پہنچنے سے پہلے اس نے سوچا کہ اسے اپنی بیوی کا امتحان لینا چاہیے۔ وہ سچ مچ اس سے محبت کرتی ہے یا نہیں۔ اس لئے اس نے یہ کیا کہ ایک پھٹا پرانا کرتا پہنا، منہ پر کچھ مٹی مل لی۔ اپنے گھوڑے کو تو اس نے گھر کے باہر نیم کے پیڑ کے نیچے ایک آڑھ میں باندھا اور خود بری سی صورت بنا کر، پھٹے حال بیوی کے سامنے پہنچا۔ پہلے تو بیوی نے اسے پہچانا ہی نہیں لیکن جب اس نے اسے پہچان بھی لیا تو بھی اس نے کوئی آؤ بھگت نہیں کی۔ یہاں تک کہ پانی تک نہ پوچھا۔

یہ آدمی پریشان ہو گیا۔ میں نے یہ روپیہ کماتے ہوئے کیا کیا سپنے دیکھے تھے اور یہاں حال یہ ہے کہ اپنی بیوی بھی مجھے پہچاننے سے انکار کر رہی ہے۔ یہ سوچ کر اس کا من اچاٹ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ عورت اس پیسے کے سکھ بھوگنے کے لائق نہیں ہے۔ اور شاید اس پیسے کے لائق میں بھی نہیں ہوں۔ پیسے کا سکھ تو انسان کو بیوی بچوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

یہی سوچتے سوچتے اس نے اپنا فقیروں والا لبادہ اتارا۔ اور پھر وہی امیری ٹھاٹ والے کپڑے پہن کر جب وہ گھوڑے پر سوار ہونے لگا تو اس کی بیوی نے اسے پہچان لیا۔ وہ افسوس سے ہاتھ ملتی ہوئی دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ لیکن مرد کا دل بجھ چکا تھا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور یہ جا وہ جا ہو گیا۔

اپنے گھر سے باہر آ کر اس نے سوچا کہ اب وہ کیا کرے۔ وہ ایک جگہ کھڑا ہو کر ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ کدھر جائے کہ اتنے میں اس کی نظر کچھ لوگوں پر پڑی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ سب تو چور، ڈاکو اور لٹیرے ہیں۔ وہ سب کے سب اس پر نظریں جمائے ہیں کہ میں کدھر جاتا ہوں۔ شمال جنوب مشرق مغرب، میں جدھر بھی جاؤں گا۔ یہ میرے پیچھے پیچھے آئیں گے۔

یہی سوچ کر کہ اس پیسے کے رہتے ہوئے میری جان کو بھی خطرہ ہے، اس نے سوچا، میں کسی نہ کسی طرح اس پیسے سے نجات پانا چاہوں گا۔

دل ہی دل میں یہی سوچ کر وہ ایک طرف کو ہو لیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، اس کا پیچھا کرنے والے اس کے آس پاس ہی کہیں چلے آ رہے تھے۔ اب وہ کرے تو کیا کرے، اس کی نیند حرام ہو گئی۔

ذرا سا آگے گیا تو اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھے برگد کے نیچے بہت سے سادھو سنیاسی لیٹے ہوئے تھے، شاید سفر کے تھکے تھے۔ اس لئے برگد کا سایہ پا کر وہ گہری نیند میں تھے۔ نیند تو اسے بھی آ رہی تھی۔ اس لمبی مسافت میں اس پیسے کے رہتے ہوئے اسے ایک رات بھی چین کی نیند نہیں آئی تھی۔ اس نے سوچا۔ وقت آ گیا ہے کہ میں اس پیسے سے نجات پاؤں۔ یہ سادھو لوگ ہیں، ان کو پیسہ دوں گا تو دھرم بھی ہو گا۔ یہی سوچ کر اس نے اپنے سارے سونے کے سکے بانٹ کر برابر برابر ہر ایک سادھو کے پاس رکھ دیئے۔ پیسے بانٹ کر اسے بڑا سکھ ملا اور وہیں پر برگد کے نیچے سو گیا۔ اسے بڑی گہری نیند آئی، وہ لمبی تان کر بے فکر ہو کر سویا۔

لیکن ہوا یہ کہ جن سادھوؤں کے پاس اس نے وہ سونے کے سکے رکھ دیئے تھے، گہری نیند ہوتے ہوئے بھی انہیں کچھ برے برے سے ڈراؤنے سپنے آنے شروع ہو گئے اور ان کی نیند میں خلل پڑا اور وہ چونک کر جاگ گئے۔ وہ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے پاس کسی نے سونے کے سکے رکھ دیئے ہیں۔ وہ سمجھ گئے کہ نیند کھلنے کی وجہ کیا تھی۔ ان کے گورو نے مشورہ دیا کہ ہم سنیاسیوں کا اس دھن دولت سے کوئی مطلب نہیں یہ ہمارے کسی کام کے نہیں۔

تبھی ان کی نظر اس آدمی پر پڑی جو روپئے والے تھیلے کو خالی کر کے اسے زمین پر بچھا کر گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو یہ روپیہ اسی آدمی نے ان کے پاس رکھا تھا۔ انہوں نے وہ سارے سکے پھر اسی کے پاس ڈھیر کر دیئے اور وہاں سے جلدی جلدی بھاگ لئے۔

پیسوں کے سکوں کا اس کے پاس ڈھیر لگنا تھا کہ اس کی نیند بھر سے اچاٹ ہو گئی۔

جاگ کر کیا دیکھتا ہے کہ پیسے تو پھر اسی کے پاس واپس آگئے ہیں۔

اب وہ کرے تو کیا کرے۔

تبھی اسے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ضرور لٹیرے ہوں گے وہ مجھے مار دیں گے اور پیسہ چھین لیں گے۔ پیسہ کے چھننے کا اسے افسوس نہیں ہوگا لیکن اس کی جان پر بھی تو بن جائے گی۔

تبھی اسے زمین میں ایک بڑا سا کھڈا دکھائی دیا۔ وہ کھڈا دراصل کسی سانپ کی بل تھی۔ اس نے سارے کے سارے سکے اس کھڈے کے راستے اس بل میں ڈال دئے اور وہاں سے چل دیا۔

سانپ کی بل میں جب بہت سے پیسے پہنچے تو وہ خوشی کے مارے پھول گیا وہ بڑھاپے میں روٹی روزی کا انتظام ہو گیا۔

اب سانپ یہ کرتا ہے کہ ایک سکہ باہر لے آتا ہے اور بل کے پاس ہی رکھ کر کہیں چھپ جاتا ہے جیسے ہی کوئی راہگزر اس کو اٹھانے کی کوشش کرتا ہے تو اسے ڈس لیتا ہے اور اس طرح اس کا دوسروں کو ڈسنے کا شوق پورا ہو جاتا ہے۔

کہنے والے تو کہتے ہیں کہ اب تک سانپ کا ایک بھی پیسہ خرچ نہیں ہوا۔ اسے اپنے خزانے سے دوسرا سکہ نکالنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

اور یہ آدمی جس نے روپے پیسے کی شکل میں مادی دنیا کی موہ مایا چھوڑ دی تھی وہ دنیا کے اسی جنگل میں بڑے چین سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ یگوں بیت گئے۔ وہ اب تک زندہ ہے۔ جیئے جا رہا ہے۔ اس کے سامنے لوگ آتے ہیں۔ سونے کا سکہ اٹھاتے ہیں اور سانپ انھیں ڈس کر دوسری اندھیری دنیا کی طرف روانہ کر دیتا ہے۔

اگر کہیں روشنی ہے تو صرف اسی آدمی کی جھونپڑی کی طرف جس کے دل میں اس سکے کا کوئی لالچ نہیں۔ اور اس سکے پانے والوں کی تو داستان بہت لمبی ہے۔ اگر بیان کرنے لگوں تو کہیں ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔ اس لئے اس داستان کو یہیں پر ختم کرتا ہوں، آپ سکھ سے رہو، یہی دعا کرتا ہوں۔ ☆☆

”ذرا سی بات“

اس ستر سالہ بوڑھی عورت نے جب میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو میرے تصور میں پھولوں سے لدی ہوئی ایک ڈالی جھکی اور میری ہتھیلی پر ایک گلاب کا پھول مہکنے اور مہکنے لگا۔

اس گلاب کے پھول کی کہانی یہ ہے کہ ایک مرتبہ اپنے بچپن میں میں کھیتوں کی طرف جانے والی پانی کی نالی کی منڈیر پر سو رہا تھا۔ جب میری نیند کھلی تو میری ہتھیلی پر گلاب کے پھولوں کی ایک ڈالی رکھی تھی۔ وہ ڈالی کہاں سے آئی؟ کچھ پتہ نہیں، کون رکھ گیا؟ کچھ پتہ نہیں، جب میں نے ڈالی کو اٹھا کر اس پر لگے گلاب کے ایک پھول کو سونگھا تو مجھے احساس ہوا کہ میرے خوابوں کی حسینہ کی مہکتی ہوئی سانسیں ان گلاب کے پھولوں کی خوشبو میں ڈھل کر میرے وجود میں اتر رہی ہیں۔

اب کہاں اس ستر سالہ عورت کا جھریوں بھرا مرجھایا ہوا چہرہ اور کہاں گلاب کے پھولوں سے لدی ہوئی ڈالی۔

اور پھر یہ عورت تو آئی بھی اس وقت تھی، جب ہماری گاڑی چل دی تھی، میں اور میری بیوی، دونوں ریل گاڑی کی کھڑکی کے پاس بیٹھے باہر پلیٹ فارم پر، ہمیں گاڑی پر چڑھانے کے لئے آئے ہوئے کچھ دوستوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ تب یہ عورت آئی اور اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "جی مجھے تو آج ہی پتہ چلا کہ آپ ہمارے شہر میں ایک ہفتہ بھر رہ کر جا رہے ہیں اور میں آپ سے ملنے کے لئے بھاگی چلی آئی"۔ وہ پل پل تیز ہوتی ہوئی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بات کئے جا رہی تھی۔ "مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ اگلے اتوار پھر ادھر سے اسی گاڑی سے ہمارے شہر سے ہو کر نکلیں گے۔ میری خواہش ہے کہ واپسی پر آپ میرے پاس ایک دن ضرور رکیں۔"

پھر اس نے میری بیوی کی طرف دیکھا۔ اپنا ہاتھ اس نے میرے ہاتھ میں ہی رکھا رہنے دیا اور اس سے بولی "سچی بات ہے بہن جی، مجھے آپ کے پتی بہت پسند ہیں۔ آپ ایک عورت کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہیں۔ اور وہ بھی میرے ایسی عورت جس نے ساری عمر شادی نہ کی ہو۔"

گاڑی تیز ہو رہی تھی۔ اس لئے اس نے اپنی بات کو جلدی سے ختم کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو اگلے اتوار میرے ہاں رکنا ہے۔ انکار نہ کیجئے گا۔ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔

اور میں نے اور میری بیوی نے ہامی بھر لی تھی۔

میں نے کھڑکی سے ہاتھ اٹھا کر لاشعوری طور پر سونگھا تو مجھے اپنی ہتھیلی سے گلاب کے پھولوں کی سی خوشبو آ رہی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرے بچپن والی وہی پھولوں کی ڈالی لہراتی ہوئی آئی تھی اور اس ستر سالہ بوڑھی عورت کی کلائی بن کر میری ہتھیلی پر اپنی خوشبو چھوڑ گئی تھی۔

میری بیوی، میرے ہاتھ سونگھنے کی حرکت کو دیکھ کر، میرے دل کی بات من ہی من میں پڑھتی ہوئی پہلے تو مسکراتی رہی، پھر مجھے چھیڑتے ہوئے بولی کہ "کیا یہ گاؤں والی وہی الھڑ انجانی لڑکی ہے جس نے کبھی سوتے ہوئے آپ کے ہاتھ پر گلاب کے پھولوں سے لدی

ڈالی رکھ دی تھی؟"

"کہہ نہیں سکتا؟" میرا جواب تھا۔ "وہ تو خیر نہیں ہاں! ویسی ہی کوئی ہو سکتی ہے اور نہیں بھی۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔

ہفتہ بھر ہمیں اس عورت کی یاد بھی نہ آئی۔ میں اور میری بیوی دونوں اپنے گھریلو کاموں میں ایسے مصروف رہے کہ اس عورت کا نام لینے کی بھی فرصت نہ ملی۔ یوں اس کا نام ہم دونوں کو پتہ نہیں تھا۔ اس نے نام بتایا ہی نہیں تھا۔ وہ تو بس ایک اجنبی کی طرح آئی تھی اور گلاب کے پھول کی خوشبو میری ہتھیلی پر چھوڑ کر غائب ہو گئی تھی۔

ہاں اس بیچ یہ ضرور ہوا کہ جب کبھی ذرا سی فرصت ملتی تو اس عورت کا چہرہ میرے تصور کی آنکھوں کے سامنے پھیل پھیل جاتا۔ جیسے وہ عورت سامنے کھڑی ہو کر مجھ سے کہہ رہی ہو۔ میں ہوں میں ادھر ہوں میری طرف دیکھو، تم مجھے بہت پسند ہو، بہت اچھے لگتے ہو۔"

ایسے موقعوں پر میرا دھیان اس کی طرف گیا دیکھ کر میری بیوی، ہوا میں اپنی کلائی میرے سامنے گھماتی اور پھر کہتی۔ "میرے ستر سالہ پتی دیو، تصور کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آجایئے اور یہ دیکھئے کہ یہ کمبل کیسا رہے گا۔ پسند ہے آپ کو؟"

"ہاں پسند ہے"۔ میں نے کہا۔

"کمبل یا وہ عورت؟"

اور میں ہنس پڑا کمبل پسند ہے بھائی کمبل"

اور وہ کمبل خرید لیا گیا۔

اگلے اتوار جب ہم واپس لوٹنے کے لئے گاڑی میں آکر بیٹھے تو میری بیوی نے گاڑی کے چلتے ہی پہلا سوال یہ کیا کہ چار گھنٹے بعد وہ عورت آپ سے ملنے آئے گی۔ کیا اس کے پاس رکنا ہے؟"

''وعدہ تو کیا ہے ؟''میں نے کہا۔

''وعدہ تو کیا ہے۔ مگر رکنا ہے یا نہیں یہ بتایئے ؟

''خیر اس کا سٹیشن آنے پر دیکھا جائے گا۔ کیا معلوم وہ ہمیں ملنے یا لینے کے لیۓ آتی بھی ہے یا نہیں ؟''میں نے کہا

''اپنی ہتھیلی کو سونگھ کر دیکھو۔ اگر اس میں سے اب بھی گلاب کی خوشبو آرہی ہے تو وہ ضرور آئے گی''

''تو پھر ہم اس کے پاس رکیں گے ضرور''۔ میری بیوی نے جیسے میرے دل کی بات کو اپنے لفظوں میں پورا کر دیا۔

گاڑی کے چلتے ہی میں نے اپنی عادت کے مطابق اپنی سکیچ بک نکالی اور گاڑی سے دکھائی دینے والے خوبصورت مناظر کی تصویر بنانے لگا۔ پھر جیسے میرا دل اس کام میں نہیں لگا۔ اور میں نے دیکھا کہ میں نے یکے بعد دیگرے اسی بوڑھی عورت کے کتنے ہی سکیچ بنا ڈالے تھے۔

''مجھے بڑے انہماک سے سکیچ بناتے ہوئے دیکھ کر میری بیوی بولی۔'' جادو، وہ جو سر چڑھ کر بولے'' یہ تو آپ اسی عورت کی تصویریں بنا رہے ہیں جس سے چند گھنٹے بعد ملاقات ہونے والی ہے۔ وہی جھریوں بھرا چہرہ، وہی سمندر کی نیلاہٹ لئے، نیلی نیلی سی آنکھیں، پانی کی لہروں کی طرح سمٹی ہوئی، بھری ہوئی کچھ ڈھونڈتی ہوئی سی آنکھیں، سر پر روئی کی طرح سفید بال، ماتھے کو اور بھی خوبصورت بناتے ہوئے۔

میں نے بیوی کی بات کی طرف دھیان نہیں دیا اور اس عورت کے یکے بعد دیگرے کتنے ہی سکیچ بنا ڈالے۔ کبھی کسی رخ سے کبھی کسی زاویے سے۔

پھر میرے تصور نے جیسے اس کا چہرہ بدل ڈالا۔

اس کے چہرے سے جھریاں ہٹائیں۔

پھر اس کے سفید بالوں کو کالا کر ڈالا۔

اس طرح اپنے تصور میں، میں نے اس کے جوان چہرے کے کئی سکیچ بنا ڈالے۔ اور انہیں اپنی بیوی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”جوانی میں یہ عورت ایسی ہی ہو گی؟“

”لیکن اس تبدیلی کے باوجود ہر چہرے میں وہی بوڑھی عورت دکھائی دے رہی ہے“ اس نے کہا۔

اور اس جوان شکل کے مل جانے پر وہ اور زیادہ خوبصورت ہو گئی ہے۔ اور زیادہ دلکش لگ رہی ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے لگ رہا ہے جیسے میرے ارد گرد گلاب کے پھول مہک رہے ہوں، مجھے تو لگتا ہے کہ اس عورت کی تصویر والا کاغذ ہی پھول بن کر مہک دے اٹھا ہو۔

اس عورت کا سٹیشن اب آنے والا تھا۔ میری بیوی نے سامان سمیٹنا شروع کر دیا تھا جس انہماک سے میں اس عورت کی تصویر کاغذ پر اتار رہا تھا، اس سے میری بیوی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ جب وہ ہمیں سٹیشن پر لینے کے لئے آئے گی تو میں انکار نہیں کر سکوں گا۔ اور ہمیں اس کے ہاں ٹھہرنے کے لئے اس سٹیشن پر اترنا پڑے گا۔

تبھی میں نے اس عورت کی تصویر میں ایک تبدیلی اور کی، اس کے نچلے ہونٹ کے پاس ٹھوڑی سے ذرا سا اوپر ایک کالا تل بنا دیا۔

اور پھر میں نے دو سکیچ اور بنائے، جن میں اس تل کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا تھا۔

مگر ایسا تل تو اس عورت کے چہرے پر نہیں تھا؟ میری بیوی نے میری بنائی ہوئی تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر یہ تل ہونا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی شکل زیادہ جاذب زیادہ دلکش بنتی ہے“ میرا جواب تھا۔

اس عورت کے سٹیشن پر گاڑی دھیرے دھیرے پلیٹ فارم پر پہنچ رہی تھی۔ ہم دونوں نے اس عورت کو بھی پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ ہمارا استقبال کرنے کے لئے بڑی بے چینی سے ہاتھ ہلا رہی تھی۔

میں نے اپنی سکیچ بک اس عورت کے ہاتھ میں دے دی۔ ''دیکھو، میں نے راستے میں تمہاری کتنی تصویریں بنائی ہیں۔'' میں اسے خوش کرنے کے لئے بتا رہا تھا۔

میری بیوی نے سمٹا ہوا بستر پھر سے کھولنا شروع کر دیا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ چونکہ اس نیلی آنکھوں والی عورت کے نچلے ہونٹ کے نیچے کوئی تل نہیں ہے، اس لئے اس کے ضد کرنے پر بھی میں وہاں نہیں اتروں گا۔

✔

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340123123

حسنین سیالوی : 03056406067

آؤ لاہور چلیں

''سورج کے اگنے کی تمنا کس نے کی تھی۔'' اندھیروں کے حاکم کی آواز گونجی اور چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

اندھیروں کے حاکم کے ہاتھوں میں کوڑا تھا اور آنکھوں میں قہر۔ اس نے ہمارے قریب آتے ہی بازو کو اونچا اٹھا کر کوڑے کو فضا میں لہرایا تو ہوا کے نازک تن بدن پر لہو کے رنگ کی لکیریں کھنچ گئیں۔ ایسا لگا جیسے ایک دو نہیں ایک ساتھ کئی سانپ ہوا میں پھنکار اٹھے ہوں۔

ہم سب سہم گئے۔ سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ جیسے ہم سب کا درد ایکدوسرے کے قریب آنے سے ایک دوسرے کے جسموں میں منتقل ہو کر کم ہو جائے گا۔

اندھیروں کا حاکم ڈراونے جن کی طرح بھاری قدموں سے ٹھک ٹھک کرتا ہوا یوں چل رہا تھا جیسے وہ اپنا ہر اٹھایا ہوا قدم زمین پر نہیں ہمارے سروں پر رکھ کر انہیں کچلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ٹھک، ٹھک۔ آخر وہ ہمارے قریب آکر پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا اس نے

اپنے کوڑے کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ داہنا ہاتھ مٹھی پر اور بایاں کوڑے کے دوسرے سرے پر۔ جیسے اس نے پھن مارتے ہوئے سانپوں کا منہ مضبوطی سے پکڑ رکھا ہو۔ وہ مٹھی ابھی ڈھیلی چھوڑ دے تو ان کی لپلپاتی زبانیں ہمارے جسموں کو چاٹنے لگیں گی اور ان کے زہریلے دانت ہمارے وجود کو لہولہان کر دیں گے۔

وہ قیامت بن کر دو ایک قدم اور آگے بڑھا اور ہم سب کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے کوڑے کو ایک دفعہ پھر زور سے لہرایا۔ اب کی ہوا زخمی ہو کر سی۔ سی۔ کرنے لگی۔

ہم سب کی نظریں جھکی ہوئی تھیں، میں نے ڈری ڈری نگاہوں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اپنے اندر ہمت بٹوری اور کھڑا ہو گیا۔ اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہوں، میری آنکھوں کے آگے کوڑا لہرایا اور میرے ماتھے اور چہرے کو چیرتا ہوا نکل گیا۔

"تو تمہیں سورج چاہئے"؟ ایک اور کوڑا

"تم روشنی مانگتے ہو؟۔ ایک اور کوڑا

"یہ لو سورج"۔ ایک اور کوڑا

اس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔

مجھے پتہ نہیں مجھے کتنا مارا گیا۔ ہاں میرے جسم کا انگ انگ کراہ کر بتا رہا تھا کہ بہت مار پڑی ہے۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میری گردن میں صدیوں سے پڑا ہوا غلامی کا طوق اتار لیا گیا تھا اور اس کی جگہ میرے کندھے پر ایک چوڑا پٹہ لٹک رہا تھا جس پر لال دھاگوں سے ایک سورج بنا ہوا تھا۔

تو اسکا مطلب ہے میری تمنا بر آئی۔

میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو ڈھلک آئے۔ یہ پٹہ اس بات کی سند تھا کہ مجھے میری خواہش کے مطابق میرا سورج لوٹا دیا گیا ہے۔ میں نے نظریں اٹھا کر سامنے افق کی

طرف دیکھا۔ لگتا تھا جیسے پو پھٹنے والی ہے۔ سورج نکلنے والا ہے۔

میں نے اس بات کی بھی پروانہ کی کہ کوڑوں کی مار سے میر انگ انگ درد سے کراہ رہا ہے۔ میں اپنے سارے دکھ درد بھول کر افق کی طرف بھاگ پڑا تاکہ اپنے لئے طلوع ہو رہے سورج کی پہلی کرن کو دیکھوں۔ پہلی کرن جس کی روشنی میں، میں اپنے آپ کو دیکھ سکوں گا۔ اپنے آپ کو پہچان سکوں گا۔

اپنے سورج کی طرف پہلا قدم اٹھاتے ہوئے مجھے وہ لمحہ بڑا متبرک اور مبارک لگا جس وقت میرے دل میں اپنا سورج حاصل کرنے کی تمنا جاگی تھی۔ یہاں تک کہ مجھے وہ کوڑوں کی مار بھی اچھی لگی کیوں کہ اس نے مجھے لہولہان تو کیا مگر مجھے میرے سورج کے قریب لا کر کھڑا کر دیا۔

افق کی طرف بھاگتے ہوئے مجھے لگا کہ میرے ساتھ، میرے آگے، میرے پیچھے بہت سے میرے وہ ساتھی بھی دوڑ رہے تھے جنھوں نے میری طرح اندھیروں کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہتے ہوئے سورج کی تمنا کی تھی۔ فضا میں گونجتی ہوئی ان کی کراہیں ان کی موجودگی کی گواہی دے رہی تھیں۔

میری نظریں سامنے افق پر ٹکی تھیں اور میرے قدموں کے نیچے سورج کی طرف جاتا ہوا راستہ میرے بڑھتے ہوئے ہر قدم کے ساتھ چھوٹا ہوتا جارہا تھا۔ بس چند کھیت، پھر ایک چھوٹی ندی، پھر چھوٹا سا جنگل، پھر بڑی ندی، بس ندی پار کی تو وہ پہاڑی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کی سب سے اونچی چوٹی کے پیچھے سے سورج کو نکلنا ہے۔

ہر قدم کے ساتھ یہ فاصلہ مجھے کم ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں ایک قدم اٹھاتا ہوں تو سورج دو قدم اٹھا کر میرے قریب آئے جارہا ہے۔

میں خوش تھا۔ خوش تھا اور اپنے سورج کی طرف دوڑے جارہا تھا۔

میں نے بل کھاتی پگڈنڈیوں پر دوڑتے ہوئے کھیتوں کو پار کیا۔

میں نے گھٹنوں گھٹنوں پانی والی بستر ندی کو پار کیا۔

میں نے کانٹے دار جھاڑیوں اور جنگلی جانوروں سے بھرے جنگل کو پار کیا۔

پھر میلوں تک ریت پر دوڑنے کے بعد بڑی ندی کو پار کیا جس کی تیز لہریں قدم قدم پر میرے قدموں کو اکھاڑ رہی تھیں۔

آخر میں اس پہاڑی سلسلے پر پہنچا تو مجھے لگا کہ میں اپنی منزل کے بہت قریب آگیا ہوں۔ اس پہاڑی پر چڑھ گیا تو اس کی چوٹی پر کھڑا سورج میرا استقبال کرے گا اور میرے وجود کو اپنی روشنی سے نہلا دے گا۔

میں ہانپتا کانپتا اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا۔ وہاں جاکر پتہ چلا کہ اس پہاڑ سے لگا ہوا ایک اور پہاڑ ہے جو اس پہاڑ سے زیادہ اونچا ہے۔ سورج اس کے پیچھے سے جھانکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

کوئی بات نہیں۔ ایک پہاڑ اور سہی، اپنے سورج تک پہنچنے کے لئے اس پہاڑ پر بھی چڑھوں گا۔ میرے پیچھے ہجوم کی کراہوں کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ یہ آوازیں مجھے طاقت دے رہی تھیں۔ وہ مجھے احساس دلاتی تھیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہمیں بھی تمہاری طرح سورج کی روشنی کی تلاش ہے۔ بڑھے چلو۔ اب فاصلہ ہی کتنا رہ گیا۔ ہم کھیت پار کر آئے، ندی پار کر آئے، جنگل پار کر آئے، دریا پار کر آئے، بس اب تو ایک پہاڑ اور چڑھنا ہے اور پھر ہم سب سورج کے قریب ہوں گے۔ روشنی ہمیں گلے لگا لے گی۔

میں جب دوسرے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو پتہ چلا کہ اس کے پیچھے ایک اور اونچا پہاڑ ہے۔ جس پہاڑ پر میں چڑھا تھا اس سے زیادہ اونچا۔

یا خدا۔ مجھے اور کتنے پہاڑ سر کرنے ہوں گے۔ میں نے اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن میں ابھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ میری ہمت جواب نہیں دے گئی تھی۔ اس لئے میں پہاڑ پر پہاڑ سر کرتا رہا۔

اس طرح جب میری عمر کی کئی صدیاں بیت گئیں اور میں سب سے اونچے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ وہاں کوئی سورج نہیں تھا۔ دوسری طرف بھی ڈھلانوں کا سلسلہ

شروع ہو گیا تھا۔ وہاں اندھیر آسمانوں سے نیچے اتر آیا تھا۔ میلوں لمبی ڈھلان کے بعد ایک بڑا گہرا دریا بل کھاتا، بہہ رہا تھا۔ دریا کے اس پار گھنا جنگل دور دور تک پھیلا تھا۔ وہاں رات اس حد تک نیچے اتر آئی تھی کہ ستارے جنگل کے پیڑوں پر لٹکے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

اس پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیروں کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آگیا۔

میرے پشتینی گاؤں سے دو میل دور ریلوے اسٹیشن تک نہ تو کوئی سڑک تھی اور نہ کوئی سواری۔ صرف ممدو کے پاس دو خچر تھے۔ انہی خچروں پر ممدو "چھٹ" کے دونوں طرف سواریوں کا سامان رکھ کر، دو تین سواریوں کو بھی خچروں پر بٹھا دیتا۔ بوجھ چونکہ اکثر زیادہ ہوتا تھا اس لئے یہ خچر کچھ اڑیل قسم کے ہو گئے تھے۔ چلنے کا نام نہ لیتے۔

یہاں تک کہ اگر ان پر سواری نہ بھی بیٹھی ہو، تب بھی کھڑے ہیں تو پھر کھڑے ہی رہتے۔

ایسے میں ممدو منہ کے اندر ہی زبان گھماتا ہوا ٹک، ٹم، ٹک، ٹرل، ٹک، ٹم، ٹرل، قسم کی آواز نکالتا ہوا چابک لہراتا لیکن خچروں پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ عاجز آکر وہ خچر کے کان میں جا کر کچھ کہتا۔

"گٹ گٹ گامی چسکاپو، چل میرے خچر، چل بھئی تو۔"

یہ سنتے ہی خچر چل پڑتے۔

ممدو کے اس منتر کو پاگل بشیر نے بھی رٹ لیا تھا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ کوئی اسے لاہور دکھا لائے۔ یہاں یہ بتا دوں کہ لاہور ہر پنجابی کے لئے خوشیوں کا منبع ہے، خوشیوں کا مرکز ہے، اس لئے لاہور دیکھنے کی خواہش ہر پنجابی کے دل میں فطری ہے۔ پنجاب میں لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا، وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔

پاگل بشیر کے دل میں بھی زندگی میں واقعی پیدا ہونے کی خواہش تھی۔ اسی لئے وہ لاہور جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس پاگل آدمی کو کون اپنے ساتھ لے کر جائے؟ جب بھی بشیر کا من

اپنے لاہور کی طرف جانے کو کرتا تو وہ کسی لکڑی کے ڈنڈے پر یا دیوار کی منڈیر پر یوں بیٹھ جاتا جیسے کسی عربی گھوڑے پر بیٹھا ہو اور پھر منہ سے بولتا ممدو کا منتر، ''گٹ گٹ گامی چسکا پو، چل بھئی گھوڑے چل بھئی تو۔'' اس کا گھوڑا جب ٹس سے مس نہ ہوتا تو اس پر پاگل پن کا شدید دورہ پڑ جاتا اور وہ گٹ گٹ گامی چسکا پو کی رٹ لگاتا ہوا سارا گاؤں گھومتا رہتا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ بشیر لاکھ دوڑنے کے باوجود گاؤں میں ہی رہ جاتا۔ لاہور کبھی نہ پہنچتا۔ بس یہی حالت ہماری تھی۔

اپنے آپ کو بشیر کی سی مضحکہ خیز حالت میں پا کر مجھے کچھ شرمندگی سی ہوئی۔

اتنے میں وہ لوگ جو میرے پیچھے پیچھے چلے آرہے تھے، ان میں سے چند جو تیز گام تھے، وہ مجھے پہاڑ کی ڈھلان پر تیزی سے اوپر کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔

ان کی آوازیں میرے کانوں میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اونچی آواز میں پکار پکار کر کہہ رہے تھے، ''اپنے کندھے سے ٹنگا ہوا اس جھوٹے سورج کا پٹہ اتار دو۔''

پہلے تو میں سمجھا ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ تبھی ایک نوجوان میرے پاس پہنچ گیا اور جلدی سے میرے کندھے پر ٹنگے اس پٹے کو اتار کر نیچے گہری کھائی میں پھینک دیا۔ جب تک یہ جھوٹا سورج ہمارے وجود سے چپکا رہے گا تب تک ہمارے لئے اصلی سورج طلوع ہی نہیں ہو سکتا۔''

اس پٹے کے اترتے ہی میں نے ایسی راحت محسوس کی، جیسی غلامی کا طوق گلے سے اتر جانے پر محسوس کی تھی۔

اب ہم سورج لے کر ہی لوٹیں گے تاکہ اپنے اندھیرے گھروں کو روشن کر سکیں۔ میرے من میں خواہش ابھری اور میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا ''آؤ لاہور چلیں''

اور ہم سب نے مل کر پہلا قدم اٹھا دیا ہے

✓

''نیا سویرا''

بات ہزاروں سال پہلے کی۔ نگری اجین کی۔ راج بکرمادِت کا۔ ایک دن راجہ شکار کو گیا۔ آگے آگے راجہ جاتا تھا۔ پیچھے پیچھے اس کا لاؤ لشکر آتا تھا۔ اتنے میں ایک ہرنی ایک جھاڑی کی آڑ سے نکلی اور راجہ کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور راجہ کا راستہ روک کر بولی :۔

''اے بکرمادت، تو اتر کی طرف شکار کرنے مت جا، ادھر میرے چھوٹے چھوٹے ہرنوٹے کھیلتے ہیں۔ تمہارے لاؤ لشکر کے گھوڑوں کے نیچے دب کر مر جائیں گے۔

راجہ گھوڑے پر بیٹھا بیٹھا دل ہی دل میں کچھ سوچنے لگا۔

''راجہ نے کیا سوچا؟ راجہ نے کیا کیا؟'' ایک بچے نے نانی کو روک کر جلدی سے جاننا چاہا۔

نانی کہانی سناتے سناتے رک گئی۔ یہ نانی ہمالیہ کی ترائی میں بسے ایک ایسے چھوٹے سے گاؤں میں بچوں کو کہانی سنا رہی تھی جو آج کل چاروں طرف سے گھنے جنگل سے گھرا ہوا ہے اور جہاں آج کی سبھیتا کی روشنی تو کیا، سورج کی روشنی بھی بڑی مشکل سے گاؤں میں داخل

ہو پاتی ہے۔ وہاں ہرنوں اور خرگوشوں کے بچوں کے ساتھ ساتھ شیروں اور چیتوں کے بچے بھی جنگل میں گھومتے گھومتے اس گاؤں کی طرف آنکلتے ہیں۔ اور اگر وہ دو چار دن نہ آیا ئیں تو اس گاؤں کے بچے ان کے ساتھ کھیلنے کے لئے جنگل کے اندر بہت دور تک چلے جاتے ہیں۔ اسلئے بچوں کے دل میں ہرنی کے بچوں ے لئے فکر مند ہو جانا قدرتی بات تھی۔

نانی نے گلا صاف کیا۔ سب بچوں کے فکر مند چہروں کی طرف دیکھا اور پھر بولی۔

"راجہ نے وہی کیا جو تم لوگ چاہتے ہو یعنی بحرمادت نے ہرنی کی بات مان لی اور وہ شکار کرنے کے لئے اتر کے بجائے پورب کی طرف چل دیا۔

راجہ نے بہت اچھا کیا" ایک بچہ بولا۔

لیکن ابھی راجہ پورب کی طرف تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک ننھی سی بیر بہٹی نے راجہ کا راستہ روک لیا۔ چھوٹی سی لال رنگ کی ننھی بیر بہٹی اپنا ننھا سا سر زمین سے اٹھا کر راجہ کو کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب راجہ تو گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا تھا۔ ننھی سی بیر بہٹی کی پتلی سی آواز راجہ تک کیسے پہنچے۔ اس لئے راجہ گھوڑے سے اترا۔ بیر بہٹی کو بڑی نرمی سے اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور پوچھا۔

"بتاؤ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

بیر بہٹی بولی "اے راجن، تم آج پورب کی طرف شکار کرنے نہ جاؤ۔ پچھلی رات اس طرف بڑی بارش ہوئی ہے۔ بارش ہوئی تو دھرتی نم ہو گئی۔ دھرتی نم ہو گئی تو میری نسل کی بہت سی بیر بہٹیاں پیدا ہو کر آج پورب کی دھرتی پر گھوم رہی ہیں۔ اب اگر تم ادھر شکار کرنے گئے تو.......

"میں سمجھ گیا۔ بحرمادت بولا۔ ہم پورب کی طرف نہیں جائیں گے۔ تم بیر بہٹیوں سے کہہ دو کہ وہ بے فکر ہو کر دھرتی کی سیر کریں۔

اور راجہ پورب کی بجائے دکھن کی طرف شکار کرنے کے لئے چل پڑا۔

پھر کیا ہوا؟ ایک بچے نے نانی سے پوچھا۔ بلکہ نانی کی کہانی کو یونہی آگے بڑھاتے

ہوئے بولا۔ دکھن کی طرف جاتے ہوئے بھی کسی نے راجہ کو اس طرف جانے سے روک دیا ہوگا۔

ہاں نانی بولی۔ تم نے ٹھیک سوچا۔

اور پچھم کی طرف بھی

ہاں اس دن راجہ نہ دکھن کی طرف جا سکا نہ کسی اور طرف۔

ادھر راجہ کا راستہ کس نے روکا۔

ایک طرف تو خرگوش نے روکا۔ اس نے راجہ سے کہا کہ آج ان کا شکار کرنے والے چیتوں کا جھنڈ دوسری طرف گیا تھا۔ اس لئے زیادہ تر خرگوش اس طرف چرنے کے لئے گئے ہیں اور اگر راجہ ادھر گیا تو بہت سے خرگوش گھوڑوں تلے آکر مارے جائیں گے۔ دوسری طرف راجہ گیا تو ادھر ایک ندی پڑتی تھی جب راجہ ندی کے پاٹ میں اترنے لگا تو کچھوؤں کے سردار نے کہا اے راجن آج کل کچھوؤں نے جگہ جگہ ریت میں انڈے دے رکھے ہیں اور اگر...

اس طرح اس دن راجہ بجر مادت کسی طرف بھی شکار کو نہ جا سکے اور خالی ہاتھ اپنی اجین نگری میں لوٹ آئے۔ لیکن نگری میں لوٹنے پر ایک عجیب و غریب بات ہوگئی۔

وہ کیا نانی جلدی بتاؤ

میں بتاتا ہوں۔ ایک بچے نے کہا۔ جب راجہ شکار سے خالی ہاتھ لوٹا تو رانی نے اس کا مذاق اڑایا ہوگا۔

نہیں۔ رانی نے کچھ نہیں کہا۔

تو پھر جنتا میں سے کسی نے دھوبی بن کر کہا ہوگا کہ.....

نہیں بھائی۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ تم لوگ دھیان سے سنو۔ بڑی دلچسپ بات ہے۔

ہاں بتاؤ نانی بتاؤ۔ کیا بات ہوئی۔

ہوا یہ کہ جب راجہ دربار میں جا کر اپنے تخت پر بیٹھا تو اس کے تخت پر جڑی اک پُتلی بول پڑی

'پُتلی بول پڑی ؟ پُتلی کیسے بول سکتی ہے ؟' ایک بچے نے سوال کیا۔

'اور وہ پُتلی آئی کہاں سے تھی' ، دوسرا بچہ سوال کر رہا تھا۔

نانی رک گئی۔ اس نے سب بچوں کی طرف دیکھا۔ سب کے چہروں پر یہاں تک کہ گونگی لڑکی کے چہرے پر بھی یہ جگیاسا بنی ہوئی تھی کہ پُتلی آئی کہاں سے اور وہ بولی کیسے ؟

یہ سونے کی پُتلی کی کہانی الگ ہے۔ بلکہ یہ ایک پُتلی کی نہیں بتیس پُتلیوں کی کہانی ہے اچھا تو یہ کہانی بیچ میں چھوڑ کر پہلے میں تم کو ان پُتلیوں کی کہانی سناتی ہوں۔

ہاں ، سناؤ نانی۔ سب بچوں نے ایک ساتھ کہا۔ ہمیں پُتلیوں کی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔

ان میں سے ایک دو بچے تو پُتلیوں کی طرح سر بھی ہلانے لگے

''ہاں تو ہوا یہ کہ جب راجہ بحرمادت تخت پر بیٹھا تو پہلے ہی دن ایک کلاکار نے راجہ کو سونے کی بتیس پُتلیاں لا کر پیش کیں اور کہا کہ اے راجن یہ پُتلیاں تمہارے دیش کی جنتا کی طرف سے تحفے کے طور پر دی جاتی ہیں۔

راجہ بحرمادت ان پُتلیوں کی خوبصورتی دیکھ کر اس حد تک خوش ہوا کہ اس نے حکم دیا کہ ان پُتلیوں کو تخت کے چاروں طرف جڑ دیا جائے۔

یہ سن کر اس کلاکار نے کہا'' ویسے بھی ان پُتلیوں کی جگہ آپ کے تخت پر ہی ہے۔ یہ پُتلیاں آپ کو یاد دلاتی رہیں گی کہ اپنی پرجا کے لئے آپ کی کیا ذمے داری ہے۔ کیونکہ یہ پُتلیاں دراصل آپ کی رعایا کی آشاؤں ، امیدوں اور خواہشوں کی پرتیک ہیں۔ تمہارے شاشن کال میں جیسے جیسے یہ آشائیں پوری ہوتی جائیں گی ویسے ویسے ان پُتلیوں کو وانی ملتی جائے گی اور اگر یہ پوری نہ ہوئیں تو یہ پُتلیاں گونگی کی گونگی ہی رہیں گی۔

'' میری بہن کی طرح گونگی ، ایک بچے نے اپنی گونگی بہن کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے کہا جو اچنبھے سے بھری اس کہانی کو بڑے دھیان سے سن رہی تھی۔

''بیچ میں ٹوکو مت۔ مجھے کہانی سنانے دو نانی نے اس بچے کی طرف دیکھا اور پرانی کہانی کو پھر سے شروع کرتے ہوئے بولی :۔

ہاں تو اس دن جس دن راجہ چاروں دشاؤں میں کسی طرف بھی شکار کو نہیں جا سکا تھا۔ اس دن جب وہ دربار میں واپس آیا تو اسکے تخت سے جڑی پہلی پتلی کو آواز مل گئی اور اس نے راجہ بکرمادت سے کہا۔'' اے راجن جس طرح تم نے اپنے راجیہ کے چھوٹے چھوٹے جیو جنتوؤں کی بات مان کر ان کی حفاظت کی ہے۔ اس کی کہانی میں تمہارے دیش کی آنے والی نسلوں کو ہمیشہ سناتی رہوں گی۔

ایسا کہا جاتا ہے کہ راجہ بکرمادت نے اپنے راج کے پہلے پچاس سالوں میں ہی اپنے دیش کی جنتا کی اتنی سیوا کی، اتنی سیوا کی کہ اسکے تخت سے لگی بتیس کی بتیس پتلیوں کو وانی مل گئی اور وہ اس کے گنوں کی گاتھا گانے کے لئے مجبور ہو اٹھیں۔

''اور وہ پتلیاں آج بھی بکرمادت کے گنوں کا گان کرتی ہیں۔'' ایک بچہ اونچی آواز میں نانی کی کہانی کو پورا کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

نانی اب بھی تو ہمارے دیش میں آزادی آئے پچاس سال پورے ہو رہے ہیں تو کیا اب میری گونگی بہن کو بھی وانی مل جائے گی؟ کیا وہ بولنے لگے گی؟

''بولنے لگے گی۔ ضرور بولنے لگے گی''

نانی کی یہ بات سنتے ہی سب بچے تالیاں بجاتے، ناچتے، کودتے اٹھ کر باہر کی طرف چل دئے جہاں ہرنیوں کے ہرنوٹے اور دوسرے جنگلی جانوروں کے بچے کھیلنے کیلئے ان کا انتظار کر رہے تھے۔

باہر ٹھنڈی میٹھی تازہ ہوا چل رہی تھی۔ پیڑوں کے گھنے پتوں سے چھن کر روشنی ان راہوں پر بکھر رہی تھی، جن پر دیش کی نئی نسل کے بچے چل رہے تھے۔ پیڑ ان بچوں پر رنگ برنگے پھولوں کی بارش کر رہے تھے۔

ایک رات ختم ہوئی تھی۔ ایک نیا سویرا انگڑائی لے کر جاگ رہا تھا۔ ☆☆

بیتے وقت کی ایک کہانی

مجھے ایسے لگا جیسے وقت نے تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑنا شروع کر دیا ہے۔ اور میرا جسم پیچھے کی طرف چلتا جا رہا ہے۔

تلسی، نانک، کبیر کے زمانے کا تو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ آنکھ جھپکتے میں کب پیچھے رہ گیا۔ حضرت محمدؐ، عیسیٰ، بدھ، مہاویر کا دور بھی ایسے ہی پیچھے چھوٹ گیا میں نے محسوس کیا کہ اندھیروں کی پرتوں کو چیرتے ہوئے جیسے جیسے میں پیچھے ہی پیچھے جا رہا ہوں۔ ویسے ویسے اندھیرا اور گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اندھیرے کے گہرے سمندر میں اترتا چلا جا رہا ہوں اور وقت ہے کہ تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑتا چلا جا رہا ہے۔ پھر کرشن اور ارم کے یگ بھی پیچھے رہ گئے۔ یہاں تک کہ ویدوں کا زمانہ بھی کب کا پیچھے رہ گیا اور وقت ہے کہ الٹی چرخی کی طرح پیچھے کی طرف دوڑتا ہی چلا جا رہا تھا۔

اور اندھیرا تھا کہ اس کی کوئی تھاہ نہیں تھی۔

جیسے آپ سمندر کی لہروں کو چلتے پھرتے دوڑتے، ٹھاٹھیں مارتے دیکھ سکتے ہیں،

ایسے ہی میں بھی اندھیروں کی پرتوں کو محسوس کر سکتا تھا اور تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگتا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کتنی دیر ہوتا رہا۔ شاید سالوں تک، شاید صدیوں تک اور پھر جیسے میری آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا چھٹنا شروع ہو گیا۔

میں ایک گھنے جنگل میں کھڑا تھا۔ اے پرماتما میں کس زمانے میں اور دنیا کے کس حصے میں پہنچ گیا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میرے ارد گرد پکشی چہچہا رہے تھے۔ طرح طرح کے جنگلی جانوروں کی آوازیں میرے کانوں میں پہنچ رہی تھیں مگر آدمی کسی آدمی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ زمین کنواری، جنگل کنوارے، ہوا بنسپتی کی خوشبو سے لدی ہوئی، پانی امرت کی طرح صاف شفاف، جھرنے جیسے ہر لمحے نت نئے گیتوں کو جنم دے رہے تھے۔ آسمان اپنی تمام نیلاہٹ کے ساتھ خوبصورت ہو رہا تھا۔

ایسے میں مجھے ایک آدمی کی آواز سنائی دی۔

مجھے لگا جیسے میرے کانوں میں الہام ہو رہا ہو۔ میں اس کی آواز کی طرف چل دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی پیڑ کے اوپر سے نیچے اتر رہا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک لڑکا بھی اتر رہا تھا۔ لڑکا جو بچپن کی حدوں کو چھوڑ کر جوانی کی حدوں میں قدم رکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر داڑھی ابھی نہیں آئی تھی لیکن مس پھوٹ رہی تھیں۔

وہ جب پیڑ سے نیچے اتر آئے تو ایک عورت نے ایک بڑا سا تیر کمان اور ترکش پیڑ سے اتار کر آدمی کو تھمایا اور پھر ذرا چھوٹا تیر کمان لڑکے کو دیا۔ چھوٹے والے تیر کمان کے دونوں طرف آم کے پتے اور کچھ پھول بندھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا جیسے لڑکا پہلی دفعہ شکار کرنے جا رہا ہے اس لئے یہ اہتمام کیا گیا ہے۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ عورت نے چلتے وقت مسکراتے ہوئے لڑکے کی طرف بازو لہرایا۔ جیسے اسے اپنا آشیرواد دے رہی ہو۔ اور آدمی نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا کہ "میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ اور جو کچھ میں کروں وہی تم کرنا۔"

آدمی نے دبے پاؤں چلنا شروع کیا تو لڑکے نے بھی دبے پاؤں چلنا شروع کر دیا۔ آدمی چوکنا سا بار بار ادھر ادھر گردن گھماتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور لڑکا اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

تھوڑے فاصلے پر ہرنوں کا جھنڈ دیکھ کر آدمی نے لڑکے کو اشارہ کیا کہ وہ فلاں ہرن پر نشانہ باندھ کر تیر چلائے۔

لڑکے نے تیر چلایا۔ مگر وہ نشانے پر نہیں بیٹھا۔

ایک تیر، دوسرا تیر، آدمی کے کہنے پر لڑکا تیر پر تیر چلاتا چلا گیا مگر کوئی بھی تیر نشانے پر نہ بیٹھا۔ آدمی ایک طرف کھڑا یہ سب دیکھتا رہا۔ جب لڑکے نے مایوسی کے ساتھ آدمی کی طرف دیکھا تو آدمی گمبھیر ہو گیا اور بولا۔ "ہرن بڑا سیانا جانور ہے۔ اس کا شکار اتنی آسانی سے نہیں ہوتا۔ اسے اپنے تیر کا نشانہ بنانے کے لئے ہرن کی کسی کمزوری کو دھیان میں رکھنا پڑتا ہے۔"

"کیسی کمزوری" لڑکے نے پوچھا۔

"دیکھو ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی ہرن کو کوئی ہرنی اچھی لگتی ہے تو اسے اس کے جسم سے بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔ اور جیسے جیسے یہ خوشبو اس کے حواس پر چھا جاتی ہے ویسے ویسے ہرن اپنی سدھ بدھ کھوتا جاتا ہے۔ تب اسے اپنا آپ دکھائی نہیں دیتا تب اسے ہرنی ہی ہرنی دکھائی دیتی ہے اور جدھر وہ ہرنی جاتی ہے ادھر وہ ہرن کھنچا ہوا چلا جاتا ہے اور ہرنی اگر کہیں کھڑی ہو جائے تو ہرن بھی کھڑا ہو جاتا ہے اور جب ہرن کھڑا ہو کر پیار بھری نظروں سے ہرنی کو دیکھ رہا ہوتا ہے یا آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا ہے تب اسے نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ کوئی شکاری اس کا پیچھا کر رہا ہے، نہ اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی جان کو کوئی خطرہ ہے۔ یہی موقع ہوتا ہے کہ جب ہرن کو تیر کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔

یہ کہتے ہوئے آدمی نے ایک ہرن کا پیچھا کیا۔ لڑکا بھی آدمی کے پیچھے بھاگا چلا آرہا تھا۔ وہی ہوا جو آدمی نے بتایا تھا۔ ہرن واقعی کسی ہرنی کے جسم کی خوشبو میں قید ہو کر آگے بڑھ رہا تھا۔ یکایک ہرنی کہیں رکی اور پھر ہرن بھی کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا اور تبھی لڑکے نے دیکھا کہ آدمی کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا اور دوسرے ہی لمحے ہرن زمین پر تڑپ رہا تھا۔

"لیکن آپ کو اس خوشبو کی پہچان کیسے ہوتی ہے؟" لڑکے نے آدمی سے اس وقت

پوچھا جب وہ مرتے ہوئے ہرن کے پیٹ سے اپنا تیر نکال رہا تھا۔

"اس کا احساس تمہیں خود بخود ہو جائے گا"

آدمی لڑکے کے نوجوان چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور اسنے دور پیڑ کے نیچے کھڑی اس لڑکی کی طرف دیکھا جو ان دنوں اس لڑکے کے گرد منڈلاتی رہتی تھی۔ جس طرف وہ لڑکا جاتا اسی طرف وہ لڑکی جنگل کا پتہ پتہ چھانا کرتی تھی۔

لڑکے نے دور سے لڑکی کو دیکھا تو شکار کی بات بھول کر اپنے ہاتھوں میں تیر کمان لئے وہ اس لڑکی کی طرف بھاگتا چلا گیا۔

لڑکی ٹوٹی ہوئی بیل کی طرح اس کی بانہوں میں آکر سمٹ گئی۔

وہ اس سے الگ ہوا تو اسے لگا جیسے اسے اس لڑکی کے جسم سے بھینی بھینی سی خوشبو آرہی تھی۔ یہ خوشبو اسے اس وقت بھی آتی رہی جب وہ کسی پیڑ پر چڑھ کر پھل توڑ کر نیچے پھینک رہا تھا اور لڑکی ان پھلوں کو اکٹھا کرتی جارہی تھی۔ یہ خوشبو اس لڑکے کو اس وقت بھی آرہی تھی جب وہ دونوں پاس ہی ندی کے پانی میں جاکر نہانے لگے۔ لڑکے نے محسوس کیا جیسے ندی کا سارا پانی ہی خوشبودار ہو گیا ہو۔

ندی کے پانی سے نہا کر وہ باہر نکلا تو یہ خوشبو اسے اس وقت بھی آرہی تھی جب وہ لڑکا اور لڑکی مل کر تھوڑی دیر پہلے توڑے پھل کھا رہے تھے۔

لڑکا اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

لڑکی اسے آوازیں ہی دیتی رہ گئی۔

لڑکا ہاتھ میں تیر کمان لئے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ اس نے پاس ہی کہیں ہرنوں کے جھنڈ کو دیکھ لیا تھا۔ لڑکا بھاگا جارہا تھا اور لڑکی کی خوشبو جیسے قدم قدم پر اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ لڑکے پر ایک سرور سا چھایا ہوا تھا۔

جب وہ ہرنوں کے جھنڈ کے پاس پہونچا تو اس نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ کون سے ہرن کو کس ہرنی کی خوشبو آرہی ہے اور یہ جاننے میں اسے دیر نہ لگی۔ واقعی ایک ہرن

مست سا ہو کر ادھر ہی جا رہا تھا جدھر ہرنی جاتی تھی۔ جدھر ہرنی مڑتی ادھر ہی ہرن بھی مڑ جاتا۔

اس نے محسوس کیا کہ لڑکی کی خوشبو اب تک اس کے نتھنوں میں پہنچ رہی تھی۔ تبھی ہوا کا ایک جھونکا ادھر سے آیا جس طرف ہرنی کلانچیں بھرتی جا رہی تھی اور اسے لگا جیسے ہرنی کی خوشبو اور لڑکی کی خوشبو ایک سی ہی ہے۔ وہی بند کلیوں کی سی مہک جو اس کے وجود پر اب بھی چھائی جا رہی تھی۔

اچانک کلانچیں بھرتی ہرنی کھڑی ہو گئی۔ ایسے جیسے وہ لڑکی پیڑ کے نیچے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

تبھی ہرن کھڑا ہو گیا اور دھیمے دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے اپنی ہرنی کی طرف بڑھنے لگا۔

لڑکا تیر کمان لے کر ہرن کو اپنے نشانے میں باندھ رہا تھا۔ اس کے دونوں بازو حرکت میں تھے۔ ہرن اس کے نشانے میں آ گیا۔ اس نے تیر کو کھینچ کر نشانہ باندھ لیا۔

اور پھر تیر چلائے بغیر اس کی کمان نیچے آ گئی۔

''تیر چلایا کیوں نہیں؟'' لڑکی دوڑتی ہانپتی اس کے پاس آ کر اس سے پوچھ رہی تھی۔

''دھت پیار کرنے والوں کو کہیں کوئی تیر مارتا ہے'' یہ الفاظ لڑکے کے منہ سے نکلے اور ہوا نے ان لفظوں کی خوشبو کو دھرتی کے کونے کونے پر پہنچا دیا۔ آسمان کی نیلاہٹوں میں پھیلا دیا۔ وقت نے ان الفاظ کو الہام کے طور پر لیا تو جیسے اندھیرے دور میں روشنی سی جگمگا اٹھی۔

اس روشنی کو لے کر وقت کے تمام اندھیروں کو چیرتا ہوا میں واپس آج کے یگ میں آ تو گیا ہوں لیکن کوئی بتائے کہ میں اسے کہاں رکھوں تاکہ اس روشنی سے لوگوں کے دل جگمگا اٹھیں۔

✔

پیار کا ہار

ہزاروں سال پرانی گپھاؤں میں مورتیوں کو دیکھتی ہوئی وہ عورت مرد کو پہلی ہی نظر میں بھا گئی تھی اور عورت نے بھی اپنے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ لئے مرد کی طرف یوں دیکھا تھا جیسے وہ اسکے لئے اپنی چاہت کا اظہار کر رہی ہو۔

''آپ تو گپھاؤں کی ان مورتیوں کی طرح خوبصورت ہیں۔'' اس کے سڈول جسم کے زیر و بم میں کھو کر مرد نے کہا تھا۔

''اور تم بھی مردانہ حسن کا لاجواب شاہکار''

یہ کہتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گپھا کی کسی مورتی کو دیکھنے لگے۔

یوں وہ دو اجنبی پہلی بار ایسے ملے تھے، جیسے صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

پھر یہ ہوا کہ ایک جگہ رک کر جب عورت کسی مورتی کی خوبصورتی کو غور سے دیکھ رہی تھی تو مرد کی نظریں مورتیوں کے بجائے عورت کے حسن میں کھو گئیں۔ اس کی

چھاتیوں کا ابھار معمول سے کچھ زیادہ تھا۔ وہ سانس لیتی تو ایسا لگتا جیسے اس کے وجود کی گرمی اور نرمی مرد کے جسم میں تحلیل ہونے کے لئے بے چین ہو رہی ہو۔ کاجل کی دھار سے گھری اس کی آنکھیں مرد کے وجود کو بیندھتی سی لگتی تھیں۔ اور لمبی متوازن ناک کے نیچے لال لال ہونٹ جب ذرا سے کھلتے تو ناک اور ٹھڈی کے درمیان کا حصہ کھلے ہوئے گلاب کی شکل اختیار کر لیتا۔ اس گلاب کو دیکھ دیکھ کر مرد کا جی نہیں بھر رہا تھا۔

مرد کو اپنی طرف غور سے دیکھتا ہوا پا کر عورت ایک بار پھر مسکرائی۔ "مورتیاں دیوار پر ہیں جناب۔ یہاں گپھا کے گلیارے میں نہیں۔"

مجھے تو کچھ ایسے ہی لگتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے مرد نے عورت کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تو اسے ایسا لگا جیسے وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح اس کے ساتھ سمٹتی چلی جا رہی ہو۔

اس طرح کبھی ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، کبھی ایک دوسرے کی کمر میں بانہیں ڈالے، وہ بہت دیر تک گپھاؤں میں مورتیوں کو دیکھتے رہے۔ لیکن وہ مورتیوں کو کم اور ایک دوسرے کو زیادہ دیکھ رہے تھے۔

پھر انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کب گپھاؤں کے باہر آ گئے۔

گپھاؤں سے باہر آ کر وہ زمین پر دور دور تک پھیلے زندگی کے حسن میں کھو گئے۔

تازہ ہوا کے نرم جھونکے انہیں نئی بہار کی آمد کا پیغام دے رہے تھے۔

بونے کے لئے تیار کئے گئے کھیتوں کی میدے کی طرح نرم مٹی میں چلتے ہوئے جب وہ مٹی دھول کی طرح اڑ کر ان کے وجود سے چمٹتی تو انہیں لگتا جیسے دھرتی کا کن کن انہیں پیار کر رہا ہو۔

وہ ان راستوں پر پہلی بار چل رہے تھے، لیکن انہیں ہر پگڈنڈی جانی پہچانی لگی اور ہر راستہ اپنا اپنا۔

نرم مخملی گھاس پر چلتے ہوئے انہوں نے اس نرمی کو اپنے تلووں میں محسوس کیا اور پیڑوں کے سوکھے پتوں پر چلتے ہوئے ان کی کھڑ کھڑاہٹ ان کے کانوں کو سنگیت کا سا

لطف دے گئی۔

پیڑوں کے نیچے سے گذرتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ پیڑوں کی شاخیں جھک جھک کر ان پر اپنے رنگ برنگے پھولوں کی بارش کر رہی تھیں اور وہ پھول ان کے قدموں کے نیچے بچھ بچھ جا رہے تھے۔

باغ کے ایک کونے میں بیٹھ کر اپنے ارد گرد اونچے اونچے پیڑوں اور پیڑوں پر بھانت بھانت کے پنچھیوں کو چہچہاتے دیکھ کر انہیں لگا جیسے وہ خود بھی قدرت کے اس منظر کا حصہ ہوں۔ وہ پیڑ بھی ہو سکتے تھے اور پیڑوں پر بیٹھے ہوئے پنچھی بھی۔ اپنے قریب اگے ہوئے پودوں کی طرح وہ زندگی کے کوئی پودے بھی ہو سکتے تھے یا ان پودوں پر لگے ہوئے کوئی بھی دو پھول۔

"ہم کون سا پیڑ ہیں؟" مرد جیسے جانتا تھا کہ عورت وہی کچھ سوچ رہی ہے، جو وہ سوچ رہا ہے۔

عورت نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور اس پیڑ کی طرف اشارہ کیا جس کی جڑیں دو تھیں لیکن جس کے تنے ایک دوسرے میں اس طرح سما گئے تھے کہ انہیں الگ الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

"ہم کون سے پنچھی ہیں؟" عورت نے مرد سے سوال کیا۔

"وہ جو اس گھونسلے میں بیٹھے ایک دوسرے کی چونچوں سے چونچ لڑا رہے ہیں۔"

مرد نے اپنی ناک عورت کی ناک سے رگڑتے ہوئے جواب دیا۔

"ہم کون سے پودے ہیں؟"

"وہ گلاب اور کلیوں کے پودے جن کی شاخیں اس طرح گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون سے پودے کی حد کہاں تک ہے؟"

"ہم کون سے پھول ہیں؟"

"وہ گلاب اور کلی جو ایک دوسرے کو چھوتے ہوئے اپنی خوشبوئیں ایک دوسرے

پر نچھاور کر رہے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اس گلاب اور کلی کی طرح ہی آپس میں بغل گیر ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد مرد نے دیکھا کہ عورت پنچھیوں کے اس گھونسلے کی طرف دیکھ رہی تھی، جس میں تھوڑی دیر پہلے انہوں نے نر اور مادہ پنچھیوں کو آپس میں چونچیں لڑاتے ہوئے دیکھا تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" مرد نے عورت سے پوچھا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ اندھیرا اپھیل رہا ہے۔۔۔۔اور"۔

"اور اب ہمیں اپنے لئے گھونسلہ تلاش کرنا چاہئے۔" مرد نے عورت کے ادھورے جملے کو پورا کیا۔

عورت نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

مرد نے اس نقطے پر نظریں جما دیں جہاں زمین اور آسمان آپس میں مل رہے تھے جیسے ان کا گھونسلہ وہیں کہیں ہو۔

"تو چلیں؟" عورت نے سوالیہ نظروں سے مرد کی طرف دیکھا۔

مرد نے ایک مرتبہ پھر عورت کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی لال لال کرنیں پیڑوں کے پتوں سے چھن چھن کر سیدھی عورت کے چہرے پر پڑتی ہوئی اسے لافانی حسن عطا کر رہی تھیں۔ ارد گرد کی بھینی بھینی خوشبو اس کی سانسوں میں رچ بس رہی تھی۔ مرد کی آغوش کی گرمی اس کے وجود پر نشہ سا طاری کیے دے رہی تھی۔ اس کیفیت میں عورت کی آنکھیں خود بخود مند گئیں۔ اور اس حسن کا نظارہ کرنے کیلئے مرد کا سارا وجود آنکھیں بن گیا۔ وہ اسے آنکھوں سے بھی دیکھ رہا تھا اور ہونٹوں سے بھی اور ہاتھوں سے بھی دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم کا انگ انگ عورت کے ایک ایک انگ کے حسن کو دیکھ رہا تھا اور سر شار ہو رہا تھا۔

پتہ نہیں اس کیفیت میں وہ کب تک کھوئے رہے۔

آخر عورت جیسے سوئی سوئی سی جاگ گئی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

''اس سے پہلے کہ ہم آگے کی منزل کی طرف قدم بڑھائیں میں تمہیں اپنے بارے میں ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔ ایک حقیقت سے واقف کرانا چاہتی ہوں۔''

مرد کا سارا وجود کان بن کر عورت کی بات سننے کے لئے تیار ہو گیا۔

عورت نے کہنا شروع کیا۔

''میں بچپن سے ہی سپنوں کی سوداگر تھی۔ میرے باپ کے گھر میں ایک بڑا ہی خوبصورت سا باغیچہ تھا۔ اس باغیچے میں بڑے ہی خوبصورت پھول کھلتے تھے۔ صبح ہی صبح جب ان پھولوں اور کلیوں پر شبنم کے موتیوں کو دیکھتی تو میرا دل کرتا کہ شبنم کے موتیوں کو دھاگے میں پرو کر ان کا ہار بنا کر اپنے گلے میں پہنوں۔ لیکن وہ موتی جب ہاتھ لگانے سے ٹوٹ جاتے تو میرے دل کو بڑی ٹھیس لگتی اور میں اپنی ناکامی پر گھنٹوں روتی رہتی۔ ایسے میں ان پھولوں پر جب تتلیاں منڈلانے لگتیں تو میں اپنے دکھ بھول جاتی اور ان تتلیوں کے پنکھوں کے رنگوں کو ملا کر میں اپنی کلپنا میں اتنی ہی خوبصورت تصوریں بناتی رہتی، تتلیوں کے رنگوں سے میں نے ایک ایسے دلبر کی تصویر گھڑنی شروع کر دی جو میرے نازک احساسات کو سمجھ سکے جو میری آواز میں آواز ملا کر میرے ساتھ زندگی کا کوئی گیت گا سکے۔ ابھی یہ تصویر مکمل بھی نہیں ہو پائی تھی کہ ایک دن میری ماں نے مجھے بتایا کہ میرے باپ نے میری شادی ایک ایسے رئیس زادے سے طے کر دی ہے جس کے لئے زندگی کا تمام حسن سونے چاندی کے سکوں تک ہی محدود تھا......

.... ایسے میں میں کس کے ساتھ مل کر شبنم کے موتیوں کا ہار پروؤں گی۔... اور پھر میں جیسے پتھر ہو گئی۔

''پتھر کی مورتی۔''

عورت رک رک کر اپنی بات پوری کر رہی تھی۔

پھر پتہ نہیں وقت کے کس حصے میں کس کلاکار کی نظر میرے پتھر سے وجود پر

پڑی اور اس نے مجھے گپھا میں لا کر ٹکا دیا۔"

"اس وقت میں تمہیں یہی بتانا چاہتی ہوں کہ آج جب میں تمہارے ساتھ باہر آ گئی ہوں تو وہاں ایک مورتی کی جگہ خالی ہو گئی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ عورت خاموش ہو گئی۔ اور اس نے اپنی بات کا تاثر جاننے کے لئے مرد کی طرف دیکھا۔ مرد کے چہرے پر کوئی حیرانی نہیں تھی۔

عورت نے دیکھا کہ مرد کے ہونٹ آہستہ آہستہ یوں ہلے اور یوں کھلے جیسے صدیوں سے بند زندگی کے خوبصورت محل کے پٹ دھیرے دھیرے کھل رہے ہوں۔

"گپھا میں ایک مورتی کی جگہ خالی نہیں ہوئی بلکہ دو مورتیوں کی جگہ خالی ہوئی ہے۔" مرد کے ہونٹوں سے یہ الفاظ مہکتے ہوئے پھولوں کی طرح جھڑ رہے تھے۔ "میں ہی تمہارا وہ دلبر ہوں جس کی تصویر تم نے اپنے تصور میں گھڑنا شروع کر دی تھی۔ جب میں نے وجود میں آنے کے بعد تمہیں کہیں نہ دیکھا تو تمہاری تلاش میں نکل پڑا۔ اور پھر جب تمہیں یہاں گپھاؤں میں پتھر کی مورتی بنا دیکھا تو صدمے کے مارے میں بھی پتھر ہو گیا تھا۔ آج تمہیں پھر زندگی میں ڈھلا ہوا دیکھا تو میرے اندر بھی زندگی سرایت کر آئی۔"

یہ کہتے ہوئے مرد نے پر معنی نظروں سے عورت کی طرف دیکھا اور بولا "تمہارے گلے میں شبنم کے موتیوں کی مالا میں پہناؤں گا۔"

اس بار مرد اور عورت بغلگیر ہوئے تو پیڑوں کو لگا کہ جیسے آسمان اور زمین ان کے نیچے آ کر بغل گیر ہو رہے ہوں اور پیڑ کے گھونسلے میں چونچیں لڑا رہے پنچھیوں نے دیکھا کہ عورت کے گلے میں شبنم کے موتیوں کا ہار چمک رہا تھا۔

"ٹھہرا ہوا لمحہ"

پھولوں سے لدے ہوئے گل مہر کے پیڑ نے مجھ پر جادو سا کر دیا ہے۔ جب لال سرخ انگاروں سے پھول اس پر لگتے ہیں تو میں اپنے فلیٹ کی گیلری میں بیٹھ کر سامنے پڑوسی کے گھر میں اگے اس پیڑ کی طرف دیکھتا رہتا ہوں۔ اور اسکی خوبصورتی ہے کہ اسے دیکھتے دیکھتے دل نہیں بھرتا۔

اتفاق سے اس پیڑ کی ٹہنیوں کا جھکاؤ بھی میرے گھر کی طرف ہے اور مجھے لگتا ہے جیسے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ٹہنیاں بڑی ہوتے ہوتے دن بدن میرے قریب آتی جاتی ہیں۔

ان پھولوں کا حسن ؟ اس کی تو خیر کچھ پوچھو ہی نہیں۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے شبنم میں بھیگے ہوئے پھولوں کی رنگت کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے زندگی کی کالی رات سے جوجھ کر فتح پانے والے شوربیروں کے لال لال چہرے، پسینے کے قطروں سے تربتر ہو رہے ہوں۔ پھر جیسے جیسے سورج نکلنے پر زندگی میں روشن اجالے پھیلنے لگتے ہیں ویسے ویسے ان پھولوں کے

حسن پر نکھار آنے لگتا ہے۔ جتنی زیادہ دھوپ اتنی زیادہ ان کی لالی۔

میں بے سدھ ہو کر انہیں نہار تا رہتا ہوں۔ نہیں یہ بات مجھے اس طرح کہنی چاہئے کہ میں تو پورے ہوش و حواس کے ساتھ ان کی طرف دیکھتا ہوں مگر ان کی خوبصورتی میں گم ہو کر اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہوں۔

عجیب نظارہ ہے۔ آیئے آپ میری آنکھوں سے اس پیڑ کو دیکھئے۔

زمین کے اوپر سے نیچے کی طرف دھنستی جڑوں کے اوپر موٹا سا تنا جو آہستہ آہستہ پتلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر اس تنے سے چاروں طرف کو نکلتی، ان شاخوں سے پھوٹتی، چھوٹی بڑی ٹہنیاں۔ ٹہنیاں پتوں اور پھولوں سے لدی ہیں۔ اور ان سب کے بیچ سے آسمان کے نیلے نیلے چھوٹے بڑے انگنت ٹکڑے جھانکتے ہیں۔ کبھی لگتا ہے کہ آسمان ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر اس پیڑ کی خوبصورتی کو دیکھنے کیلئے نیچے جھک آیا ہے۔ کبھی لگتا ہے کہ یہ پیڑ ہی آسمان کی بلندیوں کو چھو کر اس پر اپنی خوبصورتی کی امٹ چھاپ چھوڑ رہا ہے۔

کبھی لگتا ہے سورج کی کرنیں اس کے پھولوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لے لاکھوں کروڑوں میلوں کا سفر کرتی بھاگی چلی آرہی ہیں۔ کبھی لگتا ہے کہ وہ کرنیں پھولوں کی لالی کو اپنے وجود میں سمیٹ کر تحفے کے طور پر آسمان کی طرف لئے جا رہی ہوں۔

ان میں سے پہلی بات سچی ہے، یا دوسری، یا دونوں۔ اس کا فیصلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ آپ کو جیسا ٹھیک لگے وہی سچ مان لیں۔

ایک دن میں اسی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے گل مہر کا پیڑ آہستہ آہستہ میرے قریب آرہا ہے جیسے مجھ سے کہہ رہا ہو لو اب مجھے اچھی طرح پوری طرح دیکھ کر حقیقت کو سمجھ لو۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں اس وقت کس کیفیت میں تھا۔ جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔ یا جاگنے اور سونے کی بیچ کی منزل پر تھا۔ غالباً اس وقت مجھے اس بات کا بھی احساس نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ اپنے گھر کی گیلری میں یا کہیں اور۔ زمین پر تھا یا ہوا میں معلق تھا یا آسمان میں

تھایا کہیں اور۔ مجھے کسی چیز کا قطعاً کوئی احساس نہیں تھا۔

کوئی احساس تھا تو صرف یہ کہ وہ گل مہر کا پیڑ اپنی جڑوں سمیت تنا، شاخیں، ٹہنیاں، پھول اپنا سب کچھ اپنے ساتھ لئے اپنی جگہ سے اٹھا اور سارے کا سارا چلتا ہوا آیا اور میرے وجود میں آکر سما گیا۔ میں نے حیران ہو کر اپنے اندر جھانک کر دیکھا۔

"باپ رے باپ" گل مہر تو اپنے بیچ جھانکتے آسمان کے تمام ٹکڑوں کو بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ میرے اندر ڈیرا جمائے جھوم رہا تھا۔

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ لیکن یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں تو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ پیڑ میرے اندر آکر سما گیا ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے۔ اس ہوا سے ٹہنیاں جھول رہی ہیں، جس کی لہروں کے پتوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے سرسر کی آواز بھی میرے کانوں کو سنائی دے رہی ہے۔ ایک مدھر سا سنگیت ہے جس کی سور لہریاں میرے وجود کے انگوں سے یوں ٹکرا رہی ہیں جیسے بہتی ہوئی ندی کی لہریں ندی کے کناروں سے ٹکراتی ہیں۔ جس طرح ندی کے پانی کے نیچے ریت کا ہر کن پانی سے بھیگا ہوتا ہے، اسی طرح میرے وجود کا کن کن بھی ہوا کے سنگیت سے شرابور ہو رہا تھا۔

یہاں تک کہ میں نے اپنے اندر انگنت تتلیوں کو بھی پھولوں کے گرد منڈراتے ہوئے دیکھا۔

عام طور پر جب بھی ان ننھی ننھی تتلیوں کو پھولوں کے گرد منڈراتے دیکھتا تھا تو دل ہی دل میں کبھی کبھی خواہش ہوتی تھی کہ ان میں سے کوئی میرے پاس بھی آئے۔ کبھی کبھی بھولے بھٹکے کوئی تتلی آجاتی تو دل میں انجانی سی خوشی بھر جاتی تھی اور اب تو وہ سب کی سب میرے اندر منڈرا رہی تھیں۔ ادھر سے ادھر ادھر سے ادھر اور مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنی ساری خوشیوں کو کہاں سمیٹ کر رکھوں۔

خوشی کی کوئی انتہا تھی۔ اسے بیان کرنا تو درکنار اسے محسوس کرنے کے لئے میرے احساسات چھوٹے پڑ رہے تھے۔

تبھی ایک ٹہنی مقابلتاً زیادہ جھول گئی تو مجھے احساس ہوا کہ کوئی پکشی ہوا میں اڑتا ہوا آیا اور اس شاخ پر آکر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اس نے پنکھ پھڑپھڑائے۔ ذرا سا پھدکا اور پہلے والی شاخ سے اڑ کر دوسری شاخ پر جا کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے چونچ کھولی اور چہچہایا:۔

او۔ای۔او۔او۔ای۔او"

اس کی آواز کو سن کر ٹہنیوں میں بیٹھے ہوئے دو تین پکشی ایک ہی آواز میں بول پڑے۔

"او۔گو۔ہو۔او۔گو۔ہو۔" جیسے کہہ رہے ہوں۔ ہم یہاں ہیں۔ ہم یہاں ہیں۔

بس پھر کیا تھا۔ اچھی خاصی راگ رنگ کی محفل جم گئی۔

اب منظر یہ تھا کہ ہرے ہرے پتوں کے بیچ لال لال پھول، ان کے بیچ سے جھانکتا آسمان، ہوا کی سرسراہٹ، پنچھیوں کی چہچہاہٹ، تتلیوں کے ننھے ننھے پنکھوں کے پھڑپھڑانے سے نکلتی بڑی باریک سی مدھم سی آواز جیسے ستار کی تاروں سے نکلنے والے وہ مدھم سور جو کسی کو سنائی نہیں دیتے، مگر اسی سطح سے دوسرے سور سنگیت میں ڈھلنا شروع ہوتے ہیں۔

پنچھیوں کا یہ سنگیت اونچا ہوتا ہوتا جب سم پر پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ پیڑ کا قد بڑھنا شروع ہو گیا۔ شاخیں پھیلنی شروع ہو گئیں۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے گل مہر کا پیڑ سارے آسمانوں کی بلندیوں کو پار کر گیا اور پورے برہمنڈ پر چھا گیا۔

ہر طرف خوبصورتی بکھر گئی۔ سارا برہمنڈ سنگیت مے ہو گیا۔ ہر طرف پھول کھلے تھے۔ ہر طرف پکشی چہچہا رہے تھے۔ ہر طرف تتلیاں اڑ رہی تھیں۔ ہر طرف گل مہر کی ٹھنڈی چھاؤں پھیلی تھی۔ اس چھاؤں کے بیچ بیچ نرم نرم گرم دھوپ کے ٹکڑے تھے جو سردیوں میں جسم وجاں کو راحت بخشتے ہیں۔

ایسا لگتا تھا جیسے اس گل مہر کے نیچے دنیا بھر کے سکھوں نے ڈیرا ڈال دیا تھا اور زندگی سکون کی چادر اوڑھے رواں دواں تھی۔

میں بھی سکھوں کی اس چادر کو اپنے تن پر اوڑھے سکون کا احساس کر رہا تھا کہ

ماحول میں کچھ تبدیلی آئی۔ ہوا کی لہریں کچھ تیز ہوئیں۔ پیڑ کی شاخوں نے قدرے زور سے جھولنا شروع کیا اور اس کے ساتھ ہی لال لال پھول ٹوٹ کر میرے وجود کے اندر گرنے لگے۔ نرم نرم پھولوں کی اس ہلکی ہلکی کن من کا بھی عجیب سا سکھ تھا۔ لگتا تھا جیسے کوئی دلفریب شخصیت اپنا آپ نچھاور کرنے کیلئے میرے اوپر پھول برسا رہی ہو۔

یہ پھول ٹپ ٹپ گر رہے تھے اور میں ان کے لمس سے شرابور ہو رہا تھا۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ ساری دھرتی مانسرودر بن گئی ہو اور اس کے پاک پوتر جل میں زندگی رنگ برنگے پھولوں کی طرح کھل کر پورے جوبن پر آکر اپنے ہونے سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ مجھے گل مہر کے پیڑ پتوں اور لال پھولوں کے بیچ انگنت خوبصورت چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ عورتیں، مرد، بوڑھے، بچے جیسے وہ بھی وقت کے گل مہر پر پھول بن کر کھل اٹھے ہوں۔ دھرتی پر موجود ساری زندگی اس گل مہر میں سمٹ آئی تھی۔

پھر اچانک جیسے ننھی سی چیونٹی کے کاٹنے سے آدمی ہڑبڑا اٹھتا ہے، ویسے ہی میں تصور کی دنیا سے باہر آیا۔ جاگ کر حقیقت کی دنیا میں داخل ہوا۔ اور میری نظر اس طرف اٹھ گئی جہاں ایک میلا کچیلا آدمی پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے، آدھا ننگا، آدھا ڈھکا اپنی ہتھیلیوں سے گل مہر کے گرے ہوئے پھولوں کو بہار رہا تھا۔

یہ دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔ جیسے بجلی کا تار چھو گیا ہو۔ ”زندگی تو اسی طرح میلی کچیلی ہے۔“

”ایسی صورت میں مجھے سکھ کی چادر اوڑھنا زیب نہیں دیتا“ میں نے سوچا۔

برہمنڈ تک پھیلا ہوا پیڑ اسی وقت سمٹ کر میرے اندر سے نکل کر پڑوسی کے آنگن میں چلا گیا۔ اس پر اب بھی لال لال پھول ٹہک رہے ہیں۔ ان کے گرد تتلیاں منڈرا رہی ہیں۔ پھولوں کے بیچ سے سرسراتی ہوئی ہوا گذر رہی ہے۔

میلے کچیلے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور لال لال پھولوں والے گل مہر سے پوچھا۔ :

''تم تو لاکھوں کروڑوں سالوں سے اس دھرتی پر ہو۔ اس لمبے عرصے میں نسل در نسل اپنی خوبصورت کو برقرار رکھا۔ ایسے میں محض دو ہزار سالوں میں انسان پر کیا بیت گئی؟۔

''گل مہر خاموش رہا۔ دلیش دشانتر سے آئی بھانت بھانت کی چڑیاں اپنی سنگیت مے آواز میں چہک چہک کر میرے سوال کا جواب دے تو رہی ہیں۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔

میلا کچیلا آدمی اب اس منظر سے دور چلا گیا ہے۔ لیکن ہے تو وہ دھرتی پر پھیلے زندگی کے گل مہر کے نیچے۔ وہ اور اس جیسے لاکھوں کروڑوں، میں ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے لال لال چیونٹیاں، لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں میرے تن بدن کو کاٹ رہی ہیں۔ میں درد سے بلبلا اٹھا ہوں۔

تھوڑی دیر پہلے گل مہر کے اپنے وجود کے اندر آنے سے میں نے سکھ کی انتا دیکھی تھی اور اب ہاں اب دکھ کی انتا دیکھ رہا ہوں۔

سکھوں کے چند روشن لمحوں کے بعد دکھوں کی کالی لمبی رات گھر آئی ہے۔ میں گھبرا کر پھر گل مہر کے پیڑ کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ زندگی کا گل مہر آنے والی رات کے گہرے اندھیروں میں دھیرے دھیرے ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ ہوا چل رہی ہے۔ پھولوں سے لدی گل مہر کی ٹہنیاں حرکت میں تھیں۔

لیکن وقت وہ لمحہ تھکا تھکا سا ٹھہرا ہوا لمحہ محسوس ہو رہا ہے۔

گھبرائیے جیا

وہ آدمی جب اس ہال میں موجود میری نسل کے پورے سو آدمیوں کو ایک ایک کر کے مار چکا تو اس نے بڑی بے دلی سے اپنی رائیفل کو کندھے پر لٹکایا اور پھر بھاری قدموں سے چلتا ہوا میری طرف آیا تو میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے کندھوں پر اتنی بندوقیں اور اسلحہ لاد رکھا تھا کہ ان کے بوجھ تلے دب کر اس کے لئے چلنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

میں اپنے مرے ہوئے عزیزوں کے بیچ سہما سا کھڑا اچھٹی اچھٹی نظروں سے اسے اپنی طرف آتا دیکھ رہا تھا۔ اور یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اب اس کے ارادے کیا ہیں لیکن میرا ذہن اس قدر ماؤف ہو چکا تھا کہ کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھا۔ دراصل اپنے لوگوں کو ایک ایک کر کے اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے دیکھ کر میں نے بھی خود کو مرے ہوئے لوگوں میں ہی شمار کر لیا تھا اور ظاہر ہے کہ مرا ہوا آدمی کچھ سوچ نہیں سکتا۔

میں ایسی ہی مری ہوئی کیفیت میں تھا جب اس نے آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے تمہیں اس لئے نہیں مارا کیونکہ زندہ آدمی کو کسی زندہ آدمی کے ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے میرے کندھے پر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ تم بڑے کام کی چیز ہو۔"

کام کی چیز اس کے الفاظ گولی کی طرح سنسناتے ہوئے میرے ایک کان میں داخل ہوئے اور دوسرے کان کے راستے پھنکارتے ہوئے نکل گئے۔ میرے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ اور جب میں نے ذہن پر زور دے کر سوچا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ جب تک میں کام کی چیز ہوں تب تک بچا ہوں گا اور جب کام کی چیز نہیں رہوں گا تو اپنے عزیزوں کی طرح مار دیا جاؤں گا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ جیسے مجھے میرے زندہ ہونے کا احساس دلا رہا ہو اور مجھے پکڑ کر اپنے ساتھ یوں لے کر چل پڑا جیسے چلتے وقت کوئی اپنا سامان اٹھا لیتا ہے۔ ایک انسان سے اب میں اس کے لئے کام کا سامان بن گیا تھا اس لئے میں اپنے قدموں سے نہیں غالباً اس کے قدموں سے چل رہا تھا اپنی آنکھوں سے نہیں اس کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اپنے ذہن سے نہیں اس کے ذہن سے سوچ رہا تھا۔

چند قدم چلنے کے بعد ہم اس چبوترے پر پہنچ گئے جس پر کھڑے ہو کر اس نے ابھی ابھی سو لوگوں کا قتل کیا تھا۔

اس نے تالی بجائی۔ تالی کی آواز سن کر میں خوف سے لرز گیا۔ میں نے سوچا۔ اس نے پھر کسی اوزار سے فائر کیا ہے، اور وہ گولی مجھے لگی ہے۔ میں نے گھبرا کر اپنے سر اور چھاتی اور پیٹ کو ہاتھوں سے چھو کر دیکھا تو کہیں سے خون نہیں بہہ رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے مجھے مارا نہیں گیا ہے، میں نے سوچا میرے چہرے پر خوف کے آثار دیکھ کر وہ مسکرایا اور مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کیلیے اشارہ کیا جو ابھی ابھی کچھ لوگ رکھ کر واپس چلے گئے تھے۔

"تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں" وہ کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا نہ میں نے تمہیں اسلئے نہیں مارا کیوں کہ زندہ آدمی کو کسی زندہ آدمی کے ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔" اس نے یہ الفاظ دوبارہ ٹھہر ٹھہر کر اس طرح ادا کیے کہ میں ان کے مفہوم کو سمجھ سکوں۔

اتنے میں دو تین خوبصورت سی لڑکیاں آئیں اور وہ ہمارے بیچ رکھی تپائی پر کھانے پینے کو بہت سا سامان رکھ گئیں۔

میں اس کی بات کو تھوڑا تھوڑا سمجھنے لگا تھا کہ واقعی ایک زندہ آدمی کو کسی زندہ آدمی کے ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ان لڑکیوں کو دیکھ کر میرا ذہن پھر گڑبڑا سا گیا "تو کیا یہ زندہ نہیں ہیں؟"

میرے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر وہ بولا۔ "یہ سب استعمال کی چیزیں ہیں۔ جیسے یہ صوفہ، یہ تپائی اس پر رکھا کھانے پینے والا سامان اسی طرح یہ لڑکیاں۔" یہ کہہ کر وہ زیرلب مسکرایا اور پھر کھانے پینے میں مصروف ہو گیا۔

وہ اپنے سامنے رکھی چیزوں کو جس اشتیاق سے کھا اور پی رہا تھا اتنا ہی وہ چیزیں میرے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھیں۔

"کھاؤ۔ کھاؤ۔ اب تم زندہ ہو۔" وہ میرا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ "زندہ آدمی کو پیٹ بھر کر کھانا چاہئے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے پلیٹیں میری طرف سرکائیں۔ اور کسی مشروب سے بھرے پیالے کو میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔

میں کچھ کھا پی نہیں رہا تھا۔ پیالہ اٹھا کر ہونٹوں کو لگاتا تھا اور ہونٹ گیلے کر کے ان پر زبان پھیرتا ہوا واپس رکھ دیتا تھا۔ یہ بھی صرف اسے یہ احساس دلانے کے لئے کر رہا تھا کہ میں ایک زندہ آدمی اس کا پورا پورا ساتھ دے رہا ہوں۔

اتنے میں اس نے پھر تالی بجائی۔ اسی وقت دو خادمائیں دست بستہ حاضر ہوئیں۔ تو وہ بولا "ان مردوں سے کہو۔ فوراً ہال کو خالی کریں اور باہر جانے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ کسی کے خون کا اک دھبہ بھی کہیں نظر نہیں آنا چاہئے۔"

"مردے بھلا اپنے آپ کیسے باہر جا سکتے ہیں؟" میرا ذہن پھر گڑبڑا گیا۔ لیکن خادماؤں نے "جی" جو حکم سرکار کا کہہ کر یوں سر جھکا دیئے جیسے وہ مزید احکامات کا انتظار کر رہی ہوں۔

”اور ہاں! مردوں سے کہو کہ باہر نکل کر اپنی اپنی قبریں کھودیں پھر کفن باندھ کر تابوت میں بند ہو کر اپنی اپنی قبر میں جا کر سو جائیں، ورنہ.....

”ورنہ“ ان کو کیا سزا دی جائے گی؟“ میں پھر سوچ میں پڑ گیا۔ خادماؤں کے جانے کے بعد اس نے کوئی بٹن دبایا تو ایک طرف سے پردہ ہٹ گیا۔ میں نے دیکھا۔ بڑے مچ پر خوبصورت لڑکیوں کا ایک گروہ ناچ گانا شروع کرنے کے لئے اس کے اشارے کا منتظر تھا۔

بہت دیر تک وہ کھانے پینے کا شغل کرتا رہا۔ بہت دیر تک وہ لڑکیاں اپنی انوکھی حیران کن اداؤں کے ساتھ ناچتی گاتی رہیں۔

”کسی کو مارنا اور ایک ساتھ پورے سو لوگوں کو مارنا بڑا تھکا دینے والا اور من کو اچاٹ کر دینے والا کام ہے۔“ وہ مجھ سے بات کرتا ہوا اپنے دل کا بوجھ اتار رہا تھا۔ ”یہ دلبستگی کا سامان اس لئے مہیا کیا گیا ہے کہ پہلے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کر سکوں۔“

اور پھر کافی وقت گزر جانے کے بعد جیسے وہ ان لڑکیوں کے ناچ گانے سے بھی اسی طرح اوبھ گیا تھا جس طرح ایک سو لوگوں کو بندوق کا نشانہ بنا کر۔ ”اب یہاں سے چلنا چاہئے“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ارے تم نے تو کچھ لیا ہی نہیں“ اس نے میرے پیالے کو اسی طرح بھرا ہوا دیکھ کر کہا۔ ”خیر کوئی بات نہیں۔ ایسا ہوتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بٹن دبایا تو وہ سب لڑکیاں آن واحد میں زمین پر یوں گر گئیں جیسے ان کی برقی رو کو کاٹ دیا گیا ہو۔ ”یہ روبو قسم کی لڑکیاں بھلا انسان کا دل کیسے بہلا سکتی ہیں؟“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوا اس کے ساتھ چل دیا۔ وہاں سے باہر نکل کر وہ مجھے ساتھ لے کر ایک ہوائی جہاز میں جا بیٹھا۔

ہوائی جہاز پتہ نہیں کتنی مدت تک پرواز میں رہا۔ اوپر نیلا آسمان نیچے نیلا سمندر۔ بیچ میں اڑتے ہوئے سفید اور کالے بادل۔ مجھے لگا جیسے ایک آسمان اوپر ہو ایک آسمان، نیلا آسمان زمین پر آکر بچھ گیا ہو۔ بیچ میں ہم دونوں انجانی سمتوں کی طرف اڑتے جا رہے تھے۔

ہم کسی نئی زمین پر اتر کر جب اس کے گھر پہنچے تو میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ مجھے پتہ

نہیں چلا کہ میں کب سو گیا اور کب تک سوتا رہا۔ جب میری نیند کھلی تو ایک عورت دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

”یا خدا! یہ بھی کہیں“ میں نے سوچا۔

اس نے میرے چہرے پر آئے سوالیہ نشان کو پڑھ کر میرے دل کے شک کو دور کیا۔ ”میرے شوہر جاگ گئے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں چائے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں“۔ اس نے شوہر کے لفظ پر خاص طور سے زور دیا اور میری طرف دیکھا جیسے مجھے یقین دلانا چاہتی ہو کہ وہ واقعی اس کی بیوی ہے۔

چائے پیتے ہوئے اس کی بیوی نے پوچھا۔ ”آپ کا کام بخوبی انجام پا گیا۔“

”اللہ کا شکر ہے۔ سب ٹھیک ہو گیا۔“

میں تو سچی بات ہے۔ دل ہی دل میں ڈر رہی تھی۔ سو آدمیوں کو ایک ساتھ مارنا بڑا مشکل ہوتا ہے کہیں کچھ ہو جاتا تو... لینے کے دینے پڑ جاتے۔“

”تم تو ایسے ہی ڈرتی رہتی ہو۔ جب بھی میں اس قسم کے کام پر جاتا ہوں....

”میری تو روح فنا ہوئی رہتی ہے۔“ بیوی نے اس کا جملہ پورا کیا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ اپنا یہ موت کا کھیل کھیلنے کے بعد راگ رنگ کی محفل نہ جمانا، لیکن مجھے پتہ چلا ہے کہ تم باز نہیں آئے۔“

”تمہیں کس نے بتایا۔“ شوہر نے میری طرف گھور کر دیکھا۔

بتایا تو کسی نے نہیں۔ لیکن پھر بھی ایسی باتیں چھپی نہیں رہتیں۔ موت کے گھر میں شادیانہ بجانا طفلانہ حرکت ہے۔ ملک الموت ناراض ہو جائے تو.....

”پتہ نہیں یہ ڈراونے سپنے تمہیں کون دکھاتا رہتا ہے۔“

میں چائے پیتا ہوا ان کی باتوں کو سن رہا تھا کہ اتنے میں ان کے دو بچے اپنی خواب گاہ سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

”پاپا ہم باہر لان میں سیر کرنے کے لئے جائیں؟“

"ہاں۔ ہاں جاؤ، صبح صبح ہوا خوری کرنا صحت کے لئے اچھا ہوتا ہے۔" ان کی ماں نے کہا۔ "اور دیکھو پھول مت توڑنا۔"

"ہاں۔ پھول نہ توڑنا۔ پھول توڑنا بری بات ہوتی ہے۔" پاپا نے کہا۔

دونوں بچے ہنستے کھیلتے ادھر باہر گئے اور دوسرے ہی لمحے ہانپتے کانپتے سہمے ہوئے ڈرائنگ روم میں واپس آگئے۔ "پاپا۔ پاپا۔" دونوں بچوں کے حواس اڑے ہوئے تھے۔

"کیا ہے؟" ماں باپ دونوں نے گھبرا کر پوچھا "تم لوگ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

"پاپا۔ پاپا۔ ہمارے گھر کے چاروں طرف قبریں ہی قبریں پھیلی ہوئی ہیں اور ان میں تابوت رکھے ہوئے ہیں۔

وہ دونوں میاں بیوی اٹھ کر گئے اور حواس باختہ سے واپس آگئے۔

"کہیں یہ وہی مردے تو یہاں نہیں چلے آئے جن کو تم نے مارا ہے"۔ بیوی نے کہا۔

"لیکن میں نے تو سب مردوں سے کہا تھا کہ وہیں پر اپنی قبریں کھودیں اور اپنے اپنے تابوت میں لیٹ کر دفن ہو جائیں۔"

"تم بھول گئے کہ ایک انسان تبھی تک دوسرے انسان کے حلقۂ اختیار میں رہتا ہے جب تک وہ زندہ ہوتا ہے، مرنے کے بعد وہ اس کی رسائی سے باہر ہو جاتا ہے۔" بیوی ایک لمحے کے لئے رکی اور پھر بولی "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اپنا سامان اٹھانے کے بجائے تم ان مردوں کو اٹھا لائے ہو۔ ورنہ وہ اپنے آپ چل کر کیسے آسکتے ہیں؟ وہ بھی اتنی دور سات سمندر پار؟"

وہ فکر مند سا ہو کر سوچ میں ڈوب گیا۔ "اب سوال یہ ہے کہ ہم اس موت کے ماحول سے باہر کیسے آئیں؟ ان مردوں سے جان کیسے چھڑائی جائے جنھوں نے ہمارے گھر کے گرد ڈیرا ڈال لیا ہے۔ وہ مری ہوئی سی آواز میں بولا۔

مجھے ایسا لگا جیسے یہ ایک زندہ آدمی کی نہیں مرے ہوئے آدمی کی آواز تھی۔

''میرے خیال میں ہم لوگ اپنے فارم ہاؤس میں چلتے ہیں'' بیوی کی آواز بھی مجھے بے جان سی لگی۔

وہ دونوں مجھے اور اپنے بچوں کو ساتھ لے کر ہیلی کاپٹر میں بیٹھے اور فارم ہاؤس پہنچ گئے۔ رات آرام سے کٹی۔

صبح ہوئی تو ان کی روح لرز گئی۔ ان کے فارم ہاؤس کے آس پاس پھر انہی قبروں اور تابوتوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔

''یہ تو یہاں بھی پہنچ گئے۔'' دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ مجھے ایسے لگا جیسے دونوں پاس کی کسی قبر کے اندر سے بول رہے ہوں۔

''یہ کیسے ہو رہا ہے؟'' مرد نے میری طرف دیکھتے ہوئے یوں کہا جیسے پوچھ رہا ہو۔ ''تمہارے مردے ہیں تم ہی جواب دو۔''

''یہ تو تمہارا ایسا سامان ہے جو صرف اس دنیا میں ہی نہیں اگلی دنیا تک بھی تمہارے ساتھ ساتھ جائے گا۔'' میں نے ہمت کر کے دل کی بات کہہ دی۔

میری بات سنتے ہی اسے غصہ آ گیا۔ اور اس نے جیب سے ریوالور نکال لیا لیکن میں نے دیکھا کہ اس کا ریوالور والا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا، اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں جیسے بے جان سی ہو گئی تھیں۔

''اسے مارنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تمہارا پیچھا کرنے والوں میں ایک اور تابوت کا اضافہ ہو جائیگا۔'' بیوی نے ڈوبتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

''پاپا۔ پاپا۔ وہ دیکھو۔ ایک تابوت چلتا ہوا اس طرف آ رہا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے بچے چیخ مار کر ماں سے لپٹ گئے۔

تابوت کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ دونوں میاں بیوی اور ان کے بچے بے ہوش ہو گئے۔ میرے لئے وہاں سے فرار کا راستہ نکل آیا۔

چلتے وقت میرے دل میں یہ آیا کہ اپنی نسل کے سو آدمیوں کے مارنے والوں کو مار کر اپنے اندر بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ کو بجھالوں۔ لیکن پھر میرے ذہن میں اپنے ہی کہے ہوئے یہ الفاظ گونج گئے۔ یہ تو ایسا سامان ہے جو صرف اس دنیا میں ہی نہیں اگلی دنیا تک بھی تمہارے ساتھ ساتھ جائے گا۔ اور میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اسی کے ہیلی کاپٹر پر سوار ہو کر میں نے پرواز بھر لی ہے۔ میرے اوپر نیلا آسمان، نیچے نیلا آسمان، اور فضا میں اڑتا ہوا میں کسی ایسی زمین کی تلاش کر رہا ہوں جہاں رنگ، نسل، دھرم اور قومیت کے فرق کی بنا پر زمین انسان کے خون سے نہ رنگی ہو۔

میں پرواز میں تو ہوں، مگر فکر مند بھی ہوں۔ میرا ایندھن آخر کب تک میرا ساتھ دے گا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔

✓

”خوشیوں کے بنجارے“

وہ بنجارن مجھے پہلی ہی نظر میں اچھی لگی تھی۔

اچھی بھی اور اپنی اپنی بھی۔

کچھ لوگ ہوتے ہیں جو پہلی بار ملنے پر بھی ایسے لگتے ہیں جیسے ان سے جنم جنم کا رشتہ ہو۔ وہ بنجارن مجھے ایسی ہی لگی تھی۔

میں آندھرا پردیش کے ایک گھنے جنگل میں ایک آموں کے جھنڈ کے نیچے بیٹھا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پکے پکے آم ٹپ سے نیچے بہتی ہوئی پتلی سی جنگلی ندی میں گر رہے تھے۔ میں نے ان میں سے بہت سے آم چن کر ایک جگہ ڈھیر کر لئے تھے اور ایک پتھر پر بیٹھا بڑے مزے سے آم چوس رہا تھا اور جنگل کا نظارہ کر رہا تھا۔

تبھی وہ بنجارن ایک پکے ہوئے آم کی طرح جیسے ٹپ سے وہاں آگری ہو۔ اس کے ہاتھ میں سوکھی لکڑیوں کا گٹھر تھا۔ اور ہرنی کی طرح اس کی آنکھیں چاروں طرف سوکھی لکڑیاں ڈھونڈ رہی تھیں۔

ہم دونوں نے شاید ایک ساتھ ہی ایک دوسرے کو دیکھا۔ اسے دیکھ کر مجھے کچھ حیرانی ضرور ہوئی لیکن وہ مجھے دیکھ کر نہ ٹھٹھکی نہ جھجکی۔ وہ سیدھی میرے قریب آئی اور اسی پتھر کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی۔ جس پر میں بیٹھا تھا۔

''تو آم چوسے جارہے ہیں جناب''

اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر یوں کہا جیسے وہ مجھے برسوں سے جانتی ہو۔ اس جنگل میں آپ اکیلے کیا کر رہے ہیں؟''

''میں اکیلا ضرور تھا مگر اب آپ کے آجانے سے ہم دو ہو گئے ہیں۔'' میں نے اسے وہاں اس کی موجودگی کا احساس دلانا چاہا۔

''میرا مطلب ہے کہ اس گھنے جنگل میں آپ کہاں ٹپک پڑے؟''

''میں وہاں سامنے جنگل کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا ہوں۔'' میں نے گیسٹ ہاؤس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ''اور آپ..؟

ہمارے قافلے نے یہیں قریب ہی ڈیرا ڈالا ہے۔ میں چولہا گرم کرنے کے لئے لکڑیاں بٹور رہی ہوں۔''

''یہ لکڑیاں آپ اپنے چولہے میں رکھ کر اپنے اس کوئیلے کی آگ سے جلائیں گی جو خانہ بدوشوں کے بڑے چولہے میں راکھ کے نیچے ہمیشہ سلگتا رہتا ہے۔''

''آپ کو ہمارے چولھے کی بات کیسے معلوم ہے'' اس نے بڑی حیرانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

میں جانتا ہوں کہ اس چولھے کی آگ آپ کے لئے بڑی پوتر ہوتی ہے اور آپ لوگوں کا وشواس ہے کہ جب تک آپ کی کُل میں یہ آگ جلتی رہے گی تب تک آپ کو اپنے پورجوں کا آشیرواد ملتا رہے گا''

''ارے یہ راز کی بات آپ کو کس نے بتائی'' یہ کہتی ہوئی وہ میری طرف کچھ اور سرک آئی تو اس کے دونوں بازوؤں میں کلائی سے لے کر کندھوں تک پہنی ہوئی سفید رنگ

ں پنوریاں کھن کھن کھنک اٹھیں۔

"یہ بات مجھے پارو نے بتائی تھی"

اور یہ پارو کون تھی؟"

"ایک بنجارن لڑکی جس کے ساتھ میں بچپن میں کھیلا کرتا تھا اور وہ مجھے اتنی اچھی لگتی تھی اتنی اچھی لگتی تھی کہ میں اسے آج تک نہیں بھول پایا۔

پھر میں نے اسے بتایا کہ پارو مجھے اس وقت ملی تھی جب میں چوتھے درجے میں پڑھتا تھا۔ میں اسکول جارہا تھا کہ دیکھا وہ اکیلی زمین پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر شٹاپو کھیل رہی تھی۔ مجھے بھی شٹاپو کا کھیل بہت اچھا لگتا ہے۔ میں نے اپنا بستہ ایک طرف رکھ دیا اور اسکے ساتھ تھوڑی دیر شٹاپو کھیلتا رہا۔ پھر تو یہ ہمارا روز کا معمول ہو گیا۔ میں جب سکول سے واپس لوٹتا تو وہ مجھے راستے میں آملتی۔ کئی بار وہ میرے گھر بھی آئی۔ کئی بار میں اس کے ڈیرے میں بھی گیا۔ ہم اتنے اچھے دوست بن گئے کہ کئی بار وہ میرے گھر میں کھانا کھا کر وہیں سو رہتی۔ اسی طرح میں بھی کئی بار اس کے ڈیرے میں ہی رہ جاتا تھا۔

تبھی اس کی ماں نے مجھے وہ میٹھا روٹ کھلایا تھا جو پوروجوں کو خوش کرنے کیلئے بنجاروں کے ہاں ساون کے مہینے میں بنتا ہے۔ مجھے بہت اچھا لگا تھا وہ روٹ۔ سچ پوچھو تو یہ بات کرتے ہوئے اس روٹ کا میٹھا سواد میرے منہ میں مٹھاس پیدا کر رہا ہے۔"

"تبھی اتنی میٹھی باتیں کر رہے ہو" وہ بولی۔ "اس پارو کے بارے میں مجھے کچھ اور بتاؤ؟"

پارو کے ساتھ بتائے ہوئے پلوں کی کہانیاں سنانے لگوں گا تو ساری عمر بیت جائے گی۔ اور وہ کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ ہاں اس سے بچھڑنے کی کہانی بڑی مختصر ہے۔ وہ سنائے دیتا ہوں۔"

ہوا یہ کہ ایک شام کو ہم برگد کے نیچے شٹاپو کھیل رہے تھے۔

میں دو بار ہار چکا تھا اور دونوں بار شرط کے مطابق میں اسے اپنی پیٹھ پر سوار کر کے

وہاں تک لے گیا تھا جہاں گلابوں کی باڑی لگی ہوئی تھی۔ پھر اسے پیٹھ پر اٹھائے اٹھائے واپس بھی لایا تھا۔

لیکن تیسری بار یہ ہوا کہ میں جیت گیا۔ اب اس کی باری تھی کہ مجھے پیٹھ پر سوار کر کے گلابوں کی باڑی تک لے جائے۔

عین اس وقت جب وہ گھوڑی کی طرح جھک گئی تھی اور میں اس کی پیٹھ پر سوار ہونے ہی والا تھا کہ اس کے باپو نے اسے آواز دی۔ ''جلدی آؤ کام ہے''۔

وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہا۔ ''تمہاری شرط کل پوری کروں گی۔ ادھار رہا۔

لیکن اگلے دن صبح جب میں اسکول جا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ان کا قافلہ کوچ کر گیا ہے۔ جہاں تنبو لگے تھے، وہاں جگہ جگہ اینٹیں، پتھر، بکھرے ہوئے تھے۔ اور وہ ساری خالی جگہ بھوتوں کے ڈیرے کی طرح بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔

بس اس کے بعد پارو مجھے کبھی نہیں ملی''

تبھی کچھ اور بنجارن عورتیں لکڑیاں بنتی ہوئی ادھر نکل آئیں۔

ان میں سے ایک کو اس نے آواز دی ''اری پارو۔ ذرا ادھر تو آنا''

پارو قریب آئی تو وہ مجھ سے بولی۔ ''ذرا دھیان سے دیکھو کہیں یہ تو تمہاری پارو نہیں ہے؟''

''نہیں یہ وہ نہیں ہے۔ وہ تو...''

''بہت خوبصورت تھی'' اس نے میری بات کو پورا کرتے ہوئے کہا'' ویسے یہ بھی کم خوبصورت نہیں ہے۔ آزاد جنگل کی ہرنی ہے ہماری پارو'' یہ کہتے ہوئے وہ زور سے ہنسی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی'' ارے بھائی یہ صاحب بچپن میں کسی پارو نام کی بنجارن کے دوست رہے ہیں۔ میں نے سوچا۔ اگر تم ہی ہو تو دو بچھڑی ہوئی کونجوں کو ملا دیا جائے۔''

پارو اس کی بات کو سن کر جھینپ سی گئی۔

پھر وہ پارو سے بولی۔ "اری پارو۔ ذرا بھاگ کے جا میری روٹیوں والی چنگیر میں میٹھا روٹ رکھا ہے وہ لیتی آ۔" اس پارو نے انہیں میٹھا روٹ کھلایا تھا اور یہ آج تک اسے یاد کر رہے ہیں۔ آج ہم بھی انہیں اپنے ہاتھوں سے بنا ہوا روٹ کھلاتے ہیں۔ تاکہ ہماری یاد بھی ان کے دل میں میٹھے روٹ کی طرح بس جائے۔

تھوڑی ہی دیر میں پارو روٹ لے کر آ گئی

روٹ واقعی بڑا لذیذ تھا۔

میں نے بڑے مزے لے لے کر کھایا۔

اور سچی بات یہ ہے کہ اس نے کھلایا بھی بڑے پیار سے

روٹ کھا کر میں نے کہا۔ اس روٹ نے پارو کی یاد کو اور بھی تازہ کر دیا ہے۔ اس وقت اس کا خوبصورت چہرہ میری آنکھوں کے سامنے پھیلتا جا رہا ہے۔

"کیسی تھی تمہاری پارو؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

" میرا خیال ہے کہ وہ بڑی ہو کر تمہاری طرح ہی خوبصورت اور چنچل ہو گئی ہو گی۔"

میرے منہ سے یہ الفاظ سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اتنی خوبصورت عورت میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جنگل کی فضاؤں کی طرح افق کی حدوں تک پہنچ کر ساری دھرتی سارے آسمان کو اپنی آغوش میں سمیٹتی ہوئی۔

پھر وہ اچانک پیڑ کی ڈالی کی طرح میری طرف جھکی اور بولی "مجھے خوشی ہے کہ تم ہم بنجاروں کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہو اور ایک بنجارن کی یاد کو اتنے سالوں سے اپنے دل میں تم نے خوشبو کی طرح بسا رکھا ہے۔"

وہ کچھ دیر کے لئے رکی اور پھر بولی "آج میں تمہیں بنجاروں کے بارے میں ایک اور بات بتاتی ہوں۔

"وہ کیا؟"

"بنجارے کسی کا قرض اپنے سر پر نہیں رکھتے"

"کسی کا قرض" میں سمجھا نہیں۔

"وہ مسکرائی" ایک بنجارن ایک بنجارن بہن کا قرض ادا کرنے کو تیار ہے۔ آؤ اپنی پارو کا قرض مجھ سے وصول کر لو۔"

"وہ تو بچپن کا کھیل تھا"

"تھا۔ لیکن میرا دل کرتا ہے کہ میں پارو بن کر تمہاری پارو کا قرض ادا کر دوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دھرتی کی طرح اپنے دونوں بازو پھیلا دیے اور مسکراتے ہوئے ننھے تلے قدموں سے میری طرف بڑھتی وہ پوچھ رہی تھی "بولو تمہیں اٹھا کر کہاں تک لے چلوں؟"

میں ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بولی۔ اگر کہو تو تمہیں اپنے سینے سے لگا کر وہاں تک لے چلوں جہاں افق میں زمین اور آسمان ملتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔"

"اس میں تو ایک عمر تمام ہو جائیگی"

"ایسا ہو جائے تو اور کیا چاہئے انسان کو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک قدم اور اٹھایا۔ اب اس کے اور میرے درمیان صرف ایک ہی قدم کا فاصلہ باقی تھا اور اسکے جسم کی خوشبو میں نہاتے ہوئے مجھ پر ایک نشے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

اب میرے اور اس کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہ گیا تھا اس کی گرم گرم سانسوں کو میں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں بھرنے کے لئے اپنے بازو اٹھائے ہی تھے کہ تبھی کسی کی آواز آئی۔

"تم یہاں باتوں میں لگی ہو۔ اور وہاں کوچ کا حکم ہو گیا ہے۔"

اس کے اٹھے ہوئے بازو ایک مرتبہ پھر نیچے گر گئے۔

میں نے کہا "انسان کی زندگی میں خوشیاں بنجاروں کی طرح ہی ہوتی ہیں۔ انسان خوشیوں کو اپنی بانہوں میں پوری طرح سمیٹ بھی نہیں پاتا کہ کوچ کا حکم ہو جاتا ہے۔"

میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ پتہ نہیں اس نے سنی بھی یا نہیں۔ سنی بھی

ہو تو پوری طرح سمجھی یا نہیں۔ اس کی آنکھوں میں تو آنسو چھلک آئے تھے اور وہ بھاری قدموں سے چلتی ہوئی پلٹ پلٹ کر میری طرف دیکھتی ہوئی ادھر جا رہی تھی جہاں اس کا قافلہ کوچ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔

میرے سامنے رکھے ہوئے آم جو ابھی تھوڑی دیر پہلے بہت میٹھے اور لذیذ تھے اب کھٹے اور پھیکے ہو گئے تھے۔

جنگل میں چار سو اترتا ہوا اندھیرا، میری زندگی میں دور دور تک پھیلتا جا رہا تھا۔

لوک گیت کے آنسو

اس لوک گیت کی کہانی کچھ اس طرح ہے۔

میرے پڑدادا دو بھائی تھے۔ ایک کا نام تھا نہال چند، اور دوسرے کا کمال چند۔ دونوں سگے بھائی تھے۔ دونوں کی رگوں میں ایک ہی باپ کا خون بہتا تھا۔ اور دونوں میں پیار بھی بہت تھا۔

ان کے باپ کا نام پھگومل تھا۔ وہ کہیں بھٹنڈہ کی طرف کا رہنے والا تھا یا ممکن ہے کچھ اور پرے کا ہو۔ اب اتنی پرانی بات کسے یاد رہ سکتی ہے۔ سنا ہے کہ جہاں کا یہ پھگومل رہنے والا تھا وہاں ایک بار بڑا زبردست اکال پڑا۔ اس وقت یہ پھگومل اپنے علاقے سے اٹھ کر سیالکوٹ کے ایک گاؤں داؤد میں جا کر بس گیا۔ نئی جگہ پر جا کر قسمت نے کچھ یاوری کی۔ اس کے ہاتھ میں چار پیسے آ گئے تو اس نے اپنے رہنے کے لئے ایک بہت بڑی حویلی بنواتے وقت یہ خیال رکھا کہ اگر کبھی یہ دونوں بھائی نہال چند اور کمال چند الگ ہونا چاہیں تو بھی بیچ میں دیوار کھینچنے کی نوبت نہ آئے۔ بیچ کی دیوار کے دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے سے ہی گھر دو

حصوں میں بٹ جاتا تھا۔

اب اتفاق یہ ہوا کہ پھگومل کے مرنے کے دو چار سال بعد چھوٹا کمال چند کسی مسلم فقیر کے ڈیرے پر جانے لگا اور اس کے علم و زہد سے وہ اس حد تک متاثر ہوا کہ اپنے مرشد کے نام کا کلمہ پڑھتے پڑھتے اس نے اسلام قبول کر لیا۔

یعنی ایک بھائی ہندو رہ گیا اور دوسرا مسلمان ہو گیا اور اس نے اپنا نام کمال چند کے بجائے کمال دین کر لیا۔

پھر یہ ہوا کہ شادی کے پہلے آٹھ دس سال تک جب بڑے بھائی نہال چند کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو اس کے چھوٹے بھائی کو بڑی فکر رہنے لگی کہ کہیں بڑے بھائی کے گھر کا چراغ ہی نہ گل ہو جائے۔ بڑے بھائی نہال چند کو بھی اس نئے گاؤں میں ایک کمال دین ہی اپنا سگا سمبندھی اور سچا ہمدرد دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اپنے دل کا درد کمال دین کے سامنے کھول کر رکھا تو اس نے کہا۔ "نہال چندا، تو فکر نہ کر۔ مولا کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ تو میرے ساتھ میرے مرشد کے پاس چل۔ اسی کے پاس فریاد کرتے ہیں۔"

وہ دونوں اس کے پاس گئے تو کمال دین کے مرشد نے فرمایا کہ "کمال دین تو وقت نہ دیکھ۔ فلاں گاؤں میں ایک نانک پنتھی سنت کا ڈیرا ہے۔ وہ بڑی کرنی والا پہنچا ہوا سادھو ہے۔ تمہارے بھائی کی فریاد سن کر اگر اس نے منہ سے "ست کرتار" کہہ دیا تو سمجھ لینا کہ اس کا بیڑا پار ہو گیا۔ میں بھی تمہارے بھائی کے لئے دعا کروں گا۔ اللہ بھلا کرے گا۔"

اب کرنی بھگوان کی یہ ہوئی کہ ان دونوں بھائیوں نے اس گاؤں میں جا کر سادھو کے پاؤں پکڑے تو ان کی بات سن کر اس کے منہ سے دو مرتبہ "ست کرتار ست کرتار" کے بول نکلے اور ان دونوں بھائیوں کے دل کے کنول کھل اٹھے۔

غرضیکہ نہال چند کے ہاں دو بیٹے ہوئے۔ اور چونکہ دونوں بھائی نانک پنتھی سادھو کی دعاؤں کے صدقے پیدا ہوئے تھے، اس لئے نہال چند نے ان دونوں بیٹوں کو گورو کا سکھ بنا ڈالا۔ ایک کا نام نرنجن سنگھ رکھا گیا دوسرے کا گورمکھ سنگھ۔

دونوں بیٹوں کی پیدائش کے موقعوں پر نہال چند کے ہاں تو خوشی کے شادیانے بجے ہی لیکن کمال دین کے گھر میں جو چراغاں ہوا اسکا ذکر ہمارے گاؤں کے لوگ اس خاندان کی تین پیڑھیاں گذر جانے کے بعد بھی کیا کرتے ہیں۔

اس چراغاں کو دیکھ کر کسی مقامی شاعر نے دونوں بھائیوں کی محبت سے لبریز، ایک گیت بھی رچ ڈالا، جس کے بول کچھ اس طرح تھے۔

نہال چند گھر پتر جمے، کمال دین گھر دیپ جلے

شالا! پیار بھراواں والا، دن دن دون ودھے

کہتے ہیں پہلے تو یہ گیت کسی مراثی نے ہمارے گاؤں کی چوپال میں گایا تھا۔ پھر اس گیت کے بول اڑ کر ارد گرد کے گاؤں، دنگلوں، میلوں کے اکٹھوں میں بھی جا پہنچے اور پھر اس گیت کو ایسی مقبولیت ملی کہ یہ سارے پنجاب کے لوک گیتوں کا حصہ بن گیا۔ اور دور دراز کے علاقوں میں بھی پہنچ گیا۔ کوئی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ نہال چند کون تھا، یا کمال دین کون ہے؟ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں، دونوں نام مل کر اس طرح ایک ہو گئے تھے کہ کوئی دوسرا انہیں الگ کر کے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

پرانے وقتوں کی باتیں تو خیر سنی سنائی باتیں ہیں۔ لیکن اپنی عمر کے سترہ اٹھارہ سال کے واقعات کا تو میں عینی شاہد ہوں۔ تین پیڑھیاں گزر جانے کے باوجود میں نے خود دیکھا ہے کہ دونوں گھروں کے بیچ دروازے اور کھڑکیاں شاذونادر ہی بند ہوتے تھے۔

دوپہر کو گھر کا کام کاج ختم ہونے کے بعد جب دونوں گھروں کی عورتیں حویلی کے کھلے آنگن میں اپنے اپنے چرخے لے کر بیٹھتیں تو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کون کس گھر کی بہو یا بیٹی ہے۔

اس آنگن کے ایک کونے میں ایک ہی تندور تھا جس میں دونوں گھروں کی عورتیں اپنی اپنی روٹیاں لگایا کرتی تھیں۔ ایک ہی تندور، ایک ہی آگ میں سنکی ہوئی ایک سی روٹیاں، ایک سی چنگیزوں میں رکھی جاتیں، اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ ایک عورت آٹے کا پہلا پیڑا

توڑتے وقت بسم اللہ کہتی تو دوسری ست کرتار۔ بھلا بسم اللہ اور ست کرتار کہنے سے ایک ہی تندور میں پکی ہوئی روٹیوں میں کیا فرق ہو سکتا تھا؟

ہاں! وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اتنا فرق ضرور آگیا تھا کہ بوڑھی عورتیں ایک دوسرے کے گھروں کا بنا ہوا کھانا کھانے سے پرہیز کرنے لگی تھیں۔ اس لئے مجھے اور سلمی کو کبھی کبھی شرارت جو سوجھتی تو بسم اللہ والی ٹوکری ست کرتار والی جگہ پر پہنچ جاتی اور ست کرتار والی ٹوکری بسم اللہ والی جگہ پر۔

ایسے میں دونوں گھروں کی بوڑھیاں جب دوسرے کے گھر کی روٹی کی ٹوکری اپنی اپنی رسوئی سے کھا کر گھر کے آنگن میں چرخے لے کر بیٹھتیں اور باتوں باتوں میں سلمی اور میں اپنا اپنا راز کھولتے تو ہائے اللہ، واہیگورو، واہیگورو کے بولوں کے بیچ اتنی اونچی ہنسی کی آواز گونجتی کہ آنگن میں اگے برگد کے پیڑ پر بیٹھے ہوئے کالے کوے ڈر کے مارے پنکھ پھڑ پھڑا کر اڑ جاتے۔

یہ کھانے سے پرہیز کی بات صرف بڑے بوڑھوں کی حد تک ہی تھی۔ رہی ہم بچوں کی بات تو مجھے سوتے سے جگا کر سلمی اپنے ہاں کے پکے ہوئے گرم گرم کباب دے جاتی تو سردی کے دنوں میں رضائی میں بیٹھ کر چوری چوری کباب کھانے میں جو مزآتا اس کی یاد آتے ہی اب منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ اسی طرح میں بھی چپکے چپکے سلمی کو حلوہ دے کر آتا تو حلوہ سلمی کھاتی لیکن منہ میرا میٹھا ہوتا رہتا۔

ان میٹھی لذتوں سے باقی کی عمر محروم رہنے کا خیال آتا ہے تو میرے گلے میں زہر کی کڑواہٹ بھر جاتی ہے۔ میرا جسم ہی نہیں میری روح بھی تڑپنے لگتی ہے۔

حویلی کے بیچ و بیچ تقسیم کی دیوار کھنچی تو آنے جانے کے تمام دروازوں پر بھاری قفل لگا دئے گئے۔ ساری کھڑکیاں بند کر دی گئیں۔ جو دروازے اور کھڑکیاں بند نہیں ہو سکتے تھے وہاں کانٹے دار تاروں کے گھنے جال بچھ گئے۔

اب بڑھاپے میں بھی شالا پیار بھر اواں والے "لوک گیت کے بول کبھی اس پار کی

فضاؤں میں گونجتے ہیں اور کبھی حویلی کی اس پار کی فضاؤں میں

اور اس لوک گیت کے بول جب حویلی کے بیچ کھنچی کانٹوں کی تار سے سر ٹکرا کر زخمی ہو کر گذرتے ہوئے وقت کے دامن کو لہو کے چھینٹوں سے ناپاک کر دیتے ہیں تو بوڑھی ہو رہی بیسویں صدی بے چین ہو اٹھتی ہے۔ وہ سوچنے لگتی ہے کہ سمندر منتھن سے نکلنے والا امرت یا آب زمزم کہیں سے حاصل ہو جائے تو وہ اپنے دامن کو دھو کر سرخرو ہو جائے اور جب یہ امرت اسے کسی طرح ہاتھ نہیں آتا تو فضاؤں میں پھیلے لوک گیت کا درد اور بڑھ جاتا ہے۔ اور بڑھ جاتا ہے اور اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں سے برصغیر کی سرزمین بھیگ جاتی ہے۔

✓

”لاجو“

گاؤں کے ساتھ لگے رہٹ کے اولو پر جہاں گاؤں کی جوان، ادھیڑ، بوڑھی عورتیں ہر عمر کی عورتیں پانی بھرنے اور نہانے دھونے آتی تھیں، وہاں اولو کے پاس ہی نیم کے پیڑ کے تلے رہٹ کا مالک بوڑھا رلدو اپنی کھاٹ پر بیٹھا یا لیٹا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے وہاں ہونے یا نہ ہونے سے عورتوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

وہ آتی ہیں، اپنا فرض پورا کرنے کیلیے بس کہہ بھر دیتی ہیں۔ ”بابا منہ ادھر کرلو ہم نہانے لگی ہیں۔“

یہ بھی وہ بابا رلدو کو مخاطب کر کے تھوڑی کہتی ہیں۔ جیسے ہوا کو کہہ رہی ہوں یا نیم کے پیڑ کو کہہ رہی ہوں۔ ”پیڑ پیڑ۔ ذرا منہ ادھر کرلو۔ ہم نہانے لگی ہیں۔“

اور ایسا بھی نہیں کہ رلدو یہ سب سنتا نہ ہو۔ سنتا ہے، سب سنتا ہے، اور سن کر اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ بس ذرا سی گردن گھمائی اور یہ دیکھ لیا کہ اس کا اگا بیل رہٹ کھینچتا کھینچتا کہیں اولو کی طرف ادھر تو نہیں دیکھ رہا جدھر عورتیں نہا رہی ہیں۔

یہ بیل بڑا بد معاش ہے۔ دور سے ہی اسے کوئی گائے آتی دکھائی دے جائے تو سر ہلا ہلا کر آنکھوں پر چڑھے کھوپو کو ڈھیلا کر کے کنکھیوں سے جب تک گائے کو دیکھ نہیں لیتا، آگے نہیں بڑھتا، کھڑے کا کھڑا رہ جاتا ہے۔ ایسے میں اسے رلدو لاکھ ڈنڈا مارے، اس کی دم کو مروڑے لیکن وہ چلنے کا نام نہیں لیتا، چلتا تبھی ہے جب گائے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

جب عورتیں رہٹ پر نہا رہی ہوتی ہیں تو رلدو کی نظریں جھکی نہیں رہتیں بلکہ چاروں طرف پھرکی کی طرح دوڑنے لگتی ہیں۔ ایسے میں گاؤں کی طرف سے تو کوئی مرد کنوئیں کی طرف آنے کی بات تو سوچ ہی نہیں سکتا۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا انجان راہی بھی کنوئیں کی طرف آتا دکھائی دے تو رلدو کی بوڑھی ٹانگوں میں پتہ نہیں کہاں سے طاقت آجاتی ہے وہ دس بیس قدم اس طرف جا کر آنے والے کو ٹوک دیتا ہے۔

"آنکھیں پھوٹی ہیں کیا؟ کہ منہ اٹھائے چلا آرہا ہے؟ دیکھتا نہیں ادھر کنوئیں پر عورتیں نہا رہی ہیں۔" اوئے رکتا ہے کہ ٹانگیں تڑوا کر جائے گا۔ اور آنے والے کی ٹانگ پر رلدو کا پھینکا ہوا مٹی کا ڈھیلا اتنے زور سے لگتا ہے کہ آنے والے کے پاس سٹپٹا کر لوٹ جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔

اس کے لوٹ جانے کے بعد رلدو کھانستا ہوا پھر اپنی چارپائی پر آبیٹھتا ہے اور کنکھیوں سے بیل کی طرف دیکھنے لگتا ہے کہ کہیں وہ۔۔۔۔

ایسے میں وہ وقت گزارنے کے لئے اپنا حقہ گڑگڑانے لگتا ہے۔ یا حقہ کی آگ کو ہلا کر پھونک مار کر آگ تیز کرتا ہے۔ اور اگر سردیوں کے دن ہوں تو وہ الاؤ کی آگ بھڑکانے کے لئے اس میں چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں ڈالتا رہتا ہے۔

سردیوں کے دنوں میں جو عورتیں نہا لیتی ہیں وہ اپنی ساتھی عورتوں کا انتظار کرنے کے لئے کئی بار رلدو کے الاؤ کی آگ سینکنے کے لئے اس کے پاس آبیٹھتی ہیں۔ کئی تو بیٹھی اس وقت تک نہیں اٹھتیں جب تک اس کے گیلے کپڑے پوری طرح سوکھ نہیں

جاتے۔ سردیوں میں الاؤ کی آگ کے پاس سے اٹھنے کا کسی کا من نہیں ہوتا۔ اس لئے وہاں بیٹھنے کا بہانہ نکالنے کیلئے ان عورتوں میں کوئی عورت ساتھی عورتوں کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بابا لدو سے کہتی ہے۔ہاں تو بابا لدو اپنی لاجو کی کوئی بات سنا"

رہی بابا لدو کی بات تو ان عورتوں کے نہائے ہوئے جسموں سے آتی ہوئی خوشبو کو اپنے نتھنوں میں محسوس کر کے وہ تو پہلے ہی اپنی لاجو کے تصور میں کھویا رہتا ہے۔ اور ان عورتوں کے منہ سے اپنی لاجو کا نام سن کر بابا لدو کا چہرہ آگ کے شعلوں کی طرح دہکنے لگتا ہے۔ ایک لمحے بھر کے لئے اس کے چہرے کی جھریاں جیسے سکڑ کر سمٹ کر کم ہونے لگتی ہیں۔ بوڑھا کھانستا ہے اور پھر کہتا ہے:

"لاجو کی کیا بات پوچھے ہو، سوانیوں، مہارانیوں، اس کی قربت میں تو مجھے اس الاؤ سے بھی زیادہ گرمی ملتی تھی۔" یہ کہتے ہوئے وہ سامنے دیکھتا ہے۔ "وہ سامنے گلاب کے پھولوں کی باڑی دیکھ رہی ہو نہ۔ ایک بار ایسا ہوا کہ باڑی کے ایک طرف وہ پھول توڑ رہی تھی اور دوسری طرف میں۔ ایسے میں میں نے اس کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور میرے دل میں پتہ نہیں کیا آئی کہ میں نے اس کا ہاتھ چومنے کے لئے اپنی گردن آگے جھکائی تو ایک بڑا سا کانٹا میری آنکھ کی پلک میں اتنے زور سے چبھا کہ میری آنکھ سے لہو کی دھار بہہ نکلی۔ میری لاجو نے وہیں سے دوسرا ہاتھ بڑھا کر میری آنکھ سے کانٹا نکالا۔ وہ تو کہو میری آنکھ بچ گئی لیکن اس زخم کا نشان اب بھی میری آنکھ پر ہے۔" یہ کہتے ہوئے پلک پکڑ کر وہ اپنی آنکھ کا زخم دکھاتا ہے۔

اور پھر بابا لدو لاجو لاجو کا ورد کرنے لگا۔ میری لاجو نے میرا ایک کانٹا نکالنے کے لئے اپنے آپ کو لاکھ کانٹے چبھو لئے۔

وہ کہہ رہا ہے "میں نے دیکھا لاجو کے ہاتھ پاؤں، چھاتی، کمر سارا جسم کانٹوں میں پرویا گیا تھا۔ چہرے پر تو اتنی خراشیں آئی تھیں کہ کچھ پوچھو نہیں۔"

"بابا تم تو کہا کرتے ہو کہ لاجو اب بھی تمہیں وہاں گلابوں کی باڑی میں پھول توڑتی دکھائی دیتی ہے۔

”ہاں دیتی ہے۔ باڑی میں کیا مجھے تو وہ ہر پھول میں، ہر پتی میں دکھائی دیتی ہے، کبھی کبھی پھولوں کی ٹہنیوں میں کوئی ایسی شکل بنتی دکھائی دیتی ہے جیسے وہاں لاجو، پتوں کے بیچ کھڑی مسکرا رہی ہو۔“

”اور کہاں کہاں دکھائی دیتی ہے۔ جسی نے بات میں دلچسپی دکھاتے ہوئے پوچھا۔

”سردیوں کے موسم میں جب سرسوں کے پھول کھلتے ہیں تو کبھی تو وہ سرسوں کی گندلیں توڑتی ہوئی اسی طرح دکھائی دیتی ہے جیسے وہ زندگی میں توڑا کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے جیسے وہ سرسوں کے ہر پودے ہر پھول میں مسکرا رہی ہو۔

”جتنے پھول۔ اتنی لاجو؟ باپ رے باپ۔“ کسی عورت نے مذاق میں کہا۔

”تم مانو گی نہیں۔ نہیں مانو گی۔ مجھے معلوم ہے نہیں مانو گی اسلئے کچھ بتانے سے کوئی فائدہ نہیں“ رلدو ذراسی خفگی ظاہر کرتا ہوا کہتا ہے۔

”ہم مانتی ہیں، سب مانتی ہیں“ عورتیں ایک ساتھ کہتی ہیں۔

”مجھے تو کنویں کی ریں ریں کے سنگیت میں تکلے کی ٹھک ٹھک میں پانی کے اولو میں گرنے کی آواز میں لاجو بولتی ہوئی سی لگتی ہے۔“

تب تو یہ آم اور نیم کے پیڑ میں بھی لاجو دکھائی دیتی ہوگی۔

”ہاں دیتی ہے۔ ضرور دکھائی دیتی ہے۔

”ہائے توبابا۔ تمہیں پیڑوں میں پودوں میں اپنی لاجو دکھائی دیتی ہے اور ہم عورتوں میں نہیں۔ کسی عورت نے پوچھا۔

”ارے عورتوں میں تو وہ سب سے پہلے دکھائی دیتی ہے۔ یہ ہنسی جب بال دھو کر گردن کے جھٹکے سے بال پیچھے پھینکتی ہے تو ہو بہو لاجو ہی لگتی ہے۔

”ہائے میں مر گئی۔ جسی شرماتے ہوئے بولی۔

”اور براہموں کی شیلو کی گردن کا کالا تل جب بھی دیکھتا ہوں تو مجھے اس میں بھی لاجو کی جھلک ملتی ہے“

"ارے بابا تم یہ سب دیکھتے ہو، لڑکیاں ہنس ہنس کر دوہری ہوتی جا رہی تھیں۔

"اور کچھ نہ پوچھو بابا سے۔ ادھیڑ عمر کیسر و اٹھتے ہوئی بولی ورنہ پتہ نہیں... ورنہ رلدو کے حمام میں... کسی کا کیا دکھائی دے جائے۔"

اور وہ سب عورتیں ہنستی ہوئی گاؤں کی طرف چل دیں۔

رہٹ چل رہا تھا۔ رہٹ کی ریں ریں، ٹھک ٹھک اور ہوا کی سر سر کی آوازوں میں بابا رلدو کی نظریں گلابوں کی باڑی کی طرف دیکھتی ہوئی اپنی لاجو کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس کی لاجو جو چالیس سال پہلے مر گئی تھی۔

✓

"داستاں در داستاں"

میرے سامنے بیٹھی عورت میرے دل کو اتنی بھا گئی کہ مجھے پتہ نہ چلا کہ کب میرے دل نے اس کی تصویر کو اپنے اندر بسایا، کب میری نظریں اس کے چہرے سے چسپاں ہو گئیں اور کب میرے ہاتھ کی انگلیوں میں حرکت پیدا ہوئی اور کب اُس کے خوبصورت چہرے کے تمام نین نقش کاغذ پر منتقل ہو گئے۔

ہو بہو وہی چہرہ۔

وہی لمبے لمبے بال چوڑا ماتھا، اس کے نیچے بڑی بڑی بادام سی آنکھیں۔ ستواں ناک اور اس کے نیچے رس بھرے ہونٹ۔

مجھے کچھ بھی احساس نہیں تھا کہ کب سے میری نظریں کبھی اس عورت کے چہرے کی طرف دیکھتی تھیں اور کبھی کاغذ پر بنی تصویر کی طرف۔ اس کا احساس تو مجھے اس وقت ہوا جب میں نے محسوس کیا کہ کاغذ پر بنی تصویر جیسے سانس لے رہی ہو۔

ان دونوں کی مشابہت دیکھ کر میرے دل کو تسکین کا سا احساس ہو رہا تھا۔

لیکن اس عورت کی بات کرنے سے پہلے میں آپ کو ایک اور بات سنانا چاہتا ہوں۔

یہ بات بہت پرانی ہے۔ اس زمانے کی جب میری عمر بیس بائیس سال کی تھی۔ اس زمانے میں مجھے کہیں سے ایک پرانی کتاب ہاتھ آگئی۔ جس میں کسی نے ویاس رشی کی پورانک گاتھا پر مبنی کوئی لمبی گاتھا لکھی تھی۔ اس گاتھا میں ایک رشی کنیا کا ذکر آتا ہے جو پھولوں کے وستر پہنے ایک ندی پر ہر روز نہاتے جاتی ہے اور رشی کی پاٹھشالہ میں پڑھنے والا ایک ودیارتھی جو اس رشی کنیا کے حسن پر مرمٹا تھا وہ ندی کے کنارے اُگے ایک پیڑ کی شاخوں کی آڑ میں بیٹھ کر اس رشی کنیا کے حسن کا نظارہ کیا کرتا تھا۔

کہانی میں پھولوں کے وستر پہنے ہوئے رشی کنیا کا حسن دیدنی تھا۔ رنگ برنگے پھولوں کے بیچ سے جھانکتا ہوا اس کا بدن بھی جیسے پھول سا ہی ہو گیا تھا۔ جس پگڈنڈی پر چلتی ہوئی وہ آتی تھی وہ بھی اس کے نرم و نازک پاؤں کی آہٹ پاتے ہی مخملی بن جاتی تھی۔ جدھر جدھر سے وہ گزرتی تھی ادھر کی ہوائیں مہک اٹھتی تھیں۔ فضائیں چہک اٹھتی تھیں۔ پکشیوں پر جادو سا چھا جاتا تھا اور وہ گھونسلوں میں اپنے جوڑوں کے ساتھ بیٹھ کر چونچ سے چونچ ملانی شروع کر دیتے تھے۔ ایسے میں رشی کنیا کو دیکھ کر پیڑ کی شاخوں کے پیچھے چھپے ودیارتھی پر نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اس کی آنکھیں مند جاتیں اور اس کے تصور میں نت نئی دنیا بس جاتی۔

لیکن ایک دن اس کی چوری پکڑی گئی۔ رشی کنیا ندی کے پانی میں اتری تو پیڑ کا لمبا ہوتا ہوا سایہ پانی میں چھلک رہا تھا۔ اس سائے میں ایک نوجوان کی تصویر ابھری تو رشی کنیا نے نظریں اٹھا کر پیڑ کی طرف دیکھا۔ وہ شرماتی، لجاتی، مسکراتی اس پیڑ کے نیچے آئی اور بولی:

اگر تمہیں اس حالت میں میرے روپ کو نہارتے ہوئے کوئی دیکھ لے تو معلوم ہے کہ تمہیں کیا سزا ملے گی؟

ودیارتھی چپ رہا۔

پہلے تو میرے پتا رشی مہاراج تمہیں گورو کل سے باہر نکال دیں گے۔ پھر دیش کا

راجہ تمہیں اپنے دیش سے نشکاشت کر دے گا۔ اور پھر تمہیں زندگی بھر ویرانوں اور جنگلوں میں بھٹکنا پڑے گا۔

”جب تم میرے تصور میں بسی رہو گی تو زندگی کے کانٹے بھرے راستے بھی مجھے پھولوں سے ڈھکے ہوئے سے لگیں گے۔

ودیارتھی کی آواز میں اپنے لئے پیار کے ساگر کو چھلکتے دیکھ کر رشی کنیا نے نظر بھر کر اس ودیارتھی کی طرف دیکھا اور اسے لگا جیسے اس کی موہنی صورت اس کے دل میں نقش ہوتی جا رہی ہے۔

چند گھڑیاں وہ اسی کیفیت سے دوچار رہی اور پھر جب اسے احساس ہو گیا کہ وہ بھی اپنا دل اس ودیارتھی کے ہاتھ ہار چکی ہے تو اس سے پیدا ہونے والی صورت حال پر غور کرنے کے بعد بولی: ”اگر تم مجھے اپنا بنانا چاہتے ہو تو اس کے لئے تمہارے پاس صرف ایک ہی راستہ ہے کہ گکشا میں تم سب سے اچھا ودیارتھی بن کر دکھاؤ۔ گوروکل کی یہ پرمپرا ہے کہ اگر کسی رشی کی کنیا جوان ہو تو وہ اس کی شادی اس ودیارتھی سے کرتے آئے ہیں جو خود کو سب سے آگے ثابت کرے۔“

گاتھا اس طرح آگے بڑھتی ہے کہ اس دن سے ودیارتھی نے اس حد تک اپنا دھیان اپنی ودیا میں لگایا کہ اس کے پاس محبوبہ رشی کنیا کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح کئی سالوں کی محنت کے بعد وہ سب ودیارتھیوں سے پالا مار گیا۔ وہ چاروں ویدوں کا گیاتا بنا۔ ساری سمرتیاں اور پران اسے یاد ہی نہیں ان کا نچوڑ اس کے دل میں بسا تھا۔

ودیارتھی خوش تھا کہ اپنی محنت کا صدقہ جہاں وہ سیانا پنڈت بن گیا ہے، وہاں عملی زندگی میں داخل ہوتے ہی رشی کنیا سی خوبصورت لڑکی اس کے جیون کی ساتھی بنے گی۔

لیکن جیسے جیسے انتم سماروہ کا دن نزدیک آرہا تھا ویسے ویسے رشی کو یہ فکر ستا رہی تھی کہ اگر پرمپرا کے مطابق اس نے پنی کنیا کی شادی نردھن برہمن لڑکے سے کر دی تو اسے زندگی کا کوئی ایسا سکھ حاصل نہیں ہو سکے گا جو صرف دھن دولت کی مدد سے ہی حاصل ہو

سکتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پھول سی نازک اس کی کنیا غریبی کے دکھ بھوگے۔

آخر کافی سوچ وچار کے بعد رشی نے دیش کے راجہ کو اپنے آشرم میں آنے کا نمنترن دے دیا۔ راجہ آیا تو رشی نے اپنی کنیا کو اس کی سیوا کرنے کیلئے مامور کیا اور اس طرح ودیار تھی کے دیکھتے دیکھتے راجہ رشی کنیا کو بیاہ کر لے گیا۔

پتہ نہیں کیوں یہ گاتھا میرے دل و دماغ پر پوری طرح چھا گئی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ تصور ہی تصور میں میرے سامنے ایک دریا بہنے لگتا۔ پھر رشی کنیا ہلکے ہلکے ریت پر اپنے پاؤں رکھتے ہوئے آتی اور پھر وہ دریا میں اتر کر مچھلی کی طرح سیر کرنے لگتی۔

کبھی میں دیکھتا کہ وہ ان منے سے راجہ کے کَکش میں کھانا لے کر جا رہی ہے اور بار بار پلٹ پلٹ کر ادھر دیکھ رہی ہے جہاں اس کا پریمی چھپ چھپ کر اسے دیکھتا ہوا اداس کھڑا ہے۔

پھر کبھی ایسا ہوتا کہ راجہ کے گھوڑے پر سوار ہو کر رشی کنیا خون کے آنسو روتی چلی جا رہی ہے اور اس کا پریمی ہے کہ ایسے بلک رہا ہے جیسے سوکھی ریت پر مچھلی تڑپتی ہے۔

اس کہانی کے کردار اکثر رشی، رشی کنیا اس کا پریمی، یہاں تک کہ دریا، دریا کی طرف جانے والی پگڈنڈی دریا کے کنارے والا پیڑ مختلف شکلیں دھار کر میرے سپنوں میں آتے اور صبح اٹھ کر میں سوچنے لگتا کہ آخر اس کہانی اور اس کے کرداروں سے مجھے کیا لینا دینا ہے۔ آخر ہے تو یہ محض ایک کہانی ہی جس کے کردار ویاس رشی کی کلپنا شکتی کا نتیجہ ہیں۔

لیکن کبھی کبھی مجھے یہ احساس ضرور ہوتا جیسے یہ کردار فرضی نہیں بلکہ حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کہانی، کہانی کے ماحول اور اس کے کرداروں سے میرا کوئی اٹوٹ رشتہ ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ یہ کہانی مختلف روپ دھار کر میری زندگی کے راستے میں اکثر آکھڑی ہوتی۔

ایک بار ایسا ہوا کہ محض اتفاقیہ طور پر میں اورنگ آباد کے دیہی علاقے سے گزر رہا

تھا کہ مجھے کچھ گپھائیں دیکھنے کا موقع ملا۔ وہاں دیواروں میں کھدی ہوئی ایک تصویر کے سامنے میں ٹھٹھک گیا تو وہاں کے گائیڈ نے مجھے بتایا کہ اس دیوار کی تمام مورتیوں میں ویاس رشی کی اس گاتھا کو مورتی کار نے انکت کیا ہے جس میں رشی اپنی کنیا کے پریمی کا حق چھین کر اس کی شادی وقت کے راجہ سے کر دیتا ہے۔ یہ دیکھئے یہاں یہ پریمی پیڑ کی شاخوں کی آڑ میں بیٹھا ندی کی طرف جا رہی رشی کنیا کی طرف چوری چوری دیکھ رہا ہے۔ دیکھئے یہ اپنے آپ کو دنیا کی نظروں سے چھپانے کے لئے کس طرح سکڑ کر بیٹھا ہے۔

یہاں پریمی اور پریمیکا دونوں ندی کے کنارے کھڑے ہو کر دور افق کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اس مورتی میں دونوں کی آنکھوں سے ان کا ایک دوسرے کے لئے پیار اُمڈا پڑ رہا ہے۔

اور اس آخری مورتی میں، مورتی کار نے وہ درش بہت خوبصورتی سے نبھایا ہے جس میں راجہ، رشی کنیا کو اپنے گھوڑے پر بٹھا کر لے جا رہا ہے اور بیچارے ودیارتھی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہہ نکلی ہے۔ اس درش میں اثر پیدا کرنے کے لئے مورتی کار نے ایسے پتھر کو چنا ہے جس میں لگتا ہے کہ پورے پتھر کے ذرے ذرے سے پانی رس رہا ہو۔ پورا پتھر ہی پریمی کے آنسوؤں سے بھیگا بھیگا سا لگتا ہے۔

اس گپھا سے باہر آتے ہوئے میری آنکھیں بھی ٹپ ٹپ یوں برس رہی تھیں جیسے رشی کنیا اور اس کے پریمی کا دکھ میرا دکھ ہو۔ ان آنسوؤں سے میری زندگی ایک عرصے تک بھیگی بھیگی سی رہی۔ کبھی رشی کنیا میرے سپنوں میں آجاتی۔ کبھی پریمی۔ اس طرح صبح اٹھتا تو رات کے سپنے کے زیر اثر میری صبح بھی اداس ہو جاتی۔

کافی عرصہ گزر جانے کے بعد یہ کہانی ایک بار پھر میرے سامنے زندہ و جاوید ہو کر آگئی۔ واقعہ دہلی کا ہے۔ وہاں کسی تھیٹر میں ڈراموں کا مقابلہ چل رہا تھا۔ اس میں آسام سے آئی ہوئی ایک ڈرامہ کی ٹولی نے جو ڈرامہ پیش کیا وہ پھر اسی رشی کنیا کی کہانی پر مبنی تھا۔ ڈرامہ دیکھتے ہوئے ایسا لگتا تھا کہ ویاس رشی کے کردار وقت کی حدوں کو پھلانگ کر ہمارے آج کے دور

میں پہنچ کر اپنی زندگی جی رہے ہوں۔ اپنی کہانی دہرا رہے ہوں۔ اس ڈارمہ میں ساری کہانی منی پوری نرتیہ کے الگ الگ انگوں کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ کبھی پریمی ناچ رہا ہے تو کبھی رشی کنیا۔ کبھی رشی اور کبھی راجہ۔ لیکن اس کے آخری حصے میں تو کلاکاروں نے جیسے جان ڈال دی۔ جب راجہ، رشی کنیا کو بیاہ کرلے جانے لگتا ہے تو اس کا پریمی ناچتے ہوئے کبھی رشی کی سمادھی توڑنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا ادھر جاتا ہے، جہاں رشی کنیا کو راجہ نے اپنے مضبوط ہاتھ سے پکڑ رکھا ہے۔

تھوڑی دیر بعد یہ منظر بدل گیا۔ رشی کنیا، راجہ کے مضبوط ہاتھ سے خود کو چھڑا کر تیزی سے گھومتی ہوئی تانڈو ناچ ناچنے لگی۔ جیسے جیسے رشی کنیا کے ناچ میں تیزی آتی گئی، راجہ نے محسوس کرنا شروع کیا جیسے چاروں دشائیں اس کے خلاف ہوگئی ہوں۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی ٹانگوں میں جیسے ناچنے کا دم ہی نہ رہا۔ یہاں تک کہ وہ رشی کنیا کی طرف اپنا ہاتھ ہی نہیں اٹھا پاتا اور آخر راجہ گھبرا کر کمزور قدموں سے چلتا ہوا اسٹیج سے باہر نکل جاتا ہے۔ راجہ کے باہر جاتے ہی ودیارتھی کے قدموں میں نئی جان آجاتی ہے۔ صدیوں سے اس کی زندگی کا حق چھیننے والے راجہ کے میدان سے بھاگتے ہی وہ یوں محسوس کرتا ہے جیسے اب اسے اس کی زندگی مل جائے گی۔ اس لئے ناچتے ہوئے اس کے چہرے پر خوشی کے آثار ہیں۔ رشی کنیا بھی خوشی سے ناچتی ہوئی بے سدھ ہوئی جارہی ہے۔ وہ دونوں ناچتے ناچتے ایک دوسرے کے قریب آگئے لیکن جب پریمی رشی کنیا کا ہاتھ پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا ہے تو رشی کنیا اس کے ہاتھ کو جھٹک دیتی ہے۔

جس پریمی نے دو ہزار سال تک راجہ کے چنگل سے چھڑانے کیلئے کچھ نہیں کیا میں اسے اپنے پیار کے قابل نہیں سمجھتی۔

کہانی کے اس نئے موڑ کو سن کر ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا

لیکن یہ تالیاں یکلخت بند ہوگئیں۔ سٹیج پر منظر بدل گیا تھا۔

رشی کنیا کا باپ تیز تیز ناچتا ہوا آیا اور ویاس رشی کی مورتی کے سامنے گڑگڑانے لگا۔

”اے ویدوں کے رچیتا، اے گاتھاؤں کے رچیتا، بڑا انرتھ ہو گیا، پاتروں نے تمہاری کہانی ہی بدل ڈالی۔ میری کنیا راجہ کے ساتھ جانے کو تیار نہیں۔ اور تو اور اس نے پرانے پریمی سے بھی اپنا ناطہ توڑ لیا ہے۔ اب کیا ہو گا میں لٹ گیا، میں برباد ہو گیا۔“

رشی کنیا کا باپ ویاس رشی کی مورتی کے سامنے ایسے ورلاپ کر رہا تھا جیسے آج کل کا کوئی باپ اپنی اولاد کے اپنی مرضی سے بیاہ کر لینے پر روتا کراہتا ہے۔

ناظرین سانس روکے بیٹھے تھے۔ رشی بڑا پہنچا ہوا رشی تھا۔ اور اس کی پکار میں درد تھا۔ تبھی معجزہ ہوا۔

ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے دیکھا کہ ویاس رشی کی مورتی دھیرے دھیرے سجیو ہونے لگی اور دیکھتے دیکھتے وہ پتھر کی مورتی ہاڑ مانس کے سانچے میں ڈھل گئی۔ ویاس رشی نے آنکھیں کھولیں اور انہوں نے سوالیہ نظروں سے رشی کی طرف دیکھا۔

لوگوں نے دیکھا کہ ویاس رشی کو سجیو ہوا دیکھ کر رشی کے چہرے پر امید کی کرن پھوٹی اور اس نے اپنی آواز میں درد بھر کر کہا کہ گھور انرتھ ہو گیا ہے اور پھر سارا ماجرا بیان کیا کہ کس طرح پرانی پرمپرا ٹوٹی اور ادھرم ہو گیا۔

ویاس رشی بڑے دھیان سے رشی کی باتیں سنتے رہے اور اس کی بات ختم ہوتے ہی ویاس رشی کے ہونٹ وا ہوئے اور لوگوں نے دیکھا اور سنا کہ اس کے ہونٹوں سے الفاظ امرت بانی کی طرح قطرہ قطرہ ٹپک رہے ہیں۔

کوئی انرتھ نہیں ہوا اور نہ ہی ادھرم۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے کمزور پاتر میں آج اتنی طاقت آگئی ہے کہ اس نے اپنا حق چھین لیا ہے، اور وہ بھی سب سے طاقتور دشمن سے۔“

ویاس رشی ایک لمحے کے لئے رکے اور پھر فرمایا۔ ”میں نے تو ان پاتروں کی رچنا ہی اس امید سے کی تھی کہ ایک نہ ایک دن ان کے اندر زندگی کروٹ لے گی۔ اگر یہ دو ہزار سال بعد بھی ممکن ہو پایا ہے تو بھی مجھے خوشی ہے کہ میرا خیال پایہ تکمیل کو پہنچا۔“ یہ کہتے ہوئے ویاس رشی نے، رشی مہاراج کو آشیرواد دیا اور ان کا ہاڑ مانس کا جسم پھر سے پتھر کی مورتی میں ڈھل گیا۔

ڈرامے کے اختتام پر جب رشی کنیا فوٹوگرافروں اور اخبار والوں اور دوسرے ناظرین سے مل رہی تھی تو اس دوران راجہ کا کردار نبھانے والا نوجوان اور پری کا کردار نبھانے والا نوجوان دونوں ایک طرف کھڑے ہو کر رشی کنیا کے فرصت پانے کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن رشی کنیا نے فارغ ہونے کے بعد بھی ان کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔

اور پھر اچانک یہ ہوا کہ وہ ہلکے ہلکے قدموں سے چلتی ہوئی سیدھی میرے پاس آ کر وہاں کھڑی ہو گئی۔ جہاں میں ایک کونے میں کھڑا اپنی بنائی ہوئی تصویر کو رشی کنیا کے زندگی سے بھرپور چہرے سے ملا کر دیکھ رہا تھا۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا اور ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے وقت دو ہزار سال پیچھے چلا گیا ہو۔ رشی کنیا دھیرے دھیرے چلتی ہوئی آ رہی ہے اور میں دریا کے کنارے اُگے پیڑ کی شاخوں میں سمٹا ہوا اس کے حسن کا نظارہ کر رہا ہوں۔

میں بت بنا اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔

بت بنے رہنے کے دن ہم بہت پیچھے گپھاؤں کے اندھیروں میں چھوڑ آئے ہیں۔ اب ہاڑ مانس کے جسموں میں جب ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا ہے تو آؤ ہم دونوں مل کر نئی زندگی کی شروعات کریں۔

ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لئے اور دل میں لاکھوں ارمان لئے زندگی کے بہتے ہوئے دریا میں پانی کے ساتھ یوں اٹھکھیلیاں کرنے لگے جسے ہم ہزاروں سال پہلے کرنا چاہتے تھے۔

ہال سے باہر آتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ ویاس رشی سجیو ہو کر ہمیں آشیرواد دے رہے تھے۔

✔

دودھ کی گنگا

گلابے کی منگنی جب شہلا سی خوبصورت لڑکی سے ہوئی تو سب لوگ اسے مبارکباد دیئے آئے۔

”بڑی قسمت والے ہو گلابے۔ لڑکی کیا ہے شعلہ ہے شعلہ۔ ایسی خوبصورتی تو ہم نے گجروں میں دیکھی نہ سنی۔“

اس کا حسن ہے کوئی۔ توبہ توبہ بے نظیر۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ اس کے حسن کا شعلہ ایسا بھڑکتا ہے کہ ندی میں نہانے جائے تو ڈر لگا رہتا ہے کہ ندی کے پانی میں آگ نہ لگ جائے۔

”تب تو بھائی میں نہیں کرتا شادی اس سے۔ گلابے نے کہا۔ اگر ندی کے پانی کو آگ لگ گئی تو میری تو بھینس پیاسی مر جائیں گی۔ “اور پھر ندی سوکھ گئی تو گجر لوگوں کا کیا ہو گا۔“

گلابے کی ماں نے بیٹے کے منہ سے یہ بات سنی تو کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کہتی

ہوئی بولی نہ پیٹا نہ۔ ایسے مبارک دن ایسی منحوس بات منہ سے نہیں نکالتے۔ لڑکی خوبصورت ہے تو یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تمہاری اندھیری جھونپڑی میں رات کو چراغ جلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

ندی میں آگ لگ جانے والی مذاق میں کہی ہوئی کسی کی بات سے گلابے کو اپنی بھینسوں کی فکر اس لئے ہوئی تھی کہ اسے اپنی بھینسوں سے بے حد عشق تھا۔ اپنی بالی عمر میں ہی گلابے کو بھینسوں کو پالنے پوسنے، ان سے اچھا دودھ لینے، اچھی نسل تیار کرنے کے بارے میں اتنا علم تھا کہ بڑے بوڑھوں کو بھی بھینسوں کی خرید و فروخت کے وقت گلابے کی رائے کی ضرورت پڑتی تھی۔ نئی بھینس خریدنی ہو تو وہ اسے اپنے ساتھ ضرور لے جاتے۔ گلابا بھینس کے دانت گنتا، کان اور سینگ کی بناوٹ دیکھتا، تھنوں کی نرمی اور لمبائی کو پرکھتا۔ یہاں تک کہ بھینس کے کھروں کی بناوٹ بھی اگر اسے پسند نہ آتی تو نئی بھینس خریدنے سے منع کر دیتا۔ اس کے کھر آگے سے زیادہ چوڑے ہیں، اسلئے اس کا ہوانہ بڑا نہیں ہو پائیگا۔" وہ کہتا بزرگوں کو اس کی بات پر یقین نہ آتا۔ لیکن جب بھی اس کی رائے کو مانے بغیر سودا کیا، انہیں بعد میں پچھتانا پڑا۔

"گلابے جیسے ہوشیار اور ماہر لڑکے کو شیلا سی خوبصورت منگیتر ملنی ہی چاہئے تھی۔ گلابے کے ایک بزرگ نے کہا۔

"منگیتر کیوں کہتے ہو چوہدی۔ بیوی ہی کہہ دو" گلابے کی ماں بولی "میں اب گلابے کی شادی میں دیر تھوڑی ہونے دوں گی۔" بس چٹ منگی پٹ بیاہ والی بات پکی کرنی ہے مجھے تو۔"

لیکن دیر ہوتی چلی گئی۔

ادھر ماں نے تو چاند سی بہو گھر لانے کے لئے، اسکے لئے ٹوٹب چھلہ بنانے کے لئے پیسے جوڑنے شروع کر دیئے ادھر گلابے کا اپنی منگیتر سے عشق ہونے کے بجائے، ایک بھینس سے پیار بڑھ گیا۔ کہاں ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جدھر شیلا جیسی خوبصورت منگیتر اپنی

بھینس چرانے کے لئے لے جائے اسی چراگاہ کی طرف گلابا بھی اپنی بھینسوں کو ہانک دے۔ ملنے کے لاکھ بہانے لڑکے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ پیار کی بلندیوں کو نہ چھوا جائے، لیکن کنوارے پن میں آنکھوں ہی آنکھوں میں تو ایک دوسرے کے دل میں اترنے کو دل مچل ہی جاتا ہے منگنی کے بعد۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہو پایا۔ ہوا اس کے بالکل برعکس۔

جس پہاڑی کی ڈھلان میں گلابے اور شیلا کا قبیلہ اپنی بھینسوں کے ساتھ پڑاؤ کئے ہوئے تھا، اس کے پاس سے گزرنے والی جرنیلی سڑک پر ایک دن ایک اور گجر قبیلہ گزرا تو ندی میں بھینسوں کو پانی پلانے کے لئے تھوڑی دیر رکا۔ گلابا اس وقت پاس ہی ایک چٹان پر بیٹھا اپنی بھینسوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہیں سے ان کی طرف پانی پینے آئی ایک بھینس کی چال پر مر مٹا۔

ایسی خوبی تو اسے شیلا کی چال میں بھی کبھی نظر نہیں آئی تھی۔

گلابے نے اسی وقت اپنے کسی ساتھی کو اپنی بھینس سونپیں اور پلک جھپکتے میں اس نئی بھینس کے پاس پہنچا۔

بھینس کیا تھی۔ نور تنی۔ گلابے جیسے جوہری نے ایک ہی نظر میں سچے ہیرے کو پہچان لیا۔ بھینس کو بیانے میں ابھی دو ڈھائی مہینے باقی تھے۔ اس کے تھنوں میں ابھی دودھ نہیں آیا تھا لیکن ہوانے میں بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ ہوانے کی بناوٹ کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ پہلی بار بیانے کے بعد تقریباً پندرہ کلو اور دوسری بار سے کم از کم بیس کلو دودھ اس سے مل سکتا ہے۔ کھر تو اس کے ابھی سے ہی مکھن کے پیڑے کی طرح خوبصورت تھے۔ پونچھ اتنی لمبی کہ اسکی منگیتر کی چوٹی کی لمبائی مات پڑتی نظر آتی تھی۔

گلابا بھینس کی خوبیوں سے سحر زدہ ہو کر اس کے پیچھے پیچھے چلتا جب مالک کے پاس پہنچا تو اس کی پارکھی نظر نے بھی گلابے کے اندر کے گاہک کو پہچان لیا تھا۔ اب تک وہ اس بھینس کے دس ہزار مانگتا آیا تھا لیکن گلابے کی خریدنے کی خواہش میں شدت دیکھی تو اس نے دام پوچھنے پر بیس ہزار مانگ لئے۔

''لوگ کہتے ہیں دام بیچنے والے کی چیز کا نہیں خریدنے والے کی خواہش کا ہوتا ہے۔''گلابے کی اسی کمزوری کا فائدہ بھینس کا مالک اٹھا رہا تھا۔ اس نے تو پہلی ہی نظر میں تاڑ لیا تھا کہ یہ لڑکا اس بھینس کو خریدے گا ضرور۔ اس لئے عمدہ دام ملنے کی امید میں اس گجر نے آگے بڑھنے کا خیال چھوڑ کر وہیں پر پڑاؤ ڈال دیا۔

گلابے کی حالت خراب۔ اسے کسی پل چین نہیں پڑتا تھا۔ اپنی بھینسوں کی طرف دیکھتا تو اسے لگتا کہ اس کے پاس لوگ تو ہیں لیکن لوگوں کے دلوں میں راج کرنے والی مہارانی نہیں ہے۔ اپنی بھینسوں کے لئے عوام کا استعارہ۔ اسے دل میں ہنسی بھی آئی۔ لیکن پھر بھی اس کے ذہن میں یہ صاف تھا کہ اس بھینس کے بغیر اس کی اپنی بھینسیں محض ایک جھنڈ ہیں۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے وہ سویا تو کئی روپ دھار کر وہ بھینس اس کے سپنے میں آئی اور اس نے سپنا دیکھا کہ ایک دودھ کی ندی بہہ رہی ہے۔ گنگا جتنی بڑی ندی۔ پاک اور پوتر۔ اس کے کنارے لوگ آباد ہیں۔ خوبصورت قصبے، گاؤں اور شہر، لوگ تندرست اور خوشحال، چہروں پر زندگی دمکتی ہوئی۔ وہ حیران ہو رہا تھا سپنے میں کہ یہ دودھ کی نہر آئی کہاں سے۔ وہ اس کے کنارے کنارے چلتا ہوا اس گنگا کے گومکھ تک پہنچ گیا۔ وہاں دیکھا تو وہ بھینس کھڑی ہے اور اس کے تھنوں سے، چاروں تھنوں سے متواتر دودھ کی دھار بہہ رہی ہے اور وہی دھاریں بہتی ہوئی، اس دودھ کی ندی کی شکل اختیار کر رہی ہیں۔

''بڑا عجیب سپنا تھا'' صبح اٹھ کر گلابے نے سوچا۔ اپنی ساری جمع پونجی اکٹھی کی اور نئے گجر کی جھولی میں پندرہ ہزار ڈال دئے، بس یہی ہے میرے پاس۔ چچا یہ لے لو اور بھینس میرے حوالے کر دو۔''

چچا کا دل کہتا تھا لے لو اس بھینس کے لئے اتنی رقم اور کوئی نہیں دے گا''۔ لیکن کچھ اور مل جانے کی امید میں وہ دکھاوا کرنے لگا۔ ''نہیں بھائی۔ نہیں۔ اتنا خسارہ میں نہیں کھا سکتا۔ پورے بیس ہزار روپے لوں گا۔''

اتنے میں اس کی لڑکی گھر آئے مہمان کے لئے دودھ میں بنا ہوا میٹھا روٹ اور لسی

لے آئی۔ اپنی لڑکی کو سامنے دیکھ کر اس کے دل میں خیال کوندا۔ اس نے ایک نظر اپنی لڑکی کی طرف اور دوسری طرف گھر آئے گلابے کی طرف دیکھا۔ پھر اٹھ کر بیوی سے کھسر پھسر کی اور اس کے حامی بھرنے پر گلابے سے بولا۔"

"تمہارا سودا ایک شرط پر منظور ہو سکتا ہے؟"

'گلابے کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی" وہ کیا؟ اس نے پوچھا۔

"وہ یہ کہ تم میری لڑکی سے شادی کرلو۔"

"لیکن میری منگنی تو ہو چکی ہے۔"

منگنی ہی ہوئی ہے۔ بیاہ تو نہیں۔ سوچ لو۔

گلابا سوچتا کیا؟ اس کے دل و دماغ پر بھینس چھائی ہوئی تھی۔ اس نے تصور کی آنکھوں سے دیکھا بھینس کی کشش کے سامنے، شہلا کی خوبصورتی مات پڑ رہی تھی۔ اس لئے وہ بولا "مجھے منظور ہے"

بھینس کے مالک نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ گلابے کے دیئے ہوئے پندرہ ہزار تہبند کے پلو سے باندھے۔ مولوی بلایا، نکاح پڑھوایا اور پہلے گلابے کے ہاتھ میں لڑکی کا ہاتھ دیا بعد میں بھینس کی زنجیر تھمائی۔

گلابا نئی بھینس اور نئی دلہن کو لے کر جب اپنے پڑاؤ پر پہنچا تو اس کے تنبو کے گرد سارا قبیلہ اکٹھا ہو گیا۔ کسی کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ایک بھینس کی خاطر گلابا شہلا جیسی خوبصورت منگیتر کو چھوڑ سکتا ہے۔

دلہن کی طرف تو کسی کا دھیان ہی نہیں جا رہا تھا۔ عام سی لڑکی تھی، قبول صورت، سب لوگ تو بھینس کی طرف دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں عش عش کر رہے تھے۔ لیکن کہہ نہیں رہا تھا کوئی کچھ۔ کیونکہ ایک انہونی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ حیران بھی تھے اور ناراض بھی۔

شہلا نے سنا تو وہ بھی بھاگی آئی۔

شہلا کو دیکھ کر گلابے کی ماں نے ایک نظر شہلا کو دیکھا اور پھر گلابے کی دلہن کی طرف اور شہلا سی خوبصورت لڑکی کے سامنے جب دلہن کا روپ پھیکا پھیکا سا لگا تو اسنے یوں محسوس کیا جیسے شہلا کے حسن کی روشنی سے اس کا گھر محروم ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور وہ بھرے ہوئے گلے سے گلابے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ''گلابے یہ تو نے کیا کیا؟ شہلا کو چھوڑ کر تو یہ بھینس اٹھا لایا۔''

پتہ نہیں اس کا اشارہ بھینس کی طرف تھا یا نئی دلہن کی طرف جس کا جسم قدرے مٹاپے کی طرف مائل تھا۔

پاس کھڑے ہوئے لوگ یہ سن کر ہنسنے لگے۔

گلابا چپ رہا۔

ماں نے گلابے کو پھر جھنجھوڑا ''گلابے؟'' میں پوچھتی ہوں تم نے کیا کیا؟

گلابے نے پیار سے اپنی نئی بھینس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''ماں تم ہی نے بچپن میں مجھے ایک کہانی سنائی تھی کہ ایک تھا بادشاہ

''بادشاہ کو گولی مارو۔ جو میں نے پوچھا ہے، وہ بتا'' ماں غصے سے بولی۔

وہی بتا رہا ہوں ماں۔ اس بادشاہ کا ایک بیٹا گویا تھا۔ بہترین گویا۔ تم نے بتایا تھا کہ وہ شہزادہ گاتا تھا تو آسمان میں اڑتے ہوئے پنکشی بھی گانا سننے کے لیئے رک جاتے تھے۔ لیکن بادشاہ نے اسے راج پاٹ سے تلانجلی دے دی۔ اس نے کہا تھا۔ راجہ کا دھرم ہے۔ اپنے ملک کے نظم و نسق کو سنبھالنا اپنے عوام کو خوشحال بنانا۔ یہی اچھے راجہ کی پہچان ہے۔ گویا ہونا اس کی پہچان نہیں ہو سکتی''

''اس کہانی کا اس بھینس سے کیا تعلق؟'' قبیلے کے لوگوں میں سے کسی نے پوچھا۔

'' ہے۔ گلابا بولا استاد کی پہچان ہے تعلیم دینا، مولوی کی پہچان ہے مذہب کا عالم ہونا اسی طرح میں گوجر ہوں اور گجر کی پہچان دودھ دینے والی اچھی بھینس ہو سکتی ہے۔ خوبصورت بیوی تو نہیں۔

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی" کسی نے کہا۔

اپنی نجی خوشیوں کو تلانجلی دے کر راجہ اور رنک اپنے اندر یہ پہچان پیدا کر لیں تو اس کے معنی آپ کو خود بخود سمجھ آجائیں گے۔

یہ کہتے ہوئے گلابا اٹھا بھینس کو کھونٹے پر باندھا اور دلہن کو لے کر جب وہ اپنے جھونپڑے میں داخل ہو رہا تھا تو اس کے تصور میں دودھ کی گنگا بہہ رہی تھی۔

✓

جھوٹی بھی اور سچّی بھی

بات اُن دنوں کی ہے جب لکھنؤ کا حضرت گنج جوان تھا اور اس کی جوانی کا راز تھی مسز تیواری۔ مسز تیواری جو ادھیڑ عمر میں کالے بالوں کے اوپر چاندی کی طرح چمکتی اپنی ایک سفید لٹ پر نفاست سے ہاتھ پھیرتی ہوئی حضرت گنج میں چہل قدمی کے کے لیے نکلتی تو کافی ہاؤس میں بیٹھے شاعروں ادیبوں، یونیورسٹی کے پروفیسروں اور پینٹروں کے بیچ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہو جاتے اور مسز تیواری کے ماتھے پر چمکتی حُسن کی چاندنی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کافی ہاؤس کی میزیں خالی ہونے لگتیں۔

مسز تیواری کے آتے ہی زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔

آدمیوں کی بات تو چھوڑیے۔ اس کے آنے سے حضرت گنج کے فٹ پاتھ بج بج جاتے۔ لولین کے برآمدے کے پتھر اس کے قدموں کے آگے بڑھنے کے ساتھ کھٹ کھٹ کا راگ الاپنے لگتے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک روز امرت لال ناگر اپنے نرم لب و لہجے میں کسی کہانی

کی خوبیاں گنوا رہے تھے۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتوں سے مستفید ہو رہا تھا۔ اچانک دیکھا کہ کونے میں بیٹھے ہوئے اپنے سارے یار لوگ اٹھے اور باہر جاتے ہوئے مسز تیواری کے آنے کا مخصوص اشارہ کر گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ ان کے جاتے ہی میں کرسی پر بیٹھا پہلو بدلنے لگا۔

ناگر صاحب تھے کہ اپنی بات ختم کرنے میں ہی نہیں آ رہے تھے۔ آخر بہت دیر بعد جب انہیں احساس ہوا تو میری بے چینی کو بھانپ کر بولے:

"تمہارے ساتھی کسی زندہ کہانی کی تلاش میں بہت پہلے چلے گئے ہیں۔ جاؤ تم بھی جاؤ۔ لیکن ٹھہرو۔ پان کی طلب تو مجھے بھی ہو رہی ہے"۔

اور وہ خراماں خراماں میرے ساتھ چل دیے۔

ایک روز افسانہ نویس اقبال مجید اپنی ہونے والی بیوی سے عشق کی داستان بڑے ڈرامائی انداز میں، آواز کے پورے اتار چڑھاؤ کے ساتھ چہرے پر وہی تاثرات پیدا کرتے ہوئے سنا رہے تھے:

"ارے بھائی۔ ابھی تک دور سے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہو رہے تھے۔ لیکن آج تو غضب ہو گیا میں انہی کے خیال میں ڈوبا ہوا تھا اور من ہی من میں سوچ رہا تھا کہ عشق کی بیل سرے کیسے چڑھے گی۔ ان کے عقائد کچھ اور میرے کچھ اور۔۔۔۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ اس عشق میں، میں بھی شہید ہو جاؤں گا۔ پیار کی پیاس لیے میں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گا اور ندی کے کنارے رہتے ہوئے بھی میرے ہونٹ پیاسے کے پیاسے ہی رہیں گے۔"

"میری سوچ کے گھوڑے ابھی یہیں تک پہنچے تھے"۔ اقبال مجید گویا تھے۔ کہ اتنے میں میرے کمرے کا پردہ دھیرے سے اٹھا اور مجھے لگا کہ جیسے مغرب سے سورج طلوع ہوا ہو۔ میرے کمرے میں چار سو روشنی پھیل گئی۔ اس کے حسن کی روشنی۔ اور پھر انھوں نے آداب کر کے پتہ نہیں کیا کہا۔ خدا کی قسم میرے کانوں میں ان کی آواز کی گھنٹیاں بج اُٹھی

تھیں۔ گھنٹیوں کے اس شور میں الفاظ تو سنائی ہی نہیں دیے۔ خدا کی قسم مجھ پر تو سکتہ طاری ہو گیا کبھی میں اپنی قسمت پر رشک کرتا تھا کہ وہ تشریف لائیں اور کبھی خود کو کوستا تھا کہ وہ چلی گئیں"۔

اقبال مجید کا بیان ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ سامنے سے مسز تیواری آتی ہوئی دکھائی دیں۔ سرتاپا مجسم حسن۔ ہلکے نیلے بلاؤز اور اسکرٹ کے ساتھ اسی رنگ کے گھٹنوں تک لمبے موزے اور پاؤں میں نیلے رنگ کی ہی گرگابی، ماتھے پہ چمکتی سفید لٹ کے ساتھ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی مینکا آکاش سے بادلوں کو چیر کر حضرت گنج میں چہل قدمی کر رہی ہو۔

یاروں نے اس روز چار چکر کاٹے تاکہ اس ملکۂ حسن کی تصویر کو دل میں اتار سکیں۔ اسے دیکھ کر اقبال مجید کچھ دیر کے لیے اپنے عشق کی داستان بھول گئے۔ باقر مہدی نے انکشاف کیا کہ مسز تیواری کو دیکھ کر ان ے ذہن میں نئی غزل کے مصرعے گڑبڑا گئے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مضمون باندھ رہا تھا۔

حضرت گنج سے قیصر باغ کی طرف آتے ہوئے کسی نے اقبال مجید کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہاں تو اقبال۔ داستانِ عشق کا اگلا باب بیان ہو۔"

"ارے بھائی وہ تو سپنا بیان کر رہے تھے اور آپ نے اسے حقیقت سمجھ لیا۔"

زور کا قہقہہ بلند ہوا اور ساری داستان کے پرخچے اڑ گئے۔

اس زمانے میں نیشنل ہیرالڈ ہو یا قومی آواز، نوجیون، پائنیر ہو یا سوتنتر بھارت۔ سب کے چیف ایڈیٹر شام کو آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کے درمیان پریشان رہتے تھے۔ ان کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ دن کی شفٹ میں کام کرنے والے مسز تیواری کے دیدار کرنے کے لئے آٹھ بجنے سے دس پندرہ منٹ پہلے ہی اٹھ جاتے تھے اور رات کی شفٹ پر آٹھ بجے آنے والے لوگ تو اس وقت تک حضرت گنج سے ہلنے کا نام نہ لیتے جب تک اپنی آنکھوں کی پیاس نہ بجھا لیتے۔

جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں۔ اس وقت ہیرالڈ کے ایڈیٹر چھیلاپتی راؤ تھے، جو کام کے معاملے میں بڑے ہی سخت مزاج واقع ہوئے تھے۔ تب ہیرالڈ کے رپورٹر نجم الحسن تھے جو اپنی قابلیت کے بل بوتے پر کسی سے ڈرتے نہیں تھے۔ ایک روز جب نجم الحسن دن کی ڈیوٹی ختم کر کے گنج جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ راؤ صاحب خود اسٹاف روم میں چلے آرہے ہیں۔ آتے ہی انھوں نے ایک لمبی رپورٹ نجمل کو تھمادی اور کہا کہ جانے سے پہلے اس رپورٹ پر دو تین پیراگراف لکھ کر انھیں دکھادیں اور اسے دوسرے ایڈیٹوریل کے طور پر چھپنے کے لئے دے کر جائیں۔

اب نجم الحسن کی تو حالت خراب۔ رپورٹ پڑھتے ہیں تو اسکا کوئی لفظ پلے نہیں پڑ رہا۔ کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں تو جیسے سیٹ پر کانٹے اگ آئے ہوں۔ سمجھ میں کچھ آئے بھی تو کیسے ؟ دل تو حضرت گنج کی گشت کرنے کیلئے بے چین ہے۔ عثمان غنی اور احمد جمال پاشا دوبار واپس لوٹ چکے تھے۔ انہوں نے انہیں باہر سے ہی لوٹا دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد چھیلاپتی راؤ کو کہیں باہر جانا پڑا تو انھوں نے جاتے جاتے سوچا کہ نجمل کا ایڈیٹوریل دیکھتے جائیں۔ وہ اسٹاف روم میں آئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ نجمل بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہے ہیں اور انہوں نے اب تک ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ نجمل کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے وہ انہیں اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہاں الماری سے اپنا کیمرا نکال کر دیا اور کہا کہ ”ابھی جاؤ اور مسز تیواری کی فوٹو کھینچ کر لاؤ۔ اسے کل پہلے صفحہ پر حاشیے کے ساتھ چھاپ دینا اور سنو۔ اس فوٹو کا ٹائٹل کیا دو گے۔ ؟“

ابھی نجمل کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ چھیلاپتی راؤ بولے :

ٹائٹل ہوگا۔ سلور لیڈی آف لکھنؤ“

اگلے روز ہیرالڈ میں مسز تیواری کی فوٹو دیکھ کر یار لوگ نجمل کو بار بار پوچھ رہے تھے۔

”یہ بتاؤ کہ یہ فوٹو چھاپی کس کی اجازت سے ؟“

”ارے بھائی گولڈن ہارٹ کی اجازت سے، اور کس کی؟“بس اس دن سے چھیلا پتی راؤ کا نام ”گولڈن ہارٹ“ ہو گیا۔

اس واقعے کے کچھ دن بعد قیصر تمکین ہیرالڈ چھوڑ کر انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں لندن میں ایک انگریز پریوار کا پے اینگ گیسٹ بننے کے لیے ایک کمرا صرف اس لیے پسند کر لیا کہ مالک مکان کی جو بیٹی انھیں کمرا دکھا رہی تھی، وہ بے حد خوبصورت تھی۔ بات چیت کرنے کے بعد وہ ایڈوانس چیک دینے ہی والے تھے کہ اسی وقت لڑکی کی ماں کمرے میں آگئی۔ ماں کے بالوں میں بھی مسز تیواری سے ملتی جلتی چاندی کی لٹ تھی۔ ماں کے چہرے کی طرف دیکھ کر قیصر تمکین نے پرس کی طرف بڑھا ہوا اپنا ہاتھ روک لیا اور کچھ سوچ کر کمرا لینے سے معذرت کر دی۔ جب قیصر اس گھر سے واپس جا رہے تھے تو انگریز عورت نے پوچھ ہی لیا۔

”یوں تو یہ آپ کا ذاتی فیصلہ ہے، لیکن پھر بھی اگر کوئی راز کی بات نہ ہو تو کیا آپ بتا سکیں گے کہ یہ کمرا پسند کرنے کے باوجود آپ نے کیوں نہیں لیا۔؟“

”سچی بات یہ ہے کہ میڈم کہ آپ کو ہر وقت اپنے سامنے پا کر مجھے کسی کی یاد بہت ستائے گی اور اگر میں ہر وقت کسی کی یاد میں تڑپتا رہا تو لندن میں کوئی کام نہیں کر پاؤں گا۔“

”وہ آپ کی محبوبہ ہے یا ماں۔؟“ انگریز عورت نے تڑاک سے پوچھ لیا۔

”وہ عورت لکھنؤ کی تہذیب کا نمونہ ہے۔ میں اسے محبوبہ کی طرح پیار بھی کرتا ہوں اور ماں کا سا احترام بھی دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر قیصر تمکین کسی اور کمرے کی تلاش میں نکل پڑے۔ اور وہ انگریز عورت بڑی حیرانی سے کمرے سے باہر جاتے قیصر تمکین کو دیکھ رہی تھی۔ قیصر تمکین جس کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور انداز گفتگو سے لکھنؤ کی تہذیب چھلک چھلک پڑتی ہے۔ اس قیصر تمکین کے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی وہ انگریز عورت کمرے میں رکھے قد آدم شیشے میں خود کو نہارتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کی شخصیت میں لکھنؤ کی کون سی خوبی چھپی ہوئی ہے۔

ایک دن ایک شاعر، جس کا نام اس وقت یاد نہیں آ رہا، اپنی تازہ غزل سنانے کیلئے

بے حد اتاؤلا ہو رہا تھا۔ اس نے کافی ہاؤس میں سب کی گرما گرم کافی اور پکوڑوں سے تواضع کرنے کا بھی وعدہ کر رکھا تھا۔ لیکن یار لوگ تھے کہ دو چکر لگانے کے باوجود حضرت گنج سے ملنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ہلتے بھی تو کیسے؟ مسز تیواری تو ابھی آئی نہیں تھی۔

"مسز تیواری میں ایسا کیا ہے جو آپ لوگ اتنی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔؟"

بس اس کے منہ سے اتنا سننا تھا کہ شارب رودلوی جو ہماری ٹولی میں سب سے سنجیدہ رہتے تھے اس وقت تاؤ کھا گئے۔

"تمہاری غزل سنے بغیر میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ معیاری نہیں ہو گی۔"

"وہ کیسے؟" شاعر صاحب بھونچکارہ گئے تھے۔

"وہ اس لئے کہ جس کے دل میں مسز تیواری کی نفاست دیکھنے کا شوق نہیں، اس کے اندر شاعری کا ذوق کیسے ہو سکتا ہے... ہم نہیں پئیں گے تمہاری کافی۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

اس سلسلے کا ایک واقعہ اور سن لیجئے۔ دہلی سے انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ منسٹری کے سکریٹری قدوائی صاحب سرکاری کام سے لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ ایک شام ہم دونوں حضرت گنج میں گھوم رہے تھے ہم دو چکر لگا چکے تھے۔ فاصلہ وہی جولاہے کے تانے بانے کی طرح نپا تلا۔ کافی ہاؤس کے موڑ سے مے فیئر سنیما تک۔ قدوائی صاحب مزاجاً بہت کم گو تھے۔

کوئی بات کرتے تو ایسا لگتا کہ اس جملے کو بڑی مشکل سے دماغ کے کسی گوشے سے نکال کر ہونٹوں تک لائے ہیں۔ لیکن اس شام حضرت گنج میں ان کی یادوں کے پٹارے سے جیسے ڈھکن خود بخود اتر گیا تھا۔ یوں باتیں کر رہے تھے جیسے میں ان کے محکمے کا جونیر افسر نہیں بلکہ ان کا ہم جولی ہوں۔ کہنے لگے۔

"کل کافی ہاؤس گیا تھا۔ کچھ بدلا بدلا سا ماحول تھا۔ مزا نہیں آیا۔" یہ کہہ کر وہ کچھ

دیر خاموش رہے جیسے کسی بات کو یاد کر رہے ہوں۔ پھر پوچھنے لگے۔

"تم نے ڈاکٹر علیم کو دیکھا ہوگا کافی ہاؤس میں۔ وہ جس کونے میں بیٹھتے تھے، لگتا تھا کافی ہاؤس کی اس میز پر علم وادب کا سورج روشن ہو گیا ہو۔"

پھر کہنے لگے کہ ایک بار ایک نوجوان شاعر حسن شہیر نے اپنی آزاد نظم میں کسی سفید پھول کو لال رنگ کا بتایا تو ڈاکٹر علیم صاحب نے اس کی غلطی کی طرف بھی حوصلہ بڑھانے کے انداز میں اشارہ کیا۔ فرمانے لگے۔

"حسن شہیر! تم ذہین شاعر ہو۔ آج تو نے اس پھول کی سفیدی میں لال رنگ کو پہچان لیا ہے۔ جس دن باقی کے چھ رنگ بھی پہچان لوگے، اس دن تمھاری شاعری میں چار چاند لگ جائیں گے۔"

یہ اور بات ہے کہ حسن شہیر اپنی عمر کے آخری حصے میں ایک رنگ میں ایسے کھوئے کہ باقی رنگوں کی پہچان ہی کھو بیٹھے۔ شاعری تو اک طرف دھری دھرائی رہ گئی۔

"کیا لوگ تھے وہ۔" قدوائی صاحب ایک ٹھنڈی آہ بھر کر ایک جگہ بت سے بنے کھڑے رہ گئے۔

میں نے گئے وقتوں کے ماحول کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا فرمانا بجا ہے۔ اسی کافی ہاؤس میں کرشن نرائن ککڑ کو جب میری کمزور مالی حالت کا احساس ہوا تو وہ خود ہی کسی سے میری کہانی ہندی میں انواد کروا کر "یگ چیتنا" میں شائع کر کے مجھے دس روپے معاوضے کے طور پر دیا کرتے تھے۔ انہی کے بل بوتے پر میں نے بی، اے پاس کیا۔ ورنہ میں تو" قدوائی صاحب بڑے دھیان سے سن رہے تھے۔

میں کہہ رہا تھا۔ "اسی کافی ہاؤس میں اور ادبی جلسوں میں سرور صاحب نے ڈاکٹر قمر رئیس، عثمان غنی، اقبال مجید، احمد جمال پاشا اور رضوان کی صلاحیتوں کو پہچانا اور جب وہ خود لکھنؤ سے علی گڑھ یونیورسٹی میں گئے تو اپنے ان شاگردوں کو بھی ساتھ لے گئے۔ آج یہ سب کے سب ادب یا صحافت میں اپنی انمٹ چھاپ چھوڑ چکے ہیں۔"

"آج تو کافی ہاؤس کی وہ تمام کرسیاں خالی نظر آتی ہیں جہاں یہ عظیم ہستیاں علم وادب کی روشنی بکھیرا کرتی تھیں۔" قدوائی صاحب پتہ نہیں کس ماحول میں ڈوبے کہہ رہے تھے۔ "کافی ہاؤس ہی نہیں لکھنؤ کی ثقافت کے تمام اداروں کی مسندیں خالی نظر آتی ہیں۔ پتہ نہیں اس ماحول کو کس ناگن نے ڈس لیا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے قدوائی صاحب یوں رک گئے جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔ پھر چل پڑے شاید ان کے قدم بڑھاتے ہی وقت پھر حرکت میں آجائے۔ پھر رک گئے پھر انھوں نے حضرت گنج کے دونوں طرف دور تک نظر دوڑائی۔ میں دیکھ رہا تھا ان کی آنکھوں کو وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا، جو وہ دیکھنا چاہتے تھے۔ پھر ان کی آواز جیسے دور سے آ رہی ہو۔

"یہاں ہمارے زمانے میں ایک مسز تیواری آیا کرتی تھیں۔ سفید بالوں کی لٹ والی۔"

"سلور لیڈی۔"؟

"ہاں ہاں۔ سلور لیڈی۔ اس کا مطلب ہے تمھارے زمانے میں بھی......"

"ہاں صاحب ہمارے زمانے کے لوگوں نے بھی اس کے حسن سے روشنی لی ہے۔"

"کیا ہوا انھیں۔ اب نہیں آتیں۔؟" قدوائی صاحب فکر مند ہو کر پوچھ رہے تھے۔ "کہیں وقت کے اندھیروں میں تو نہیں کھو گئیں۔ لیکن ایسی عورتیں......" مناسب لفظوں کی تلاش میں قدوائی صاحب کا ذہن بھٹک گیا تھا یا الفاظ ان کے گلے تک آکر اٹک گئے تھے۔

"نہیں۔ ایسی عورتوں کے حسن کا وقت کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ تو شوکت تھانوی کے مزاح میں، علی عباس حسینی کی کہانی میں، مجاز کی غزل میں، بیگم اختر کی موسیقی میں، بشٹ کی تصویروں میں کبھی الفاظ بن کر ڈھل جاتی ہے، کبھی رنگ بن کر بکھر جاتی ہے اور کبھی نغمے کے جامے میں ڈھل جاتی ہے، تاکہ آنے والی فسلیں اسے جس شکل میں چاہیں ڈھونڈھ لیں۔"

مسز تیواری کو ان الفاظ سے یاد کرنے والے قدوائی صاحب بھی مسز تیواری کی

طرح وقت کے اندھیروں میں کب کے کھو چکے۔

ابھی چند روز پہلے کی بات ہے، کسی کام سے لکھنؤ گیا تو قدم خود بخود کافی ہاؤس کی طرف کھنچ گئے۔ کافی ہاؤس کی سبھی میزیں خالی تھیں۔ یعنی مکمل سناٹا۔ مجھے ایک کونے میں بیٹھا دیکھ کر ایک ویٹر آیا۔

''پنکھا چلا دو''۔ میں نے کہا

''یہاں کی بجلی کٹ چکی ہے صاحب''

میں نے اپنے سامنے رکھی میز پر دیکھا۔ پرانا وقت دھول بن کر میز سے چپکا ہوا تھا۔ میں نے اس میز پر کئی نام لکھے۔ عابد سہیل، آغا سہیل، سبط اختر، حسن عابد۔ حسن عابد کا نام لکھتے ہی میں نے اوپر چھت کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک کونے میں اس کے قہقہے کی آواز جالے میں جکڑی ہوئی فضا میں گونجنے کے لئے بے چین تھی۔ پھر اس میز سے اٹھ کر دوسری میز پر گیا۔ اس پر میں نے اور نام لکھے۔ کنور نارائن، سدا شرن مصرا، جمیلہ، مدرا راکشش، وہاں سے ہٹ کر اس میز پر گیا جہاں کاؤنٹر کے پاس لیش پال جی بیٹھا کرتے تھے، لیش پال صاحب سے اجازت لے کر بڑے ادب سے سکڑ کر ان کے پاس بیٹھ گیا اور لیش پال جی کو یہ ساری کہانی سنا ڈالی۔

''نام کیا رکھا؟'' کہانی سن کر لیش پال جی نے پوچھا۔

''حضور آپ کے ناول جھوٹا سچ کی طرح یہ کہانی تو سچی ہے مگر واقعات جھوٹے ہیں۔''

''تو اس کا نام جھوٹی بھی اور سچی بھی رکھ دو۔''

میں نے یہ نام اس میز پر جمی وقت کی دھول پر لکھا اور کافی ہاؤس سے باہر آ گیا۔

اس شام حضرت گنج میں ٹہلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ سڑک پر، فٹ پاتھ پر، لولین میں ہر جگہ زیادہ روشنیاں تھیں۔ زیادہ چکا چوند تھی۔ اس روشنی میں مسز تیواری دکھائی کیوں نہیں دیتیں۔ میں نے سوچا اور حضرت گنج کے اوپر پھیلے ہوئے آسمان کی طرف نظر

اٹھ گئی۔ آسمان کی چھت میں اندھیرا دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ تبھی اس اندھیرے میں ایک سفید پرندہ اڑتا ہوا دکھائی دیا اور مجھے عابد سہیل کی ایک بات یاد آگئی۔

ایک بار کافی ہاؤس میں حسن عابد کے زوردار قہقہے کی آواز سن کر جب روشن دان پر بیٹھا ہوا کبوتر ڈر کر پنکھ پھڑپھڑاتا ہوا اڑ گیا تو عابد سہیل جو اُن دنوں فلاسفی میں ایم اے کر رہے تھے، کچھ سنجیدہ ہو گئے اور کہا۔

"حسن عابد! جس قہقہے سے ڈر کر کبوتر اڑ جائے، اسے قہقہہ نہیں کہا جا سکتا۔"

اور میں سوچنے لگا کہ حضرت گنج میں آج کے دور کی یہ کیسی روشنی ہے کہ جس روشنی کو چھوڑ کر مسز تیواری سی خوبصورت عورت اندھیری فضاؤں میں اڑنا زیادہ پسند کرتی ہے۔ عابد سہیل ان الفاظ کو دوسری طرح کہتے۔ تو کیا اس روشنی کو روشنی کہا جا سکتا ہے؟

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اندھیری فضاؤں میں اڑتے ہوئے کبوتر کے سفید پنکھ اب بھی چمک رہے تھے۔

چھوٹی سی خوشی

میرے شوہر کو وہ سیل گرل اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ اس کے پاس سے ٹلنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

اور ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔

ٹورنٹو کے ہوائی اڈے پر ہمارا اسامان جہاز پر لادنے کے لیے جا چکا تھا۔ اور ہم باہر والے لمبے چوڑے کھلے ہال سے اندر سیکورٹی کی طرف جانے کی بات سوچ ہی رہے تھے کہ تبھی مائیکروفون پر یہ اعلان ہو گیا کہ جس جہاز پر ہم سوار ہونے والے تھے وہ کچھ غیر معمولی حالات کی وجہ سے چار گھنٹے دیر سے جائے گا۔

ہم یہ چار گھنٹے گذارنے کے لیے ایک قریبی سپر بازار میں آ گئے تھے۔ کچھ دیر ہم ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ ایک کیفے میں کچھ دیر بیٹھ کر کافی پی۔ وہاں بیٹھے رہے، وہاں سے اٹھ کر سُپر بازار سے باہر آ رہے تھے کہ اچانک ایک کھلونوں کی دوکان سامنے پڑ گئی۔ باہر شوروم میں رکھے ہوئے کھلونے ہم میاں بیوی کو ننھے منے بچوں کی طرح انگلیاں تھام کر اندر لے گئے۔

اور میرے شوہر تو جیسے اس سیل گرل سے چپک کر رہ گئے۔ "یہ دکھاؤ، وہ دکھاؤ"۔ وہ وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

ویسے ایمان کی بات یہ ہے کہ وہ لڑکی واقعی بہت خوبصورت تھی۔ اس کے ترشے ہوئے ہونٹوں کے اوپر تھوڑی سی اٹھی ہوئی ناک اس کی شخصیت کو جاذب نظر بنا رہی تھی۔ اور اس کی مسکراتی ہوئی دو آنکھیں جیسے نظروں کی زبان میں بول بول کر دوسرے کو اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ پھر اس کا بات کرنے کا لب ولہجہ۔ ایک ماہر سیل گرل کا سا انداز گاہکوں کے دلوں میں اتر کر کہتا "کھلونوں کو چھوڑو۔ اس زندہ کھلونے کو ہی پیک کروا کر ساتھ لے چلو۔

اور یہ چونکہ ممکن نہیں تھا۔ اس لیے لوگ اس کے ہاتھ سے کھلونے خریدنے کے لیے مجبور ہو جاتے۔

میرے شوہر بھی اپنی پسند کے کھلونے چن کر الگ کرتے جا رہے تھے۔

ہمارے پاس چونکہ وقت بہت کم تھا اس لیے کھلونے چننے میں، میں بھی اپنے شوہر کی ہاں میں ہاں ملاتی جا رہی تھی۔ جس کھلونے کے بارے میں میرے شوہر پوچھتے کہ کیسا ہے، تو میں جھٹ سے کہہ دیتی کہ اچھا ہے۔ ایسا میں اس لیے کر رہی تھی کہ فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگے۔

اس طرح ہم دونوں نے مل کر دس بارہ کھلونے چن لیے۔ ابھی میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ ہم ان کھلونوں کا کیا کریں گے۔ ہمارے بچے تو جوان ہو چکے۔ جوان بچوں کی ابھی شادیاں نہیں ہوئیں۔ اس لیے ان کے گھر کے آنگن میں بچوں کے کھیلنے کے دن ابھی دور تھے اور پھر یہ کہ ہمارا سامان تو پہلے ہی زیادہ تھا۔ یہ فالتو کھلونوں کا پیکٹ ہم جہاز پر کیسے لے جائیں گے۔

"میڈم ان کھلونوں کو کیسے پیک کرنا ہے۔ ایک پیکٹ میں دو میں۔ سیل گرل مجھ سے پوچھ رہی تھی"۔

"نہیں۔ انہیں ہمارے لیے پیک کرنے کی ضرورت نہیں"۔ میرے شوہر سیل

گرل سے مخاطب تھے۔ ان سب کھلونوں کو الگ الگ پیک کروا کر تحفے کے طور پر یہاں کے کسی نرسری اسکول میں بھجوا دیجیے گا۔ ایک ہندوستانی جوڑے کی طرف سے ٹورنٹو کے پیارے پیارے بچوں کے لیے تحفہ۔ اے پارٹنگ گفٹ"۔

یہ کہہ کر جب ہم کاؤنٹر سے چلنے لگے تو وہ سیل گرل حیرانی اور خوشی کے جذبوں سے لبریز کاؤنٹر سے باہر نکل کر دلفریب قدموں سے چلتی ہوئی ہمارے پاس آئی۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا؟ کس جذبے کے تحت۔" سیل گرل میرے شوہر سے پوچھ رہی تھی۔

میڈم۔ سچی بات یہ ہے کہ آپ کی موہنی صورت مجھے بے حد پسند تھی اور آپ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گذارنے کا میرے پاس یہی ایک طریقہ تھا کہ آپ سے کھلونے خریدے جائیں۔ کھلونے جن کی مجھے قطعی ضرورت نہیں تھی"۔

سیل گرل نے اپنی خوبصورتی کی اتنے صاف لفظوں میں تعریف سن کر میری طرف دیکھا۔ "اور آپ یہ اپنی بیوی کی موجودگی میں کہہ رہے ہیں"۔ سیل گرل نے کہا۔

"میں اپنے شوہر کے احساسات کو سمجھ رہی تھی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے اگر میرے شوہر کو خوشی حاصل ہو سکتی ہے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟"۔

"بہت خوب بہت خوب"۔ سیل گرل نے یہ کہتے ہوئے ایک ہاتھ سے میرے ہاتھ کو تھام لیا اور دوسرا ہاتھ میرے شوہر کے ہاتھ میں دے دیا۔

"آپ میرے دیش کے بچوں کو محبت کا تحفہ دے کر وطن جا رہے ہیں۔ میرا بھی فرض بنتا ہے کہ ایسا ہی ایک تحفہ آپ کو بھی پیش کروں"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے میرے شوہر کے گلے میں دونوں بازو ڈال دے اور انھیں چوم لیا۔

"میرے دیش میں دلی جذبات اور محبت کے اظہار کا سب سے اچھا طریقہ ہے

بوسہ"۔ یہ کہتے ہوئے بوسہ دینے کے لئے اس نے اپنا منہ آگے بڑھایا۔

میرے شوہر اس کا بوسہ لے چکے تو وہ بولی۔ "یہ ہے میری محبت کا تحفہ۔ اور سچی بات یہ ہے"۔ وہ سیل گرل میرے شوہر کو بوسہ دینے کے بعد مجھ سے مخاطب تھی "سچی بات تو یہ ہے کہ آپ کے شوہر مجھے بھی پہلی ہی نظر میں بھا گئے تھے۔ میرے دل کو اچھے لگے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے اپنے دل کی بات کہہ کر مجھے بھی اپنی بات کہنے کا موقع دیا۔

جب ہم بل دینے کے لئے کاؤنٹر کی طرف بڑھنے لگے تو اس نے کہا "اپنے انجانے محبوب کے لئے یہ بل میں نے کمپنی کو اپنی طرف سے ادا کر دیا ہے۔"

اس بات کو کئی سال بیت چکے۔ ہم میاں بیوی جب بھی اس بات کو یاد کرتے ہیں تو ایک پل کی وہ چھوٹی سی خوشی زمان و مکان کی حدوں کو پاٹ کر افق پر پھیل پھیل جاتی ہے اور ہم دونوں کے دل خوشی سے بھر جاتے ہیں۔

✓

سوگ

ہانگ کانگ جانے والی صبح کی فلائیٹ پکڑنے کے لئے ساری تیاریاں کر کے جب وہ سونے کے کمرے میں آئی تو رات کے دس بج چکے تھے۔ بچوں کو تو اسنے نو بجے ہی ڈنر کے بعد اپنے اپنے کمروں میں بھیج دیا تھا۔ سوٹ کیس وغیرہ تیار کروا کر اس کے شوہر آدھ گھنٹہ پہلے ہی یہ کہہ کر لیٹ گئے تھے کہ بھائی باقی اب تم جانو۔ میں تو تھک گیا۔ اور پھر صبح بھی تو جلدی اٹھنا ہے۔

آنکھیں بند کر کے لیٹی تو وہ ذہنی طور پر ہانگ کانگ کی اس دنیا میں گھوم رہی تھی جسے ابھی اسے اگلے دن دیکھنا تھا۔ نیند سے بوجھل ہوتی اس کی آنکھوں میں وہاں کی چمک دمک بسی ہوئی تھی کہ تبھی اسے ایسا لگا جیسے اس کے پاس والے پلنگ پر دوسری طرف کروٹ لئے اس کے شوہر نے ہچکی لی ہو۔

''شاید وہ بھی کوئی سپنا دیکھ رہا ہے''۔ اس نے سوچا۔

تبھی اس نے سنا کہ اس کے شوہر نے بڑی اونچی آواز میں ایک اور ہچکی لی ہے اور ہچکی کے ساتھ ہی اس کے گلے سے خرخراہٹ کی سی آواز آئی ہے۔

اس نے گھبرا کر پلنگ پر لگے سائیڈ لیمپ کا بٹن دبا کر روشنی میں شوہر کا کندھا ہلایا تو ڈر کے مارے اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کا شوہر تو مر چکا تھا اور اس کی بے جان ادھ کھلی آنکھیں اس کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔

''نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا تمہیں تو صبح اٹھ کر سب کے ساتھ پکنک پر جانا تھا۔''

یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تم نے کیا کیا ڈیر۔ یہ تم نے کیا کیا ڈیر''۔ ایسا کہتے ہوئے اس نے شوہر کی ٹانگوں کو سیدھا کیا۔ شوہر کی چھاتی پر سر رکھ کر اس کے دل کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب اس میں کوئی حرکت محسوس نہ ہوئی تو اس کی چھاتی پر زور زور سے دو تین مکے مارے۔ یہ مر کر رنگ میں بھنگ ڈالنے کی وجہ سے غصے میں مارے ہوئے مکے تھے یا اس کے دل کو دوبارہ حرکت میں لانے کی کوشش والے مکے۔ اس کا فیصلہ کرنا ذرا مشکل کام ہے۔ جب ایسا کرنے پر کچھ نہ ہوا تو اس نے چادر سے اس کی لاش کو ڈھک دیا اور اپنے کمرے کو بند کر کے باہر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

ابھی تک وہ ہانگ کانگ کے چکا چوندھ کر دینے والے ماحول کا سپنا دیکھ رہی تھی۔ ابھی وہ پوری طرح جاگی بھی نہیں تھی اور یہ ہو گیا۔ اسلئے جو کچھ ہو گیا تھا وہ اس پر یقین نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ اپنے مہمانوں سے ملنے والے گول کمرے میں دھیرے دھیرے اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر چل رہی تھی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی۔ ''یہ کیا ہو گیا۔ یہ تم نے کیا کیا۔ یہ تم نے کیا کیا۔'' وہ جیسے اپنے شوہر سے پوچھ رہی تھی اور من ہی من سوچ رہی تھی کہ اب کیا کروں۔ موت ہوئی سو ہوئی۔ اوپر سے چار لاکھ روپے کی چپت ہو گئی۔ جس ٹورسٹ کمپنی نے پورے پورے پیسے لے کر ان کا یہ بہتر گھنٹے کے ٹرپ کا انتظام کیا تھا وہ تو ایک کوڑی واپس نہیں کرے گی۔ نہ ہوائی جہاز کا کرایا اور نہ ہوٹل کا خرچہ۔ افو۔ یہ تم نے کیا کیا۔ یہ تم نے کیا کیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اپنے سوال کا جواب بار بار اپنے شوہر سے پوچھ رہی تھی جو مر کر زندگی کے تمام سوالوں سے آزاد ہو گیا تھا۔

پھر جیسے امید کی کوئی کرن جاگی۔ اس نے فون اٹھایا اور نزدیک کے ڈاکٹر کو

ایمر جنسی رنگ کیا۔ ڈاکٹر فوراً ہی چلا آیا۔ بیڈ روم میں مرے پڑے اس کے شوہر کی چھاتی پر آلہ لگا کر دیکھا اور پھر اپنی چھاتی پر کراس بناتے ہوئے لاش کو اسی طرح ڈھک دیا اور ''ساری'' کہتا ہوا جتنی جلدی آیا تھا اتنی ہی جلدی گھر سے باہر چلا گیا۔

اب تک وہ عورت گھر میں رکھی مردہ حقیقت کا سامنا کرنے کے لئے پوری طرح جاگ گئی تھی۔ جاگ تو گئی تھی لیکن ابھی اس کا ذہن پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا کہ اس مصیبت کا سامنا کیسے کیا جائے۔ اسکا حل سوچتے سوچتے اس کے قدم خود بخود کچن کے ساتھ والی لابی کی طرف بڑھ گئے۔ اس نے فرج کھولا۔ کیک کے دو بڑے ٹکڑے پلیٹ میں رکھے اور کھائے۔ اس بیچ اس نے دو نمکین پیسٹیز نکال کر اوون میں گرم ہونے کے لئے رکھ دیں۔ انہیں کھایا۔ پھر ایک سافٹ ڈرنک بنایا اور غٹ غٹ پی گئی۔

دراصل جب بھی اس پر کوئی مشکل آتی ہے تو اسے لگتا ہے جیسے اسے بھوک لگ آئی ہو۔ جتنی بڑی مشکل ہوتی ہے اسے بھوک بھی اسی شدت کی لگتی ہے۔ اس لئے جب اس کا پیٹ بھر گیا تو اس کے دماغ نے بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ کھاپی کر وہ پھر ٹیلیفون والے کمرے میں گئی اور اپنی سہیلی کا نمبر ملایا۔

''ارے بھائی سو جاؤ۔ صبح تمہیں جلدی اٹھنا ہے۔'' سہیلی اس کی آواز پہچان کر اسے کہہ رہی تھی۔ جب اس نے اسے صورتحال سے آگاہ کیا تو وہ بولی۔ بہت برا ہوا۔ اور بہت غلط وقت پر ہوا۔ تمہارا شوہر تھا ہی ایسا۔ ہر کام غلط وقت پر کرتا تھا۔ مرنے کیلئے بھی اس نے غلط وقت چنا ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

وہی تو میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔ عجیب مشکل میں پھنس گئی ہوں۔

''میں تو کہوں گی۔ یہ موقع ہاتھ سے جانا نہیں چاہیے۔ ایک تو تمہارا چار لاکھ بے کار میں ڈوب جائے گا اور دوسرے یہ کہ ایسے موقعے بار بار ہاتھ نہیں آتے۔ اب تو سب جا رہے ہیں۔ سب کا ساتھ ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ موت کے وقت آہ و زاری تو سبھی کرتے ہیں۔ کوئی ایسا بھی تو ہونا چاہیے جو موت کے لمحوں سے خوشیاں چھین لے۔ پلنگ پر

جائے اور موج اڑائے۔ اے گریٹ آئیڈیا۔ تمہیں یہ رائے دیتے ہوئے مجھے واقعی اپنے ذہن کی اڑان پر خوشی حاصل ہو رہی ہے۔ تم میرے اس سجھاؤ پر غور کرو میں بھی غور کرتی ہوں فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آئیم ودیو۔ تم اپنے آپ کو اکیلی مت سمجھو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

تھوڑی دیر میں سہیلی آگئی۔ اس کا شوہر بھی ساتھ آیا۔ گرم گرم کافی کا دور چلا اور صورت حال پر پوری طرح غور کیا گیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ آجکل مرنے پر رونا دھونا، سوگ منانا پچھڑے پن کی نشانی ہے۔ یوں بھی موت ایک عام سی بات ہے۔ اسکے لئے زندگی کے معمول میں کوئی رکاوٹ نہیں آنا چاہئے۔ مرنے والے کے ساتھ مرا تو نہیں جا سکتا۔

آخر فیصلہ یہ ہوا کہ ہانگ کانگ کا پروگرام منسوخ نہیں ہونا چاہئے۔ مرنے والے کے کفن دفن کے لئے ایک ادارے کے ساتھ بات طے ہو گئی۔ پچاس ہزار روپے کے معاوضے کے عوض اس نے ساری ذمے داری اپنے سر لے لی۔ میت کا غسل، کفن کا انتظام وہ کریں گے، صبح دس بجے جنازہ اٹھے گا۔ جنازے کے پیچھے پیچھے کرائے کے سوگوار ہوں گے۔ مرنے والے کی روح کی شانتی کے لئے پادری اس ادارے کا اپنا ہے۔ یہاں تک کہ جنازے کی رسم ادا ہونے کے بعد قبر پر وہ ادارہ کتبہ بھی لگا دے گا کہ یہاں فلاں ولد فلاں آرام کی نیند سو رہا ہے۔ آمین۔

مرنے والے کی بیوی نے تمام انتظامات کی تفصیل میں پوری دلچسپی دکھائی۔ میت کا غسل نیم گرم پانی سے ہونا چاہئے۔ پانی میں خس خس کا عطر ضرور ڈالا جائے۔ عطر اصلی ہونا چاہئے۔ کفن معمولی کپڑے کا نہ ہو۔ کفن کے اوپر تازہ گلابوں کے پھول کی پتیاں ڈالی جائیں۔ یہ خیال رکھا جائے کہ اس میں کوئی کانٹا نہ ہو۔ کیونکہ کانٹا ہوا تو مرنے والے کو قبر میں بھی چین کی نیند نہیں آئے گی۔

ان سارے انتظامات کے ساتھ ساتھ اس ادارے نے ای میل سے اس کے تمام رشتے داروں، دوست احباب کو اطلاع دینے اور اخباروں میں خبر شائع کروانے کی پوری

ذمے داری بھی اپنے سر لے لی۔

یہ سارے انتظام اس کی سہیلی اور اس کے شوہر نے ایک آدھ گھنٹے میں پکے کر دئے۔ یہاں تک کہ معاوضے کی رقم کا چیک بھی اس ادارے کو کمپیوٹر سے ادا کر دیا گیا۔ سہیلی کے شوہر نے یہ امید بھی ظاہر کی کہ ممکن ہے کہ ان حالات میں ٹورسٹ کمپنی مرنے والے کے نہ جانے کی وجہ سے کچھ رقم واپس بھی کر دے۔ اس سے کفن دفن پر جو خرچ ہو رہا ہے ممکن ہے اتنا پیسہ تو مل ہی جائے۔

اس کے بعد مرنے والے کی بیوی نے تین چار گھنٹے سو بھی لیا تاکہ اگلی صبح جب وہ گھر سے روانہ ہوں تو تازہ دم ہو۔

صبح آٹھ بجے کی فلائیٹ پکڑنے کے لئے گھر سے چھ بجے نکلے تو کفن دفن کا انتظام کرنے والے ادارے کا ملازم آکر باہر کے قفل کی چابی بھی لے گیا۔ وہ کمرے میں رکھی مٹی کو بھی دیکھ گیا اور مرنے والے کا ناپ بھی لے گیا تاکہ قبر میں اتارنے سے پہلے اسے مناسب کپڑے پہنائے جاسکیں۔

کفن دفن کے سارے انتظامات تو ٹھیک تھے ہی۔ ہانگ کانگ کی پکنک بھی پر لطف رہی۔ بڑا مزا آیا۔ دونوں بچے ضرور ڈیڈ کو یاد کرتے رہے۔ انہیں جاتے ہوئے تو یہ کہہ دیا گیا تھا کہ انہیں کچھ کام پڑ گیا ہے اور وہ دوسری کسی فلائیٹ سے بعد میں آجائیں گے۔ لیکن ایرپورٹ پر اتر کر جب ٹیکسی ہوائی اڈے سے گھر کی طرف دوڑ رہی تھی تو بیوی کا ذہن بڑی تیزی سے یہ سوچ رہا تھا کہ بچوں کو اس تلخ حقیقت سے کیسے واقف کرایا جائے کہ ان کے ڈیڈ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ویسے بھی شام کو مرنے والے کی روح کی شانتی کے لئے چرچ میں سروس کا انتظام اسی ادارے نے کر رکھا تھا۔

اس آخری رسم میں پہننے کے لئے اس نے اپنے اور بچوں کے لئے مناسب ڈریس ہانگ کانگ میں ہی خرید لئے تھے۔ بچوں کی جیبوں پر کالی پٹی لگی تھی جس پر لکھا تھا۔ ''ڈیڈ ہم تمہارے بغیر اداس ہیں۔'' اس کا اپنا ڈریس دودھیا سفید ریشم کا تھا، جس میں دل کے عین اوپر

دل کی شکل کا ہی ایک الگ ٹکڑا بٹنوں سے جوڑا گیا تھا، جس پر لکھا تھا "شوہر کی یاد میرے دل میں ہمیشہ بنی رہے گی"۔

گھر پہنچ کر سب سے پہلے اس کی نظر کمپیوٹر پر گئی۔ اور یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ ای میل پر سبھی دوست احباب اور رشتے داروں نے اس کے شوہر کے انتقال پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہمدردی دکھائی تھی اور مرنے والے کی روح کی شانتی کے لئے دعا کی تھی۔

اخبار میں چھپی فوٹو کو اس نے بچوں کو بھی دکھایا۔ بچے ڈیڈ کی فوٹو اخبار میں چھپی دیکھ کر خوش ہوئے تو اس نے فوٹو کے گرد کالی پٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بچوں کو بتایا کہ جن تصویروں کے گرد کالی پٹی لگی ہوتی ہے، اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ گاڈ کو پیارے ہو گئے"۔ "ڈیڈ گاڈ کو پیارے ہو گئے۔ ڈیڈ گاڈ کو پیارے ہو گئے" یہ کہتے ہوئے بچے تالیاں مارتے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تاکہ کپڑے بدل سکیں۔

"چلو بچوں کو بتانے کا کام بھی خوش اسلوبی سے سلجھ گیا۔" مرنے والے کی بیوی نے سوچا۔ لگتا ہے اس ادارے نے سب کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

ابھی وہ شکریہ ادا کرنے کے لئے اور شام کی سروس کی تفصیل جاننے کے لئے اس ادارے کے دفتر فون کرنے کی سوچ ہی رہی تھی کہ اس ادارے سے ہی فون آ گیا۔

میڈم شام کی سروس کا سب انتظام پورا ہو گیا ہے۔ بس آپ کو شام چھ بجے پہنچ جانا ہے۔ قبرستان میں بھی قبر کے اوپر اچھا سا کتبہ لگا دیا گیا ہے۔ آپ دیکھیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ بس ذرا سی کسر رہ گئی۔

"وہ کیا؟ خیر ایسے کاموں میں کوئی نہ کوئی کمی تو رہ ہی جاتی ہے۔" بیوی نے کہا۔

"بس میڈم ہوا یہ کہ جس کمرے میں لاش رکھی تھی، اسے آپ جاتے ہوئے لاک کر گئیں۔ آٹومیٹک لاک تھا۔ اسلئے اسے کھولنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس لئے ہم جنازہ بغیر لاش کے ہی لے گئے۔

"او۔ مائی گڈ نیس"

ویسے میڈم ہم نے کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا۔ جنازے کو کندھا دینے والوں نے سارا کام بڑی ہوشیاری سے کیا۔ سوسوگوار جنازے کے آگے پیچھے چل رہے تھے۔

لیکن اب ہوگا کیا؟

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں میڈم۔" ادارے والا کہہ رہا تھا۔ میرے آدمی آپ کے گھر پہنچ ہی رہے ہوں گے۔ آپ اطمینان رکھیں۔ لاش کو اس طرح لے جائیں گے کہ کسی کو کچھ پتہ ہی نہیں چلے گا۔ قبر بھی ہم نے ایسی تیار کروائی ہے کہ بس ایک طرف سے ذرا سی مٹی اٹھانی ہے اور لاش بکسے کے اندر رکھ کر اس پر پھر مٹی ڈال دی جائے گی۔"

ادارے والا معذرت کر رہا تھا۔ ہم نے تو بہت کوشش کی کہ آپ کو کسی طرح ہانگ کانگ اطلاع دی جائے لیکن وہاں کے کمپیوٹر میں شاید وائرس آگیا تھا اور ہم نے یہ بھی سوچا کہ آپ کی پکنک کا مزا کیوں خراب کیا جائے۔

تبھی باہر کے دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس ادارے کے آدمی لاش کو لینے آئے تھے۔

گھنٹی کی تلخ آواز جتنے زور سے اس کے کان کے پردے کو پھاڑ رہی تھی، اس سے زیادہ لاش کی بدبو اس کے نتھنوں میں بھر رہی تھی اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی سانس رکی جا رہی ہو۔

دنت کتھا

راجستھان کے تھل کے علاقے میں یہ مثل مشہور تھی کہ ڈاکو بختاور سنگھ سے تو بچ کر آدمی جا سکتا ہے لیکن راجپوت بختاور سنگھ کی مہمان نوازی سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

دونوں کا علاقہ ایک تھا۔

اگر کچھ فرق تھا تو صرف یہ کہ راجپوت بختاور سنگھ کی مہمان نوازی اس کے گھر کے چاروں طرف پانچ کوس کے فاصلے تک محدود تھی اور ڈاکو بختاور سنگھ کا علاقہ دس کوسی کہلاتا تھا۔ یعنی دس کوس کے علاقہ میں کوئی اکیلا دکیلا یا کوئی بھولا بھٹکا کارواں یا بارات جو بھی آگیا، اسے لٹنا ہی ہے۔ اور جس نے ذرا سی اکڑ فوں دکھائی اس کی لاش پھر کبھی کسی کو ملی نہیں نہ گھر والوں کو اور نہ پولیس والوں کو۔

کئی لوگ کہتے تھے کہ ڈاکو بختاور سنگھ اور مہمان نواز بختاور سنگھ ایک ہی آدمی ہے اور وہ ڈاکے ڈال کر یا لوگوں کو لوٹ پاٹ کر جتنا روپیہ کماتا ہے وہ سب کا سب اپنے گھر سے پانچ کوس کے اندر سے گزرنے والے راہگیروں کی سیوا پانی کرنے میں خرچ کر دیتا ہے۔

دوسرے لوگ کہتے ہیں۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ڈاکو بختاور سنگھ اور آدمی ہے اور مہمان نواز بختاور سنگھ دوسرا آدمی۔ اپنی رائے کی حمایت میں وہ یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ بختاور سنگھ کے آدمیوں نے مہمان نواز بختاور سنگھ کو بھی لوٹا ہے۔

اب بھلا کوئی یہ بتائے کہ کوئی ڈاکو اپنے ہی گھر کو کیسے لوٹ سکتا ہے۔

ہاں مہمان نواز بختاور سنگھ کی پنچ کوسی پکی تھی۔ اور ایک جگہ قائم تھی۔ ڈاکو بختاور سنگھ کی دس کوسی کی حد چھوٹی تھی اور تھوڑی بہت نہیں کافی بدلتی رہتی تھی۔ یعنی جس جگہ اس کا پڑاؤ ہو وہاں سے اس کی دس کوسی کی حد شروع ہوتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح جھوٹ وقت اور موقع محل کے ساتھ، ساتھ اپنا رنگ روپ بدلتا رہتا ہے بس یہی حال ڈاکو بختاور سنگھ کے ڈاکوں کی حد کا تھا۔

اصلیت کچھ بھی ہو، دونوں کے اثر ورسوخ کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اس وقت کہانی تو میں مہمان نواز بختاور سنگھ کی لکھنے جا رہا تھا اور ڈاکو بختاور سنگھ کا ذکر میرے ذہن کو ورغلا کر اپنی طرف لے گیا۔ تو میں کہانی شروع کرتا ہوں۔

ایسا سننے میں آیا ہے کہ مہمان نواز بختاور سنگھ نے بہت سے طوطے پال رکھے تھے، جو اس کی حد میں چاروں طرف اول تو اڑتے رہتے تھے اور کبھی آرام کرنا ہوا تو بھی اس نگری کی کھیجڑی یعنی بیڑیوں کے جھنڈ کی اوپری شاخوں پر بیٹھے اپنی تیکھی نظروں سے اس طرح دیکھتے رہتے تھے جیسے چور لوٹ کے مال کی نگرانی کرتے ہیں۔ جیسے ہی کوئی مہمان بختاور سنگھ کی حد میں داخل ہوتا تو طوطا تیز اڑان بھر کر بختاور سنگھ کی حویلی میں پہنچ کر بختاور سنگھ کے قدموں کے پاس آکر بیٹھتا اور بولنے لگتا۔

”مہمان آئیو جی، بھگوان آئیو جی، مہمان آئیو جی، بھگوان آئیو جی۔“

خوشی کی یہ خبر سن کر بختاور سنگھ کی بیوی جلدی سے اٹھتی اور دیسی گھی کی چوری کی مٹھی بھر کر طوطے کو اپنے ہاتھ سے کھلاتی اور بختاور سنگھ کے کتے مالک کا اشارہ پا کر مہمان کو لانے کے لئے دوڑ پڑتے۔

اس سلسلے میں لوگ یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ طوطے مہمانوں کی گنتی بھی بتاتے تھے۔ ایک ہوتا تو وہ ایک بار پھد کتا۔ دو ہوتے تو دو بار اور اگر مہمانوں کا قافلہ ہوتا تو وہ بختاور سنگھ کے سامنے کتنی دیر تک ناچتا رہتا۔ آنکھوں دیکھی کہنے والے تو یہ تک کہتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر بختاور سنگھ اور اس کی بیوی بھی کئی بار طوطے کے ساتھ خوشی میں ناچنا شروع کر دیتے تھے اور اگر نوکر چاکر بھی شامل ہو جاتے تو اچھا خاصا سماں بندھ جاتا۔ پھر مہمانوں کی آؤ بھگت کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔

یوں کہہ لیجیے کہ مہمان کی خبر ملنے پر کچھ ایسا ہی منظر ہوتا جیسے اچانک چشمہ پھوٹ پڑنے پر صحرا کی ریت کا ذرہ ذرہ جاگ جاتا ہے۔ پانی تل تل پھوٹ پڑا اور زندگی نے اس کی تال پر گنگنانا شروع کر دیا۔ مہمان ایک ہو یا پورا قافلہ۔ پوری کی پوری حویلی جاگ جاتی۔ کہیں مہمان خانے میں چارپائیاں بچھائی جا رہی ہیں کہیں رسوئی میں برتن کھنک رہے ہیں۔ یہاں تک کہ گھر کے آنگن میں لگی ہوئی بیری اپنے تن کا سارا رس نچوڑ کر شاخوں پر لگے ہوئے موٹے بیروں میں بھرنے لگتی تا کہ بیر زیادہ سے زیادہ میٹھے ہو جائیں۔ یہاں تک ہوتا کہ حویلی کی دیواریں ایڑیاں اٹھا اٹھا کر جب یہ دیکھنے کی کوشش کرتیں کہ مہمان ابھی کتنی دور ہے تو دیکھنے والوں کو لگتا جیسے حویلی پہلے سے کچھ زیادہ اونچی ہو گئی ہو۔ ایسے میں ایک بار انہونی ہو گئی۔

ہوا یہ کہ جو طوطا سرحد پر بختاور سنگھ کی حد میں آنے والے مہمانوں کی اطلاع دینے کے لئے تعینات تھا وہ ایک نئی طوطی کی آؤ بھگت میں لگ گیا۔ وہ پوری ایمانداری سے سرحد کی طرف آنے والے لوگوں پر نظر ٹکائے تھا کہ کیا دیکھتا ہے کہ فضا میں جیسے کوئی نیا ستارہ نمودار ہوا ہو۔ وہ ستارا ذرا قریب آیا تو اس نے دیکھا ارے یہ تو کوئی طوطی ہے۔ طوطی بھی ایسی کہ جس کی خوبصورتی کی تڑک بھڑک سے فضا خوبصورت ہو گئی۔ جب وہ اس کی بیری کی شاخ پر آکر بیٹھی تو اس نے دیکھا کہ شاخ کے پتے پھول کی پتیاں بن کر اس کے پنجوں کے نیچے بچھے جا رہے تھے۔۔ اس کے بیٹھنے پر شاخ ناچتی جا رہی تھی، ناچتی جا رہی تھی، کیا طوطی تھی۔ طوطی

تھی یا کوئی اپسرا۔ لال لال چونچ، گلے میں اس سے بھی لال رنگ کی گانی، اور اسکے پنکھوں کا ہرا رنگ ایسا جیسے ساری بنسپتی کی ہریاول اس کے پنکھوں میں سمائی جارہی ہو۔ طوطا بھی اس کے لئے ایک بیر توڑ کر لائے کبھی دوسرا۔ وہ اس کے پیش کیے ہوئے بیر کھارہی تھی اور طوطا اس سے سوال پر سوال کیے جارہا تھا۔

تم کس دیش سے آئی ہو؟ اس طرف کیسے آنا ہوا؟

اب تم یہیں رہ جاؤ۔ ہم اپنی ایک نئی دنیا بسائیں گے۔ یہاں بختاور سنگھ سا مہمان نواز رہتا ہے۔ اس کی بیوی کے ہاتھ کی بنی ہوئی چوری بڑی میٹھی ہوتی ہے۔ دیسی گھی کی چوری۔ تم کھاؤگی تو خوش ہو جاؤگی۔

ادھر یہ طوطا اپنی مہمان طوطی کی آؤ بھگت میں لگا رہا اور اس کے ساتھ مل کر ایک نئی دنیا بسانے کے سپنے دیکھتا رہا۔ اور ادھر ہوا یہ کہ ایک مہمان آیا۔ بختاور سنگھ کی حد میں داخل ہوا اور اپنی چال چلتا ہوا حویلی کے پاس سے ہی کہیں گزرتا ہوا بختاور سنگھ کی پانچ کوسی سے باہر چلا گیا۔

اس دن صحرا میں قل قل کرتا نہ کوئی چشمہ پھوٹا، نہ ہوائیں اس کی تال پر گنگنائیں نہ بیریوں کے بیر میٹھے ہوئے نہ حویلی کی دیواروں کا قد اونچا ہوا۔ ہوتا کیسے؟ کسی نے مہمان کو آتے دیکھا ہی نہیں تھا۔

لیکن بختاور سنگھ کو اس کا پتہ چل گیا۔ اتفاق سے اس دن وہ صبح ہی کسی کام سے پاس کے شہر جودھ پور گیا تھا۔ وہاں سے لوٹتے لوٹتے اسے شام ہو گئی۔ گھر کی طرف لوٹتے ہی اسے ریت پر کسی کے جانے کے پاؤں کے نشان دکھائی دیئے۔ جلدی جلدی گھر آکر اس نے پوچھا تو اسے حیرانی ہوئی کہ کوئی مہمان نہیں آیا تھا۔ تو پھر ادھر سے کون نکل کے گیا۔

پوری تفتیش ہوئی۔ اس مقصد کے لئے کتے دوڑائے گئے۔ طوطے اڑائے گئے۔ سانڈنی کے سوار ہانپ ہانپ گئے۔ طوطوں کے ایک جھنڈ کو حویلی کی طرف سے آتا دیکھ کر عشق لڑاتے والا طوطا آنے والے خطرے کو بھانپ کر سارا عشق بھول گیا۔ اس نے طوطی

کو تو اڑا دیا۔ خود چھپنے کی کوشش میں پکڑا گیا اور گھیر کر مالک کے پاس لایا گیا۔ اس بیچ اصلیت واضح ہو گئی۔ جس طرف مسافر کے جانے کے نشان پائے گئے تھے وہاں کی سرحد پر تعینات طوطے نے خبر دی کہ تھوڑی دیر پہلے ایک مسافر حد سے باہر نکل کر گیا ہے اور اب وہ حد سے کوئی ایک کلو میٹر دور جنڈ کے پیڑ کے نیچے آرام کر رہا ہے۔

بس یہ سننا تھا کہ بختاور سنگھ نے کندھے پر بندوق ڈالی۔ اچھل کر اپنی ہوا سے باتیں کرنے والی سانڈنی پر سوار ہوا۔ جاتے جاتے اپنے باز سے کہا کہ قصوروار طوطے کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالو اور جب تک میں لوٹوں اس کے پنکھ میرے لوٹنے والے راستے پر بکھرے ہوئے ہونے چاہئیں۔ جب باز کی چونچ میں دبے ہوئے طوطے کے گلے سے آخری چیخ نکلی تو بختاور سنگھ کی بیوی کا دم خشک ہو گیا۔ اس کے دل میں کئی وسوسے ابھرے لیکن اپنے شوہر کے سامنے اس کی زبان کب کھلی تھی جو اب کھلتی۔

دوسرے ہی لمحے بختاور سنگھ کی اونٹنی ہوا میں ریت کا غبار بناتی ہوئی دوڑی جا رہی تھی اور بختاور سنگھ کی بیوی نے دو ایک اور سانڈنی سوار بھی پیچھے پیچھے بھیج دئے تھے۔

کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر جنڈ کے نیچے سویا ہوا اجنبی مسافر ہڑ بڑا کر اٹھا تو اس نے سوچا، شاید ڈاکو بختاور سنگھ کے آدمی اسے لوٹنے آ گئے ہیں۔ لیکن سب سے پہلے خطرا تو کتے سے تھا۔ اس سے ڈر کر اس نے پیڑ پر چڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن وقت کہاں تھا۔ پیڑ پر چڑھتے ہوئے اس نے سوچا کہ کتا اسے ٹانگ سے گھسیٹ کر نیچے گھسیٹ لے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اس نے کتے کو جل دینے کے لئے کندھے سے اپنی چادر اتاری اور کتے کے اوپر پھینک دی۔ کتے کا منہ ڈھکا تو اس نے سوچا۔ اجنبی نے اس پر حملہ کیا ہے۔ اپنے حملہ آور کو دبوچنے کیلئے وہ اچھلا۔ اس بیچ اونٹنی سے اتر کر بختاور سنگھ، مہمان کو کتے سے بچانے کیلئے آگے بڑھا تو چادر سے ڈھکے منہ والے اپنے ہی کتے نے اس کی گردن کو پنجوں میں جکڑ اور مروڑ کر رکھ دیا۔

اگلے ہی لمحے زمین پر پڑے بختاور سنگھ نے دم توڑ دیا۔

جنڈ سے لٹکا ہوا مسافر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ ایک پل ہی پل میں یہ

کیا ہو گیا ہے۔

بختاور سنگھ کے آدمیوں سے گھرا ہوا وہ اجنبی جب بختاور سنگھ کی لاش کے ساتھ حویلی پہنچا تو بختاور سنگھ کی بیوی نے شوہر کی لاش کی طرف دیکھا، سارا ماجرا سنا، پھر گھر آئے مہمان کے پاؤں پکھارے، پوری آؤ بھگت کے ساتھ اسے کھانا کھلایا پھر گھر کے اندر سے شوہر کی تلوار لا کر اجنبی کی گردن کاٹ کر رکھ دی جس کی وجہ سے اسکا اپنا سہاگ لٹ گیا تھا۔

اس دنت کتھا کو بتانے والے یہ بھی بتاتے سنے گئے ہیں کہ مہمان نواز بختاور سنگھ کی اس دردناک موت کے بعد قتل کے علاقے سے ڈاکو بختاور سنگھ کہاں چلا گیا۔ کسی کو پتہ نہیں۔

✓

تیری میری سب کی بات

میں بھوپال کی شاملہ پہاڑی کی اک پگڈنڈی پر چلا جارہا تھا کہ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہوا میں خوشبو بھر ہوگئی ہو جیسے پگڈنڈی دھیرے دھیرے کوئی گیت گنگنارہی ہو، جیسے دھرتی کے کن کن میں گھنگھرو سے بج اٹھے ہوں۔ میں نے حیرانی سے رک کر نیچے تال کی لہروں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی خوشی سے ناچ رہی تھیں۔

یہ ماجرا کیا ہے؟ حقیقت یا سپنا۔ تبھی مجھے احساس ہوا کہ یہ حقیقت بھی ہے اور سپنا بھی۔ حقیقت یہ تھی کہ پگڈنڈی کے متوازی تالاب کے کنارے کنارے جو سڑک چلی گئی ہے، اس پر کوئی کھلونے بیچنے والا بانس کی بنی کھلونا سارنگی بجارہا تھا اور اس کی میٹھی دھن ہوا کے دوش پر سوار ہو کر مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ اور سپنا یہ کہ سارنگی کی اس دھن کے کانوں میں پڑتے ہی اس کے سر اس سارنگی کے سروں سے جا ملے تھے جو میں نے پچاس ساٹھ سال پہلے اپنے گاؤں میں برگد کے پیڑ کے نیچے سنے تھے، جہاں میراثی اس اپسرا کی کہانی سنا رہا تھا جو زندگی کے آغاز کے وقت پہلے پہل دھرتی پر اتری تھی۔

اب بھوپال، بھوپال کی شاملہ پہاڑی، پہاڑی کی پگڈنڈی دور ہلکورے لیتا ہوا تال، سب پیچھے رہ گئے تھے اور سارنگی کی دھن مجھے اپنے نازک بدن پر اٹھا کر ہزاروں میل دور لے گئی تھی، جہاں میراثی کی سارنگی کی دھن جادو جگا رہی تھی۔ برگد کے نیچے بیٹھے ہوئے لوگوں کی بھیڑ سانس روکے میراثی کی اونچی آواز کو سنتی ہوئی اپنے آپ سے بے خبر ہو گئی تھی۔ وہ جیسے سب کے سب مجسمے بن گئے تھے۔ کوئی ہل جل بھی نہیں رہا تھا۔ صرف برگد کے پتے تھے جو سارنگی اور الغوزے کی دھنوں کے ساتھ تال دے رہے تھے۔ اردگرد کے کھیتوں کے بیچ پتلی پتلی پگڈنڈیاں تھیں کہ بھاگتی ہوئی برگد کی طرف چلی آرہی تھیں۔ جیسے مراثی کی اونچی اٹھتی ہوئی آواز ان سب کو بلا رہی ہو کہ آؤ اس اپسرا کی کہانی سنو جو زندگی کے آغاز میں پہلے پہل دھرتی پر اتری تھی۔

اور پھر ہوا یہ کہ ایک بار سارنگی کے تاروں پر میراثی نے گز کو اس طرح آہستہ آہستہ گھمایا کہ سارنگی کا سر باریک سے باریک تر ہوتا چلا گیا اور پھر اس باریک سر میں الغوزے والے کی دھن کچھ اس طرح مدغم ہوئی جیسے ارونار میشور کی مورتی میں آدمی اور عورت کے جسم آپس میں اس طرح مدغم ہو جاتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کہاں آدمی کا وجود ختم ہوتا ہے اور کہاں سے عورت کا جسم شروع۔ سارنگی اور لغوزے کی ایک ہو رہی دھن کے اوپر تیرتی ہوئی میراثی کی آواز ابھری کہ ہاں تو بھائی بات ان دنوں کی ہے جب سورگ سے دیوتا اور اندر لوک کی اپسرائیں دھرتی پر اس طرح آجایا کرتی تھیں جیسے ہم اور آپ آج کل ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں ایک شہر سے دوسرے شہر یا پھر ایک ملک سے دوسرے ملک چلے جاتے ہیں۔

ہاں تو یہ ہوا کہ ایک جھیل کے نرمل جل سے ایک آدمی نہا کر باہر آیا اور ابھی اس نے اپنے بدن پر پھولوں کے کپڑے پہنے ہی تھے کہ اسے محسوس ہوا کہ جیسے ہواؤں میں خوشبو پھیل رہی ہو جیسے دھرتی کا ذرہ ذرہ ناچ اٹھا ہو جیسے فضاؤں میں بیٹھا سا سنگیت دھیرے دھیرے بلند ہوتا ہوا اس کے کانوں میں رس گھول رہا ہو۔

یہ کہتے ہوئے میراثی نے اپنے گز سے سارنگی کی ایسی میٹھی دھن نکالی کہ برگد کے نیچے بیٹھے ہوئے لوگ آن واحد میں اپنے بتوں کو برگد کے نیچے چھوڑ کر وقت کے اس اولیں دور میں وہاں پہنچ گئے جہاں وہ آدمی جھیل سے باہر آکر حیران ہو کر چاروں طرف دیکھتا ہوا یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر یہ سنگیت کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔

بس یوں سمجھ لیجئے کہ ایسا ہی کوئی لمحہ تھا جب مجھے شاملہ پہاڑی پر چلتے چلتے یہ احساس ہوا تھا کہ میرے پاؤں کے نیچے والی پگڈنڈی ناچ رہی ہے اور فضا میں خوشبو پھیل گئی ہے اور۔۔۔

جہاں میراثی، وہاں کہانی، جہاں کہانی وہاں سامعین۔ میراثی کہانی سناتا سناتا اپنے سارے سامعین کو کروڑوں سال پہلے کے دور میں وہیں لے گیا، جہاں یہ کہانی رونما ہو رہی تھی۔ میں بھی وہاں سب کے ساتھ ہی پتھر کی چٹان پر بیٹھ گیا۔

ہم کیا دیکھتے ہیں کہ جیسے ہی اس آدمی نے سامنے پہاڑی کی طرف نظر دوڑائی تو وہ کیا دیکھتا ہے کہ آسمان سے ایک اپسرا آئی اور ایک پہاڑی کی چوٹی پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر مسکراتے ہوئے اس نے دونوں بازویوں پھیلا دئے جیسے وہ اس آدمی کی بانہوں میں سمٹ جانے کیلئے بے چین ہو۔ اس اپسرا کی وارفتگی دیکھ کر اس آدمی نے بھی اپنے بازو پھیلائے تو وہ اپسرا ہوا میں تیرتی ہوئی نیچے اتری اور اس سے کچھ فاصلے پر آکر کھڑی ہو گئی۔

میراثی کہانی بیان کر رہا تھا اور ہم دم سادھے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور بے صبری سے انتظار کر رہے تھے کہ اب کیا ہوتا ہے۔

اپسرا کو اپنی بانہوں میں بھرنے کے لئے اس مرد کے بازو اٹھے۔ مگر پھر آہستہ آہستہ نیچے گر گئے اپسرا ایک فاصلے پر آکر رک گئی تھی۔ وہ آگے بڑھی ہی نہیں۔

ہم لوگ حیران۔ میراثی بتا رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے مرد کیا دیکھتا ہے کہ وہ اپسرا اس کی نظروں کے سامنے سے اوجھل ہو گئی۔ اسی لمحے ہم سب کو جھیل کے اوپر سنگیت کی لے تیرتی ہوئی سنائی دی۔ ہم سب نے دیکھا۔ مرد اس طرف گھوم کر دیکھ رہا ہے۔ تبھی وہ

اپسرا ایک جل پری کا روپ دھار کر جھیل کے بیچ سے نہائی ہوئی سی باہر آئی اور جھیل کے کنارے آکر مرد کی طرف اپنے بازو وا کر دیے۔ مرد نے ایک مرتبہ پھر اسے بانہوں میں بھرنے کے لیے باز پھیلائے تو اپسرا نے اچھل کر پانی کے اندر ایک غوطہ لگایا۔ پھر وہاں سے اڑتی ہوئی سی وہ آئی اور مرد سے کچھ فاصلے پر آکر کھڑی ہو گئی۔

مرد کے بازو ایک بار پھر اٹھے کے اٹھے ہی رہے اور پھر آہستہ آہستہ نیچے گر گئے۔

ایسا ایک مرتبہ اور ہوا۔ مرد کیا دیکھتا ہے کہ وہ اپسرا دور افق پر سات رنگی پینگھ پر سوار دکھائی دے رہی ہے۔ اس نے پینگھ کو ہچکولا دیا۔ اس مقام پر میراثی اپنے گز کو سارنگی پر ایسے چلا رہا تھا جیسے وہ بھی اس اپسرا کے ساتھ مل کر پینگھ کو ہچکولا دے رہا ہو۔ یہی حال الغوزے والے کا تھا۔ اس کی تان تو یوں لگتا تھا جیسے اپسرا کے ساتھ ہی اوپر اٹھتی افق کو چھونے جا رہی ہو۔ پھر جیسے جیسے پینگھ زمین کی طرف لوٹتی ویسے ویسے الغوزے کی آواز بھی مدھم ہو جاتی جیسے وہ آسمان کی بلندیوں سے نیچے اترنے کی کوشش کر رہی ہو۔ سات رنگی پینگھ پر سوار ہو کر اپسرا کبھی مرد کے بالکل قریب آجاتی اور کبھی اتنی دور کہ مرد کے ہاتھ وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔ اب کہ وہ اپسرا پینگھ سے اتری اور مرد کو لبھاتی ہوئی اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔

پھر آگے بڑھ کر اس نے مرد کے ہاتھ کو تھام لیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”بہت بھوک لگی ہے۔ کچھ کھایا جائے۔“

مرد اس اپسرا کو ساتھ لے کر جنگل میں داخل ہو گیا۔

میراثی کہانی یوں سنا رہا تھا اور ہمیں لگ رہا تھا کہ جیسے ہم سب اس کی کہانی کا حصہ بن کر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ غرضیکہ ہم سب مرد اور اپسرا کے پیچھے پیچھے دبے قدموں چلتے ہوئے جنگل میں داخل ہو گئے۔

اچھے پکے ہوئے پھلوں کی تلاش میں وہ اپسرا، مرد کے ساتھ جنگل میں تین طرف خوشی خوشی گئی۔ جب مرد نے چوتھی طرف چلنے کے لیے اشارہ کیا تو وہ اپسرا بولی۔ ”نہ

بابانہ۔ ادھر جنگل بہت گھنا ہے۔ ادھر تو لگتا ہے جیسے دن میں بھی رات کا اندھیرا پھیل رہا ہو۔"

"تو کیا حرج ہے۔ میں تو ساتھ ہوں۔" مرد کہہ رہا تھا۔

"نہیں مرد کی چاہت اندھی ہوتی ہے۔ عورت اسکے ساتھ تین طرف تو جاسکتی ہے، لیکن جو راستہ اندھیروں میں گم ہو جاتا ہو ادھر عورت کو نہیں جانا چاہیئے۔"

اس موقعے پر میراثی نے سارنگی کے گز کو اٹھا کر ہم سب کی طرف گھمایا، جیسے وہ کہنا چاہتا ہو، کہ بھائیو۔ دھیان سے سنو۔ میری سارنگی کیا کہہ رہی ہے۔

لیکن وہاں پر موجود سب سامعین کا دھیان تو اس میں لگا ہوا تھا کہ کہانی میں اب آگے کیا ہوتا ہے۔ میراثی سنا رہا تھا۔ ہم سن رہے تھے، سارنگی بول رہی تھی۔

اس طرح جنگل کے تین طرف گھومتے گھومتے اور جنگلی پھل کھا کر پیٹ بھرتے ہوئے اس مرد اور عورت کی کہانی یوں آگے بڑھتی ہے کہ اسی جنگل میں ان کو رات ہوگئی۔ رات کو آرام کرنے کے لیئے ان دونوں نے ایک پیڑ کی پھیلتی ہوئی جڑوں کے درمیان سوکھے پتوں کا بستر بچھایا اور لیٹ گئے۔

پاس پاس لیٹے لیٹے مرد نے اپسرا سے کہا "میں نے آپ کو آسمان سے اترتے ہوئے دیکھا تھا، بس اس سے زیادہ میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

ہم سب کے کان کھڑے ہوگئے۔ دیکھیں اپسرا کیا جواب دیتی ہے۔

پھر ہمارے کانوں میں میٹھا ساز سا بج اٹھا۔ اپسرا کہہ رہی تھی۔ "کیا یہ کافی نہیں کہ میں ایک عورت ہوں۔"

اپسرا یہ کہہ کر خاموش ہوگئی تو مرد نے اس کے جملے کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں۔ عورت اور خوبصورت عورت" مرد ایک لمحے کے لیئے رکا۔ اپنے جملے کا تاثر اپسرا کے چہرے پر دیکھا اور پھر بولا۔ "خیر خوبصورتی تو ہر عورت کا پہلا اور آخری تعارف ہے۔ مگر پھر بھی میں کچھ اور جاننا چاہتا ہوں۔"

"میرے بارے میں مزید جاننے کی کوشش نہ کرو۔"

"لیکن کیوں؟"

"وہ اس لئے کہ میں ڈرتی ہوں کہ میرے بارے میں سب کچھ جان کر تمہیں سرشٹی کے رچنے والے برہما جی کی طرح پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں" مرد بولا۔

اس سے پہلے کہ وہ اپسرا کچھ بولنے کے لئے اپنے ہونٹ کھولے، میراثی نے سارنگی پر کچھ ایسی دھن نکالی جیسے ہم سب کو سمیٹ کر اس اپسرا کے قریب لا رہا ہو تا کہ ہم اس کی روداد کو اچھی طرح سن سکیں۔

اپسرا کہہ رہی تھی

"مجھے پیدا کرنے کے بعد میرے پیدا کرنے والے برہما میری خوبصورتی پر اس حد تک موہت ہو گئے کہ وہ میری طرف دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ یہاں تک کہ میں شرم کے مارے سمٹتی چلی جا رہی تھی۔ آخر برہما جی کی نظروں سے بچنے کے لئے میں چاروں طرف گھوم گئی تو وہ بھی میرے ساتھ ساتھ گھومتے چلے گئے۔ اس طرح مجھے جی بھر کر دیکھنے کے لئے ان کے چار سر وجود میں آگئے۔ آخر میں نے ان کے دھام کو چھوڑا اور زمین پر اتر آئی۔ تبھی تم نے مجھے دیکھا۔"

ہم دم بخود

سارنگی خاموش

الغوزہ چپ

آخر سکوت کو مرد نے توڑا۔ "تمہاری خوبصورتی کو دیکھ کر جب خود برہما جی کا من ڈگمگا گیا تو میرے اندر تمہیں پانے کی خواہش ایک قدرتی جذبہ ہے۔" آدمی نے یہ کہا اور اس اپسرا کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے اپنے بازو پھیلا دئے۔

کہانی کے اس مقام پر پہنچنے پر ہم اس بات کی امید کر رہے تھے کہ ابھی ہم اور نار

میشور کا وہ بت تخلیق ہوتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے، جس میں یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کہاں سے مرد کا جسم ختم ہوتا ہے اور عورت کا شروع۔ لیکن سارنگی کی دھن اچانک ڈوبنے لگی۔ الغوزہ تو جیسے کراہنے لگا اور میراثی نے سارنگی، الغوزے، یہاں تک کہ اس مرد یا شاید اس اپسرا کے درد کو بھی اپنی آواز میں بھر کر کہانی یوں آگے بڑھائی کہ مرد کے بازو، آگے بڑھتے بڑھتے سوکھے پتوں پر پھیلتے چلے گئے۔ وہ اپسرا تو اندھیرے کا حصہ بن کر کافور ہو چکی تھی۔

سارنگی کا سر غمگین ہوا تو برگد پر بیٹھے ہوئے کبوتر نے گردن گھما کر ادھر دیکھا، جس طرف الغوزے والے کی گردن گھوم گئی تھی اور کبوتر حیران رہ گیا۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس کے پاس بیٹھی ہوئی کبوتری کب پرواز بھر گئی تھی۔ وہ تو میراثی کی کہانی سنتا سنتا اس مرد کے غم میں ڈوبا تھا جس کے پاس لیٹی ہوئی اپسرا پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اور اب اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

کبوتر سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اس نے دور آسمان تک نظر دوڑائی۔ اسے کبوتری کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے دل میں آیا کہ وہ اڑ کر جائے۔ لیکن میراثی کی کہانی، سارنگی کی دھن، الغوزے کے سر، سب کے سب اسے مانو جکڑے ہوئے تھے۔ سب کے سب بت بنے کہانی سن رہے ہیں، تو وہ بھی سنے گا۔

تبھی میراثی کی کہانی آگے بڑھی۔ مرد ہڑبڑا کر اٹھتا ہے۔ اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ پھر اسے ہوا میں اسی سنگیت کی آواز تھرکتی ہوئی سنائی دیتی ہے، جیسی اس نے اپسرا کے آکاش سے اترتے وقت سنی تھی۔ اپسرا یہیں کہیں ہے۔ مرد نے سوچا۔ اسنے آواز دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ پھر وہ سنگیت ذرا اوری پر سنائی دیا۔ مرد اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا ہوا ادھر بڑھا، تو پھر اسے اپسرا کی خوشبو جیسے چاروں طرف پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ پاگلوں کی طرح چاروں طرف بھاگا۔ لیکن ہر طرف سے اسے مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ مرد بے چین آخر وہ کرے تو کیا کرے؟ اسے کسی پل چین نہیں تھا۔ اس اپسرا کو پانے کے لئے اس کے اندر خواہش ہے کہ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوا ہے جیسے وہ اس کے

بغیر ادھورا ہو گیا ہو۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ ایک پگڈنڈی پر اس اپسرا کی خوشبو کا پیچھا کرتے کرتے اسے احساس ہوا کہ اس کے پاؤں کی جھنکار کی آواز جیسے دو طرف سے آرہی ہو۔

سارنگی والے نے گز اس طرح گھمایا کہ جیسے ایک سر دو حصوں میں بٹ گیا ہو۔ اس آدمی نے بھی خود کو ایک سے دو کیا، اور ان میں سے ایک، ایک پگڈنڈی پر اور دوسرا دوسری پگڈنڈی پر چل دیا۔

برگد کے نیچے بیٹھے جیسے جیسے میراثی کی کہانی آگے بڑھی، ویسے ویسے ہم نے محسوس کیا جیسے ہم سب بھی، اس مرد کے وجود سے باہر نکل کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے ہوں۔ ہم بھی اس کے ساتھ مل کر اس اپسرا کی تلاش کر رہے ہوں۔ ہم نے دھرتی کا کونا کونا چھان مارا۔ دھرتی کا ہر ذرہ ذرہ اس اپسرا کی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا لیکن وہ خود کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر طرف پگڈنڈی ناچتی، راستے اس کی موجودگی کا گیت گاتے، ہواؤں میں بھری خوشبو اس کا پتہ دیتی تھی۔ اس طرح اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے وقت گزرنے لگا۔ وہ رات بیتی، اگلا دن، اگلا سال، اگلا یگ، کروڑوں سالوں کا عرصہ۔ اس عرصے میں اس آدمی نے کروڑوں جسموں میں خود کو ڈھالا اور اس اپسرا کی تلاش جاری رکھی۔ لیکن اس اپسرا کو کہیں دکھائی نہیں دینا تھا تو وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔

شاملہ پہاڑی پر پگڈنڈی نے جب میرے آگے آگے ناچتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا تو مجھے ایسا ہی لگا تھا جیسے وہی خوشبو گرد و پیش میں پھیلی ہوئی ہے اور ایک عورت میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ ہنستی ہوئی، مسکراتی ہوئی، میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہوئی۔ تبھی آسمان پر بادلوں کا ایک ٹکڑا آیا اور اچانک موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ اور پھر وہ بادل کھل گئے اور بارش ہم دونوں کو شرابور کر رہی تھی۔ اس عورت کے بالوں سے اتر کر اس کی ناک کی نوک سے گزرتا ہوا پانی موتی بن کر گر رہا تھا۔ اور مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے اس عورت کے حسن کے موتی جا بجا بکھر رہے ہوں۔ موتی بکھر رہے تھے اور اس کے حسن میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے بھیگتے ہوئے دیکھ کر میں نے بار بار کہا۔ آؤ سامنے اس عمارت کی طرف چلتے ہیں۔ اس کے

برآمدے میں ہمیں بارش سے پناہ مل جائے گی۔ لیکن ہر بار وہ یہی کہتی۔ ”نہ بابا نہ۔ سونی عمارت کی طرف نہیں جاؤں گی۔“

تبھی مجھے احساس ہوا کہ یہ سب تو محض کلپنا تھی۔ میرے ساتھ وہ عورت ہے کہاں ؟ وہ تو اس اپسرا کی طرح ذرا دیر کو اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو گئی۔

اور میں نے محسوس کیا جیسے میراثی نے سارنگی کی تاروں پر بڑی زور سے گز گھمایا ہے اور وہ میرے دل کا درد بیان کر رہی ہے۔ اپسرا کو نہ پا سکنے کا درد۔ اور میرے غم میں الغوزے کی آواز اس قدر غمگین ہو گئی ہے کہ برگد کے نیچے اپسرا کی کہانی سننے والے تمام لوگوں کی آنکھیں نم ہو گئی ہیں۔ اپنی آنکھوں میں نمی دیکھ کر میں نے اپنی طرف سے اس عورت کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ مجھے آنسو پونچھتے ہوئے دیکھ تو نہیں رہی تھی..... لیکن وہ تو میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا کہ وہ در حقیقت وہاں کبھی تھی ہی نہیں۔

شاملہ پہاڑی کی پگڈنڈی پر میں ایک موڑ مڑ رہا ہوں اور میرے ذہن میں میراثی کی کہانی بھی ایک نیا موڑ مڑ رہی ہے۔ میراثی نے اپنے گز کو تاروں پر پھیرتے ہوئے ایک لمبی درد بھری تان نکالی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے سارنگی، کہانی کے اس موڑ پر پہنچتے ہوئے رو پڑی ہے۔ سارنگی بجانے والا تان کے ساتھ ساتھ کہہ رہا ہے۔ ”اے میری کہانی سننے والے بھائیو۔ میری سارنگی بڑی جادوگرنی ہے۔ اس کی درد بھری آواز کو کہیں اپنے دل میں نہ بھر لینا۔“

سارنگی والے کا جملہ ابھی یہیں تک آیا تھا کہ الغوزے والے نے منہ اونچا اٹھا کر الغوزے کی دھن اٹھائی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کے سر کو سن کر آسمان کا سینہ پھٹ جائے گا۔ ماحول میں پوری طرح سناٹا چھایا ہوا تھا اور الغوزے والا کہہ رہا تھا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ میرے الغوزے کی دھن تمہاری سینوں میں پیوست ہو گئی ہے۔ اپنے گھروں کو جانے سے پہلے، میں کہتا ہوں، اسے نکال دو۔ نہیں تو یہ بڑا پریشان کرے گی۔“

پھر سارنگی والا بولا۔ ”اے بھائیو۔ میرا ساتھی سچ کہتا ہے۔ ہمارے یہاں سے

جانے کے بعد اگر ان سازوں کی آوازیں آپ کو اپنے کانوں میں سنائی دیں تو کہیں اس اپسرا کی تلاش میں نکل نہ پڑنا۔ ورنہ ہماری طرح زندگی بھر جنگل جنگل، شہر شہر کی خاک چھانتے پھرو گے۔"

"ایسا نہ ہو کہ کسی جنگل میں بھٹکتے ہوئے مجھے قصوروار ٹھہراؤ۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے تو صرف اس اپسرا کی کہانی ہی سنائی ہے جو زندگی کے آغاز میں آسمان سے اتری تھی۔"

برگد کے نیچے کھڑا میراثی یہ کہہ رہا تھا اور وہاں بیٹھے ہوئے سامعین اب بھی بت بنے میراثی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اب میراثی خاموش تھا، الغوزہ خاموش تھا، لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی خاموشی میں بھی اپسرا کی کہانی سنائے چلے جا رہے ہوں۔

اس خاموشی میں مجھے چند دن پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ میں اور مالن کی لڑکی اپنی جھولیوں میں گلاب کے پھول بھرے باغ سے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے تو ہماری پگڈنڈی ہمیں ایسے مقام پر لے آئی جہاں دونوں طرف لمبے لمبے گنوں کے جھکے ہونے کی وجہ سے پگڈنڈی اوپر سے پوری طرح ڈھکی ہوئی تھی۔

"نہ بابا نہ۔ یہاں تو بڑا اندھیرا ہے۔ ماں نے کہا تھا۔ اندھیرے راستوں سے ہو کر مت گزرنا۔" اور ہمیں راستہ بدلنا پڑا تھا۔

تب سے اکثر مالن کی لڑکی میرے تصور میں آ جاتی تھی۔ اب بھی برگد کے نیچے بیٹھا بیٹھا بڑی خاموشی سے سارنگی والے کی طرف دیکھتا ہوا، میں اپنے گرد اس مالن لڑکی کی جھولی سے پھوٹتی ہوئی خوشبو کو اپنے نتھنوں میں محسوس کر رہا ہوں اور مجھے ایسا لگ رہا ہے، جیسے میں ہی وہ پہلا مرد ہوں جو جھیل کے نرمل جل سے نہا کر نکلا ہے اور وہ مالن لڑکی ہی وہ اپسرا ہے جو اس وقت آسمان سے اتری تھی اور میرا دل کر رہا ہے کہ میں بھاگ کر اس کے گھر جاؤں اور......

میراثی نے برگد کے نیچے کھڑے سارنگی پر غلاف چڑھا دیا ہے۔ الغوزے

پر بھی غلاف چڑھا دیا گیا ہے۔ دونوں نے اپنے اپنے ساز اپنی پیٹھ پر لاد لیے ہیں۔ وہاں برگد کے نیچے بیٹھے گاؤں کے لوگ بھی جیسے اپسرا کی تلاش کو بیچ میں چھوڑ کر واپس آ گئے ہیں۔

فضا میں مکمل سناٹا ہے۔

تبھی برگد پر بیٹھے اکیلے کبوتر نے پنکھ پھڑپھڑائے اور دوسرے ہی لمحے وہ پرواز میں تھا۔

"یہ تو گیا اپنی اپسرا کی تلاش میں" کسی نے کہا۔ "اس کی اپسرا کو اس کے پاس سے اڑ کر جاتے میں نے خود دیکھا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ پہلا مرد کبوتر کا بھیس بنا کر اپنی کہانی سن رہا تھا۔ ورنہ اتنی دیر بیٹھا کیوں رہتا۔"

دوسرے نے کہا۔

سارنگی والا اپنی کہانی سنانے کے لئے کسی دوسرے گاؤں کی طرف چل دیا ہے۔

یا کون جانے۔ سارنگی بجا کر کہانی سنانا محض ایک بہانہ ہو۔ ممکن ہے یہ خود ہی وہ پہلا مرد ہو جس نے وقت کے آغاز پر، اپسرا کو دھرتی پر اترتے دیکھا تھا اور اب یہ گاؤں گاؤں بھٹک کر اپنی اپسرا کو تلاش کر رہا ہو۔

سارنگی والے کے جاتے ہی میں بھی واپس شاملہ پہاڑی پر آ گیا ہوں۔ کھلونے والے کی سارنگی کی آواز میرے کانوں میں اب بھی آ رہی ہے۔

آپ بھی اگر یہ آواز سن رہے ہوں تو اسے سن کر کسی اپسرا کی تلاش میں نہ نکل پڑیے گا۔ میراثی کی بات کو یاد رکھئے کہ اگر یہ تلاش شروع کی تو جنگل جنگل بھٹکنا پڑے گا۔ اگر ایسا ہوا تو اپنی پریشانی کے لئے کسی دوسرے کو ذمے دار نہ ٹھہرائیں۔ اور مجھے تو بالکل نہیں۔ میں نے تو بقول میراثی کچھ نہیں کیا۔ اس کی کہی ہوئی کہانی ہی سنائی ہے۔ صرف۔

✓

پیار کی جیت

کشمیر میں موسم بہار کی آمد آمد تھی۔ پہاڑوں کی قندروں، برف کے جھکے ہوئے تودوں پیڑوں اور اونچے اونچے لکڑی کے مکانوں کی محرابوں کے ساتھ جھالروں کی طرح جمی ہوئی برف کے موتی پگھلنا شروع ہو گئے تھے۔ وادی میں ٹھمک ٹھمک چلتی ہوئی ہواؤں میں نئے نئے کھلے ہوئے شگوفوں کی خوشبو بھر گئی تھی اور چاروں دشائیں مہک اٹھی تھیں۔ زندگی کی سانسیں معطر ہو گئی تھیں۔

ایسے میں اپنے تنبو میں سوئی نوراں نے سپنا دیکھا کہ اچانک اس پر پھولوں کی بارش ہونے لگی اور اس کے جسم کا انگ انگ پھولوں کا ہی بن گیا۔ اپنے پھولوں کے جسم کے ساتھ وہ تنبو سے باہر نکلی تو آسمان میں پورا چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ اسے لگا کہ جیسے کوئی اسے بلا رہا ہو۔ اس نے تنبو سے باہر قدم رکھا تو اس کے قدموں کے نیچے مخملی گھاس کی پٹی بچھتی چلی گئی جیسے جیسے وہ آگے بڑھتی گئی اس نے محسوس کیا کہ اس کے وجود میں ایک نئی تازگی بھر رہی ہے۔ اس کے اندر ہی اندر قل قل کرتی کوئی ندی بہہ رہی ہے۔ ایک

سنگیت ہے، جس کی مٹھاس نشہ ساہن کر اس کے دل و دماغ پر طاری ہو تا جا رہا ہے۔

اس طرح چلتی ہوئی وہ ایک جھیل پر پہنچی۔ جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں جھلملا تا ہوا پورا چاند جیسے اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر اس چاند پر پڑی، چاند کے وجود سے ایک ہالہ سا ابھرا اور کھڑا ہو گیا۔ نوراں کا اپنا پھولوں کا جسم بھی سامنے والے ہالے کی طرح نور ہی نور ہو گیا اور پھر جس طرح جھیل کے پانی کی لہر پانی کی دوسری لہر میں ضم ہو رہی تھی، جس طرح فضا میں بہتی ہوئی ہوا کی لہر دوسری لہر میں ضم ہو رہی تھی، اس طرح یہ دو نورانی ہالے ایک دوسرے کے وجود میں سما کر ایک ہو گئے اور نوراں نے محسوس کیا جیسے اس کی ذات جھیل کے پانی پر تیرتی ہوئی ساری جھیل پر چھا گئی۔ پھر یہ ہوا کہ ہوا کی لہروں پر سوار ہو کر اس کا وجود پوری وادی پر چھا گیا۔ نوراں کو یاد ہے کہ اس نورانی ہالے کی شکل میں ایک طائر کی طرح پرواز کرتے ہوئے انہوں نے دریا پار کیے۔ جنگل پار کیے، برف سے ڈھکے ہوئے اونچے اونچے پہاڑوں سے بھی آگے نکل گئے اور آخر وہ پیر دستگیر کے نام کے سب سے اونچے پہاڑ کے دامن میں اترے تو نوراں کیا دیکھتی ہے کہ نورانی ہالے سے دوسرا وجود باہر نکلا۔ یہ دوسرا وجود اب ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اب وہ بھی نوراں تھی۔ ہاڑ مانس کی نوراں۔ پھر پیر دستگیر کی چوٹی سے پیر دستگیر خود ظاہر ہوئے۔ انہوں نے نوراں کے ہاتھ کو اس خوبصورت نوجوان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انہیں لمبی عمر تک سکھ بھری زندگی جینے کی دعائیں دیں اور پھر.....

پھر جس طرح نئی نئی گری ہوئی برف کا گالا دیکھتے ہی دیکھتے تحلیل ہو کر غائب ہو جاتا ہے ٹھیک اسی طرح نوراں کا سپنا ٹوٹ گیا ور دوسرے ہی لمحے اپنے تنبو میں سوئی ہوئی نوراں کی نیند کھل گئی، سویرا ہو گیا تھا اور باڑے میں اس کی بھیڑیں عملی زندگی کے کاموں میں مصروف ہونے کے لئے اسے آوازیں دے رہی تھیں۔

ہو بہو ایسا ہی سپنا ایک دوسرے پہاڑ پر اپنے تنبو کے اندر سوتے ہوئے گجر لڑکے نور محمد نے دیکھا تھا اور سپنے کے ٹوٹتے ہی وہ جیسے پوری طرح جاگ گیا تھا۔ وہ تو ایسا محسوس کر

رہا تھا جیسے اب تک وہ ساری زندگی سویا ہی رہا ہو اور اس سپنے نے اسے پوری طرح جگا دیا ہو۔ نوراں کے نورانی نین نقش اس کی آنکھوں کے سامنے جھلملا رہے تھے۔ وہ لمبے لمبے سانس لیتا تو اسے ایسے لگتا جیسے ہر سانس کے ساتھ نوراں اس کے وجود میں داخل ہو کر اس کے دل کی بستی کو روشن کر رہی ہو۔ اسے اپنے آپ سے خوشبو سی آ رہی تھی اور وہ تصور ہی تصور میں نوراں کے ساتھ نور کا ہالہ بن کر فضاؤں میں اڑتا ہوا اس خوشی کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اسے سپنے میں ملی تھی۔ پھر پیر دستگیر کا شفقت بھرا ہاتھ ان کی کرم کی نظریں سب یاد کرتے کرتے اس پر وجد سا طاری ہو رہا تھا۔

لیکن نوراں کون ہے؟ اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ کہاں ہے؟ کچھ پتہ نہیں۔ وہ اسے ڈھونڈنے کہاں جائے؟ کدھر جائے؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ پیر دستگیر کہیں اونچے پہاڑ پر مقیم ہیں یا کس پہاڑ کو پیر دستگیر کا پہاڑ کہتے ہیں وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا۔

خیر! میں کیوں فکر کروں۔ پیر دستگیر نے منزل کی جھلک دکھائی ہے تو وہ خود ہی اس تک پہنچنے کے لئے میری راہنمائی بھی کریں گے۔ یہ سوچ کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔ پھر نوراں کا چہرہ اس کے تصور کی آنکھوں کے سامنے ابھرا اور اس کے ساتھ ہی سورج کی پہلی کرن اس کے تنبو میں داخل ہوئی۔

نوراں کہاں ہے، کون ہے، پیر دستگیر کہاں ہیں۔ اس قسم کے کئی سوال اس نے ایک ایک لفظ ادا کرتے ہوئے کرن سے ہی پوچھ ڈالے۔ پتہ نہیں کرن نے اس سے کیا کہا کہ وہ جلدی سے اٹھا اور کرن کا پلو تھام کر تنبو سے باہر آ گیا۔ گھاٹی میں دور دور تک بکھری ہوئی نئی نئی گھاس اسے دن کے سفر پر گامزن کرنے کے لئے اس کے دل میں امنگ بھر رہی تھی۔

اس دن نوراں، مکی کی روٹی، تھوں کا سالن، اچار اور گڑ کی ڈھیلی ایک پوٹلی میں باندھ کر باڑے سے بھیڑوں کا ریوڑ لے کر چلی تو آگے آگے چلنے والا مینڈھا منہ اٹھائے پتہ نہیں کدھر کا کدھر چلا جا رہا تھا۔ نوراں خود تو رات کے سپنے میں کھوئی تھی جب چلتے چلتے کافی

دیر ہو گئی تو نوراں نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔

"یہ ہم کدھر نکل آئے؟" اس نے شی شی کر کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پتلی سی چھمک کو گھماتے ہوئے کہا اور بھاگ کر ریوڑ کے آگے پہنچی۔ اس نے دیکھا کہ ریوڑ کے آگے آگے جانے والا مینڈھا اور کتے اب بھی اوپر کی طرف منہ اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ تھوڑی ہی اونچائی پر اڑتی ہوئی ایک چڑیا ان کی راہنمائی کر رہی تھی۔ اسنے سامنے نظر دوڑائی۔ پہاڑ کی جس چوٹی کی طرف وہ بڑھ رہے تھے، اس کی گھاس کی ہریاول جیسے اس کے ریوڑ کو عمدہ کھانے کی دعوت دے رہی تھی۔

"چلو آج ریوڑ کی عید ہو گئی" وہ من ہی من مسکرائی اور پھر اسے ایسا لگا جیسے یہ پہاڑ اس کا جانا پہچانا ہے۔

"ارے یہ وہی تو ہے جسے میں نے پچھلی رات سپنے میں دیکھا تھا۔" اس نے اچنبھے سے چاروں طرف دیکھا "شاید وہ ہے۔ شاید وہ نہیں ہے۔"

ابھی وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچی تھی کہ اس نے دیکھا کہ آگے آگے جانے والے مینڈھے نے گردن جھکا کر گھاس چرنی شروع کر دی تھی۔ اور اسکے ساتھ ہی اسکی باقی بھیڑیں بھی ادھر ادھر چاروں طرف بکھر کر جلدی جلدی گھاس میں منہ مار رہی تھیں۔ اس کے چاروں کتے دم ہلاتے ہوئے چاروں طرف جا کر دور بیٹھ گئے تھے۔ یعنی انہوں نے اپنی نگرانی میں بھیڑوں کی حد مقرر کر دی تھی جیسے کہہ رہے ہوں اس حد کے اندر اندر رہ کر جتنی گھاس چاہے چرو۔ اس سے باہر جانے کی کوشش نہ کرنا۔

تبھی نوراں کو خیال آیا۔ "وہ چڑیا کہاں گئی جو اس کے ریوڑ کے آگے آگے فضا میں اڑتی ہوئی اس کے ریوڑ کی... نہیں نہیں... اس کی راہنمائی کر رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو ماتھے پر پھیلاتے ہوئے آسمان میں نظر دوڑائی۔ وہ چڑیا کچھ دیر اس کے ریوڑ کے اوپر منڈراتی رہی اور پھر اس کے دیکھتے دیکھتے پہلے اس کے بہت قریب آکر اس کے سر کے عین اوپر پنکھ یوں پھڑ پھڑائے جیسے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہی ہو اور پھر اس نے

اونچی اڑان بھری اور سامنے والے پہاڑ کی طرف جاتی ہوئی بہت دیر تک اسے دکھائی دیتی رہی۔

چڑیا کا پیچھا کرتے کرتے اس نے دیکھا تو اسے پورا یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ وہی جگہ ہے جو اس نے پچھلی رات سپنے میں دیکھی تھی۔ اس نے ایک بار پھر چڑیا کی طرف دیکھا۔ وہ اب دور سے ہوا میں ایک نقطہ سا بنی دکھائی دے رہی تھی۔ نقطہ جو دھیرے دھیرے چھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے پل پل چھوٹے ہوئے نقطے کے نیچے دیکھا تو سامنے والے پہاڑ پر بھیڑوں کا کافی بڑا ریوڑ گھاس چر رہا تھا۔ اس ریوڑ کو دیکھ کر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ”ریوڑ ہے تو اس کا کوئی چرواہا بھی ہوگا“

”یا خدا۔ اگر اس ریوڑ کا چرواہا وہی سپنے والا نوجوان ہوا تو کیا ہوگا؟ یا پیر دستگیر۔ میں تو تیری پناہ میں ہوں۔ تم ہی میری راہنمائی کرنا۔ ہوں! میں بھی کیا کیا سوچ گئی؟ کیا سپنے کبھی اس طرح سچ ہوتے ہیں؟ ہوتے ہوں گے مجھے کیا پتہ؟

اور پھر اس نے وہاں دیکھا جہاں دونوں پہاڑوں کی گھاٹیاں ایک دوسری سے مل کر ایک ہو گئی تھیں۔ وہاں ایک چھوٹی سی جھیل میں پانی چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔

او! پیر دستگیر یہ تیری کیسی کرنی ہے۔ یہ تو ویسی ہی جھیل ہے جیسی میں نے سپنے میں دیکھی تھی، نہیں وہ تو بڑی جھیل تھی۔ یہ چھوٹی ہے۔ اچھا آنکھیں بند کر کے دیکھتی ہوں کہ یہ وہی جگہ ہے یا کوئی اور۔ آنکھیں بند کر کے ممکن ہے اسی سپنے کا منظر میری نظروں کے سامنے تیرنے لگے۔“ اس نے سوچا اور آنکھیں بند کر لیں۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو شکھر دوپہر ہو چکی تھی۔ اس بیچ وہ گہری نیند سوئی تھی۔ نیند میں اسے کوئی سپنا نہیں آیا تھا لیکن اس کی نیند بڑی پر سکون تھی۔ میٹھی نیند جوانی کی نیند جو اپنے آپ میں ایک سہانا خواب ہے۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ بھیڑوں کے پیٹ بھر چکے تھے، اور اب وہ منہ اٹھائے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ”انہیں پانی پینا ہوگا“۔ اس نے سوچا، انہیں نیچے جھیل کی طرف لے جانا چاہیے۔

وہ انگڑائی لے کر اٹھی تو اسکا دھیان اوپر کی طرف گیا"۔ ارے یہ اتنی ساری تتلیاں کہاں سے آکر میرے سر پر منڈرا رہی ہیں؟ ایک نہیں، دو نہیں، درجنوں تتلیاں، جھنڈ کا جھنڈ۔" اور اسے خیال آیا کہ رات کو سپنے میں جب اس کا وجود پھولوں کا بن گیا تھا تو بہت سی تتلیوں نے اس کے سر پر منڈرانا شروع کر دیا تھا۔ تو کیا اب پھر؟ نہیں نہیں، یہ تو پورے کا پورا ہا دمانس کا ہے۔ پھر یہ تتلیاں؟ تو کیا اب بھی انہیں میرے وجود سے سپنوں والے پھولوں کی خوشبو آرہی ہے۔ اس نے سوچا وہ اپنے آپ میں شرما گئی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

نوراں اپنے ریوڑ کے ساتھ جب جھیل کے کنارے پہنچی تو سامنے کی پہاڑی والا ریوڑ بھی دوسری طرف سے نیچے آرہا تھا۔ اس کا چرواہا جب قریب آیا تو اس نے پہچان لیا۔

یہ تو وہی سپنے والا نوجوان ہے۔ وہی نورانی چہرہ"۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔

"یا پیر دستگیر۔ تیرا یہ کیسا معجزہ ہے۔" زیر لب اس کے ہونٹوں پر یہی الفاظ تھے لیکن اس کے ہونٹ انہیں ادا نہیں کر پا رہے تھے۔

آنے والے نوجوان کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ہونٹ خاموش آنکھیں مسکراتی ہوئی۔ رات کے دیکھے ہوئے سپنے کو بار بار نظروں کے سامنے لاتی ہوئی۔

بولنے کی دونوں میں تاب نہیں تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور من ہی من مسکرا رہے تھے۔ ایسے میں دونوں نے اپنی اپنی کھانے کی پوٹلیاں کھولیں۔

"میں نے تمہیں رات کو سپنے میں دیکھا تھا۔" لڑکے نے ہمت کر کے کہا۔

"میں نے بھی" لڑکی نے جیسے نظروں ہی نظروں میں کہا۔

پھر کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔

"تم مجھے قبول کرو گی؟" لڑکے نے بڑی ہمت اکٹھی کر کے کہا۔

"لڑکی نے دونوں پوٹلیوں کی روٹیاں ایک جگہ اکٹھی کر دیں"۔

لڑکا سمجھ گیا کہ لڑکی نے ہاں کر دی ہے۔ اور وہ دونوں مل کر کھانا کھانے لگے۔

کھانا کھاتے ہوئے لڑکا رات میں دیکھے ہوئے سپنے کی تفصیل بتاتا رہا۔ اپنے دل کی کیفیت دہراتا رہا۔ لڑکی مند مند مسکراتی رہی اور ایک ایک بات کو سچا بتاتی رہی۔

پھر دونوں نے ایک دوسرے کو جب اپنے اپنے قبیلے کے نام بتائے تو دونوں کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے روٹی کے لقمے ہاتھ میں ہی پکڑے رہ گئے۔ وہ بٹ بٹ ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔

"اب؟" کافی دیر بعد لڑکے نے سوالیہ نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

لڑکی ادھر دیکھ رہی تھی جہاں دونوں ریوڑوں کی بھیڑیں گڈ مڈ ہو کر ایک ہی ریوڑ بن گئی تھیں اور دونوں کے کتے ایک دوسرے سے تھوتھنی ملائے دمیں ہلا رہے تھے۔

پیر دستگیر نے ہم دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے ملائے میں وہی مشکل کشا بن کر ہماری مدد کریں گے۔" لڑکے نے چلتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے اپنے کتوں کو اشارہ کیا تو کتوں کے آگے بڑھتے ہی اس کی بھیڑیں ان کے پیچھے ہولیں۔

اگلے دن دونوں قبیلے خون کی پیاسی فوجوں کی طرح ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ واقعات جس طرح رونما ہوئے تھے اس میں چونکہ پیر دستگیر کا ذکر آتا تھا اور اس پیر دستگیر میں دونوں کو اعتقاد تھا۔ اس لئے ابھی تک گولیاں نہیں چلی تھیں۔ تلواریں نیاموں سے باہر نہیں نکلی تھیں۔ ورنہ اب تک تو ان کے خون کی لالی جھیل کے تمام کناروں تک پہنچ گئی ہوتی۔

لیکن پیر دستگیر میں اعتقاد اپنی جگہ قائم مگر دونوں قبیلوں کی پرانی دشمنی بھی اپنی جگہ مسلم۔ اس لئے طے یہ ہوا تھا کہ لڑکا اور لڑکی جن کی وجہ سے یہ جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا ہے، ان دونوں کو ایک ہی چٹان پر ایک ساتھ بٹھا دیا جائے۔ لڑکی کو گولی لڑکے کی طرف سے ماری جائے اور لڑکے کو لڑکی والوں کی طرف سے۔ دونوں وار ایک بار، ایک ساتھ اور ایک ہی فاصلے سے ہوں گے۔ اگر اس طرح کوئی نبٹارہ ہو جاتا ہے تو......

آگے کی بات انہیں سوچنی ہی نہیں تھی۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ یہ جھگڑا اسی منزل پر دفن ہو جائے گا۔ دونوں کے پاس ایسے ایسے نشانے باز تھے جن کا نشانہ آج تک چوکا ہی نہیں تھا۔

دونوں دھڑوں کے چنے ہوئے نشانے باز جب اپنا اپنا نشانہ سادھ رہے تھے تو ایک پل کے لئے زندگی نے اپنی سانس روک لی۔ یہاں تک کہ ننھی ننھی رنگ برنگی تتلیوں نے بھی اپنے پنکھ سمیٹ لئے دور اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں سہم گئیں۔ قندروں کی محرابوں سے لٹکتی ہوئی برفیلی جھالروں سے موتی کے وہ قطرے جو پگھل پگھل کر قل قل کرتی ندی کی صورت زندگی کے بہاؤ کا حصہ بننے والے تھے، تھم سے گئے۔

پھر ایک ساتھ فضا میں موت کی بھیانک آوازیں ابھریں۔ ہوا میں ارتعاش پیدا ہوا اور دونوں قبیلوں کے لوگوں کی نظریں اس چٹان سے چپک کر رہ گئیں۔ جہاں لڑکا اور لڑکی نشانے چوک جانے کے بعد ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، چٹان پر یوں کھڑے مسکرا رہے تھے جیسے حضرت آدم اور حوا پہلی مرتبہ اس خطہ زمین پر قدم رکھ کر خوش ہوئے تھے۔

ہوا پھر سے رکنے لگی۔

برف کے موتی پگھل کر زندگی کی بہتی ہوئی ندی میں گر کر اچھلتے کودتے آن کی آن میں دور بہت دور نکل گئے۔

اور تتلیاں بھی پنکھ پھڑ پھڑاتی ہوئی ساری فضا میں بکھر گئیں۔

اس کے بعد دونوں قبیلے یوں بغل گیر ہوئے جیسے مختلف سمتوں سے آتے ہوئے پانی کے جھرنے ندی میں مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔

شادی کی دعوت میں جب ان ماہر نشانے بازوں سے یہ پوچھا گیا کہ ان کا نشانہ چوک کیسے گیا تو دونوں کا جواب تھا۔

جب پیار کی دنیا آباد ہو رہی ہو تو اس چوک کو چوک نہیں کہا جا سکتا۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ زندگی میں پہلی مرتبہ ہمارا نشانہ ٹھیک بیٹھا ہے۔ ☆☆

پکشی نہیں لوٹا

پاکستان کا وہ گاؤں جہاں میں پیدا ہوا، پلا، بڑھا، وہاں بشیر نام کا ایک پاگل ہوا کرتا تھا۔ اس پاگل کی ایک خاص بات یہ تھی کہ جب کبھی اسے عاجز کرنے کے لئے کوئی یہ کہہ دیتا کہ پکشی نہیں لوٹا تو وہ برنوں کے جھنڈ کے نیچے جا کر ناچنا شروع کر دیتا اور اس وقت تک ناچتا رہتا جب تک وہ بے سدھ ہو کر گر نہ پڑتا۔ اس کے بعد بے سدھ پڑے پڑے اسے گھنٹوں ہوش نہ آتی۔

اس کے پیچھے ایک سانحہ بھی ہے۔

برنوں کے جھنڈ کے سائے میں جہاں گاؤں کے لوگ دوپہر کے وقت چوسر کھیلا کرتے تھے۔ وہاں ایک دن چڑیا کا ایک بوٹ اپنے گھونسلے سے زمین پر گر پڑا۔ اب اتفاق سے بشیر کی اس پر نظر پڑی تو اس نے بوٹ کو اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور لوگوں کی توجہ بوٹ کی طرف کھینچنے کے لئے شور مچانے لگا۔ اب اسے بولنا تو آتا نہیں تھا۔ اس لئے اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

"آ۔ ہی۔ ہو۔ بو۔ ہو۔ ہو۔ . . . . "

وہ ہاہوبو بو کہتا ہوا اپنی ہتھیلی کو ہوا میں نچا رہا تھا تا کہ لوگ بوٹ کی طرف دیکھیں۔ اتنے میں کیا ہوا کہ چڑا اور چڑیا بھی اسی وقت لوٹ آئے۔ انہوں نے اپنے بوٹ کو بشیر کی ہتھیلی پر دیکھا تو وہ "چوں چوں چیں چیں کرتے ہوئے اس کے سر پر منڈلانے لگے۔ اب کیا تھا۔ آ۔ ای، ہو، بو اور ہوں کی آوازیں ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہوئیں تو یوں لگا کہ قیامت کے دہانے پر پہنچ کر ساری مخلوق موت کے شکنجے سے بچنے کے لئے آ۔ ای، چوں، چیں، ہا، ہو، بو، بو چیں کر رہی ہے۔ آوازوں کو کوئی نہیں سن رہا۔ اور بشیر اس مخلوق کو بچانے کے لئے الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اور وہ خود کو بے بس پا کر پاگل ہوا جا رہا ہے۔

بشیر اچھل کود کرتا ہوا شور مچا رہا تھا لیکن پاشے کا کھیل اس وقت غالباً ہار اور جیت کی" منزل پر تھا۔ اس لئے کھلاڑی اور تماش بین دونوں سات کوڑیوں سے ملنے والے گیارہ اور تیرہ کے چکر میں ایسے کھوئے تھے کہ کسی کا دھیان بشیر اور بشیر کی ہتھیلی پر رکھے بوٹ کی طرف نہیں گیا۔

ادھر سے نکلتے ہوئے میرا دھیان بشیر کی طرف گیا تو معاملے کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے میں نے جلدی سے بشیر کی ہتھیلی سے بوٹ کو اٹھا کر اپنی جیب میں رکھا اور پھر برنے کے پیڑ پر چڑھ کر اسے واپس گھونسلے میں لٹکا دیا تو چڑے اور چڑیا کو تو سکون ملا ہی پاگل بشیر کی بھی جان میں جان آئی اور مسکراہٹ سے اس کی باچھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

میں تو پیڑ سے اتر کر اپنے گھر چلا گیا۔ ایک آدھ گھنٹے بعد لوٹ کے ادھر آیا تو دیکھا کہ بشیر برنے کے نیچے جس پر پنچھیوں کا گھونسلہ تھا، بڑی گہری نیند سو رہا تھا سوتے میں بھی اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں، سوتے میں بھی وہ من ہی من سوچ رہا تھا کہ اس نے خضر بن کر دنیا کو قیامت سے بچا لیا ہے۔

اب زندگی کا یہ اصول ہے کہ کوئی خوشی دائمی نہیں ہوتی۔

قیامت کو ٹال کر حاصل کی جانے والی یہ خوشی بشیر کے لئے بھی وقتی ثابت ہوئی۔

وقت پاکر جب چڑیا کے بچے پنکھ مل جانے پر اڑ گئے تو ایک دن پھر بشیر نے دیکھا کہ شام کے دھندلکے میں چڑیا چیں چیں کرتی ہوئی برنوں کے جھنڈ کے اوپر منڈرا رہی ہے۔ چند ایک اور چڑیاں بھی شاید اس کی ہمدردی میں منڈراتی ہوئی اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ چڑیا جب تھک ہار کر اپنے گھونسلے میں آکر ادھر ادھر گردن گھماتی چیں چیں کرنے لگی تو بشیر پھر اس پیڑ کے نیچے آ، ای، ہا، ہو، چا، چوں، چیں کی آوازیں نکال کر لوگوں کا دھیان اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ لیکن کوئی وہاں تھا ہی نہیں۔ پاشے والی ٹولی کب کی بوریا بستر اٹھا کر گھر جا چکی تھی۔ پاس ہی سائیں جھنڈے شاہ کے مزار پر کوئی نیاز کی دیگ چڑھانے آیا تھا۔ اس لئے وہاں ڈھول بج رہا تھا۔ اس ڈھول کی تال پر گاؤں کے ننگ دھڑنگ بچے ناچ رہے تھے اور یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ فاتحہ پڑھنے والے کب سلام پھیریں اور پھر ان کو میٹھے چاول کھانے کو ملیں۔

ایسے موقعوں پر پاگل بشیر سب سے آگے رہتا ہے۔ وہ بھی ڈھول کی تھاپ پر ناچتا ہے اور پھر نیاز کے چاول اپنے چوگے کی گندی جھولی میں ڈلوا کر بہت خوش ہوتا ہے۔ اس کے کانوں میں بھی اس وقت ڈھول کی آواز پڑ رہی تھی ممکن ہے نیاز کے چاولوں کی خوشبو بھی اس تک پہنچ رہی ہو لیکن وہ تو دنیا کی ساری مٹھاس کے سکھ کو تج کر چڑیا کے سارے دکھ اور درد کو اپنے چوگے کی جھولی میں بھر کر آ، ی، ہا، ہو، چا، چوں، چیں کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔

مجھے ادھر سے نکلتے دیکھ کر وہ بھاگا ہوا میرے پاس آیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر چڑیا کے گھونسلے کی طرف بازو لہراتا ہوا بولا۔ آ، او، ای، چا، چوں، پچی، بو، او.....

میں نے چڑیا کو گھونسلے میں اکیلا دیکھا تو بشیر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "پکشی نہیں لوٹا" اسے کسی صیاد نے پکڑ لیا ہے یا پھر کسی باز نے... "میں نے کئی طرح سے بشیر کو سمجھانے کی کوشش کی۔ کہ پکشی کو کسی صیاد نے پکڑ لیا ہے اور اب وہ کبھی نہیں لوٹے گا۔ پتہ نہیں وہ کتنا سمجھا اور کتنا نہیں سمجھا۔ لیکن اتنا طے ہے کہ وہاں سے ہٹ کر وہ جھنڈے شاہ کے مزار پر گیا جہاں بچے اور بڑے سبھی نیاز کے میٹھے چاول کھا رہے تھے۔ جو کھا چکے تھے وہ ڈھول کے گرد گھیر اڈالے ناچ رہے تھے میں نے دیکھا کہ اس دن بشیر نے نیاز کے چاول نہیں

کھائے اور اس پر کیا پاگل پن سوار ہوا کہ ڈھول کی تھاپ پر اس نے جو ناچنا شروع کیا تو پھر ناچتا ہی چلا گیا۔ ناچتے ناچتے اس کی ناک کی غلاظت بہہ بہہ کر اس کے دونوں ہونٹوں کو تر کرتی ہوئی اس کی ٹھڈی تک آگئی۔ پونچھنے کی کوشش میں یہ غلاظت اس کے پورے چہرے پر بکھر گئی جہاں میل کی پرت چڑھی ہوئی تھی۔ اوپر سے پسینہ چوچو کر اسکا سارا چوغا بھیگ گیا۔ بہت لوگوں نے اسے ناچ سے باز رہنے کے لئے روکا۔ دو تین بار ڈھولچی نے ڈھول بجانا بند کر دیا۔ لیکن بشیر کے پاؤں نہیں رکنے تھے تو نہیں رکے۔ اور وہ رکے بھی تو اس وقت جب وہ تھک ہار کر بے ہوش ہو کر بے دم ہو کر زمین پر گر پڑا۔

اس کے بعد سے گاؤں میں کسی نے بشیر کو سوتے نہیں دیکھا۔

جب کبھی کسی کو شرارت سوجھتی ہے یا جب کبھی کوئی یہ چاہتا ہے کہ بشیر اپنا غلیظ وجود لئے اس کے پاس سے چلا جائے تو وہ کہتا ہے "پکشی نہیں لوٹا"

بس پھر کیا۔ بشیر کا پاگل پن اپنے پورے جوبن پر آجاتا اور وہ برنوں کے جھنڈ کے نیچے جاکر اتنا ناچتا اتنا ناچتا کہ آخر بے سدھ ہو کر گر پڑتا۔

اسی بشیر کا ایک اور قصہ آپ کو سنا کر اپنی بات ختم کرنا چاہتا ہوں۔

بات ان دنوں کی ہے جب ملک کی تقسیم کے وقت ہم پاکستان سے ہندوستان آرہے تھے۔ گاؤں سے دو تین میل چل کر ہم راوی کے پتن پر پہنچ گئے تھے۔ ایک بہت بڑی ناؤ ہمیں اس پار لانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ پاگل بشیر بھی ہم لوگوں کے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے۔ وہ تو یہ ہوا کہ جب مار دھاڑ کرنے والوں نے ہم لوگوں پر لاٹھیوں اور تلواروں سے حملہ کیا تو میں نے دیکھا کہ پاگل بشیر بھی سب سے الگ تھلگ کھڑا ہوا آ، ہی، او، چا، چوں، چیں کا راگ الاپتا ہوا میں یوں بازو لہرا رہا تھا جیسے وہ بھی کسی کو مارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس بات کا اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ مارنے والوں کو مار رہا تھا یا مرنے والوں کو۔ اتنے میں اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور آ، ای، ہا، ہو، چا، چو، چیں، ٹھا، ٹھیں کرتا ہوا میرے گرد یوں چکر کاٹنے لگا جیسے وہ مارنے والوں سے مجھے بچانا چاہتا ہو۔

جب میں ناؤ میں بیٹھ گیا اور ناؤ چلنے لگی تو مجھے ڈر ہوا کہ بشیر کہیں میرے لئے دریا میں چھلانگ ہی نہ لگا دے۔ اس وقت دریا کا پانی چڑھا ہوا تھا اور مجھے خطرہ تھا کہ وہ کہیں ڈوب کر مر نہ جائے۔ اس لئے میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کہہ دیا۔ "پکشی نہیں لوٹا"۔

بس اتنا سننا تھا کہ بشیر الٹے پاؤں گاؤں کی طرف لوٹ گیا۔

دریا پار کر کے میں نے تو ہندوستان کی راہ لی۔ مگر تصور ہی تصور میں جانتا تھا کہ بشیر گاؤں کے ہرنوں کے جھنڈ کے بیچ جا کر ناچتے ناچتے بے سدھ ہو کر گر پڑا ہو گا۔

ابھی چند سال پہلے تک اپنے ایک ہم جماعت سے میری خط و کتابت رہی ہے۔ اس کے خطوں میں جہاں اور لوگوں کا ذکر ہوتا وہاں بشیر کا ذکر بھی ہوتا تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ لکھا کہ میرے چلے آنے کے بعد بشیر میں ایک تبدیلی یہ آئی ہے کہ جب کبھی کوئی اسے عاجز کرنے کے لیے کہتا ہے کہ پکشی نہیں لوٹا تو وہ ہرنوں کے جھنڈ کے بجائے میرے گھر کے سامنے والے چبوترے پر جا کر ناچنا شروع کر دیتا ہے۔ ناچتے ناچتے اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنا سر میرے گھر کی دیوار یا چوکھٹ سے ٹکرا ٹکرا کر خود کو بھی زخمی کر لیتا ہے۔

اس کو اس خود ایذائی سے نجات دلانے کے لئے ایک بار گاؤں کے لوگ اسے سرحد کی چوکی پر بھی لے گئے۔ وہاں اسے میرے جیسا سکھ سپاہی دکھا کر کہا کہ دیکھو پکشی لوٹ آیا ہے۔

اسے دیکھ کر ایک مرتبہ تو اس کی آنکھیں دھوکا کھا گئیں اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھرنے ہی والی تھی کہ اس کی پاگل آنکھوں نے بھی یہ جان لیا کہ یہ دھوکا ہے جھوٹ ہے، فریب ہے اور آ، ای، او، ہا، ہو، چا، چو، چی کا نعرہ لگاتا ہوا وہ ایسا بھاگا ایسا بھاگا اور میرے گھر کے سامنے جا کر اتنا ناچا، اتنا ناچا کہ اس پاگل کی بے بسی پر ترس کھا کر گاؤں والوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

ادھر بہت سالوں سے میرے محسن کا کوئی خط نہیں آ رہا۔ اس لئے مجھے پتہ نہیں کہ بشیر زندہ ہے یا نہیں۔ اگر وہ مر بھی گیا ہے تو بھی میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے تصور میں تو زندہ

ہے ہی۔ اور ایسا نہیں کہ میرے مرنے کے بعد وہ زندہ نہیں رہے گا۔

مجھے یقین ہی نہیں مکمل اعتماد ہے کہ اگر راوی کے پاٹ کو وقت کا پاٹ مان لیا جائے، راوی کے بہاؤ کو وقت کا بہاؤ مان لیا جائے تو بھی پاگل بشیر کی آ، ای، ہا، ہو، جا، چی، ٹھا، ٹھی کی آوازیں قیامت کی حدوں کو پار کر کے خدا کی نئی مخلوق کے کانوں میں بلند آواز سے صدا دیں گی کہ اے خدا کے بندو تمہارے نظام میں کہیں ایسا نہ ہو کہ پنچھی اپنے گھروندے سے نکلے اور پھر جیتے جی کبھی لوٹ نہ پائے۔

چھلنی کے چھید

گیسو کو جب یہ پتہ چلا کہ اس کی بہو کے کفن دفن کے لئے دہلی کی مرکزی سرکار پانچ ہزار روپے بھیج رہی ہے تو وہ روتے روتے چپ ہو گیا۔ چپ ہی نہیں ہو گیا بلکہ اندر سے اس کا دل خوش ہو کر ہنس پڑا۔ دل ہنسا تو اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ اور چونکہ اس کی آنکھوں کے آنسو ابھی خشک نہیں ہوئے تھے، اس لئے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے گالوں کے اوپر پھیلتی ہوئی مسکراہٹ سے عمر بھر کی غریبی کی مار کھا کر مضحکہ خیز بن چکا اس کا چہرہ اور مضحکہ خیز ہو گیا۔

پہلے تو اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ مرکزی سرکار کیا ہوتی ہے اور جب سرپنچ کے دس بار سمجھانے پر بھی بات سمجھنے میں نہ آئی تو اس نے اس کے لئے سر کھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس کے لئے اتنا سمجھ لینا ہی کافی تھا کہ کوئی سرکار نام کا شخص اس کی بدحالی پر ترس کھا کر اس کی مری ہوئی بہو کا کریا کرم کرنے کے لئے پانچ ہزار روپے بھیج رہا ہے۔

''پانچ ہزار، پانچ ہزار کتنے ہووت ہیں ہو۔'' اس نے پاس بیٹھ کر رو رہے اپنے

بیٹے کو پوچھا۔

مادھواب بھی بھائیں بھائیں کرتا رو رہا تھا۔ بلکہ جب اس نے اپنے باپو کو چپ ہوئے دیکھا تو اس خیال سے کہ ایک جنے کے رونے سے رحم دل لوگوں کے دل پسیجنے میں کوئی کمی نہ رہ جائے اس نے اس کے حصے کا بھی رونے کے لئے اور زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

"پانچ ہزار مل تو رہے ہیں۔ اب کاہے روئے جارہا ہے۔" گھیسو نے بیٹے کو یوں چپ کرانے کی کوشش کی جیسے وہ دونوں مری ہوئی بھویا بیوی کے لئے نہیں بلکہ پانچ ہزار روپے کی کمائی کرنے کے لئے رورہے تھے۔

"میں نے پوچھا تھا۔ پانچ ہزار کتنے ہوتے ہیں۔" گیسو نے ایک مرتبہ پھر بیٹے سے پوچھا۔

پانچ ہزار کا نام سن کر بیٹا اور بوکھلا گیا۔ اس نے من ہی من میں حساب لگانے کی بھی کوشش کی کہ کتنے پیسے ہوں تو پانچ ہزار ہو جائے گا۔ اور جب وہ پانچ بیسی سے آگے نہ سوچ پایا تو اپنی مور کھتا کو چھپانے کے لئے اور زور سے دھاڑ ماری۔ "او میاری۔ تو کاہے مر گئی۔ اب میں باپو کو کیسے بتاؤں کہ پانچ ہزار کتنے ہوتے ہیں؟" یہ کہتے ہوئے وہ پھو پھو کر کے اونچی آواز میں یوں رونے لگ پڑا جیسے اس کی بیوی اگر زندہ ہوتی تو وہ یہ بتا ہی دیتا کہ پانچ ہزار میں کتنے بیسی ہوتے ہیں۔

گیسو نے بیٹے کو ویسے ہی رونے دیا اور خود اٹھ کر سرپنچ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا جو گاؤں کے اور پنچوں کے ساتھ اسے یہ خبر سنانے آئے تھے۔

پانچ ہزار کب مل جائیں گے۔" گیسو نے یہ سوال پوچھا تو سرپنچ سے مگر اس کی نظریں دور افق سے ہوتے ہوئے گاؤں کی طرف آنے والے راستے کی طرف گھوم گئیں کہ شاید ادھر سے پیسہ لے کر آتا ہوا کوئی دکھائی دے جائے۔

"ارے اب دھیرج رکھو۔ سرکار نے کہا ہے تو کوئی نہ کوئی روپیہ لے کر

آوت ہوئی۔"

لیکن گیسو سے صبر نہیں ہو پا رہا تھا، اس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ غم غلط کرنے کے لئے اس کا دھیان بار بار گاؤں میں نئی نئی کھلی دیسی شراب کی دوکان کی طرف جا رہا تھا۔

گھبراؤ نہیں۔ سرپنچ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسہ دیا۔ تم خوش قسمت ہو کہ بھگوان نے تمہاری سن لی۔

مادھو کی انکھوں سے آنسو کی دھار بہہ نکلی۔ آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے اس نے سامنے زمین پر پڑی اپنی بیوی کی بے کفن لاش کی طرف دیکھا اور پانچ ہزار کے مل جانے کا خیال آتے ہی اسے اپنی مری ہوئی بیوی پر پیار آگیا۔ وہ اس سے چمٹ کر رونے لگا۔ اس نے اسے اتنے زور سے بھینچا کہ شاید اتنے زور سے اسے زندگی میں بھی نہ بھینچا ہوگا۔ پھر اچانک روپوں کے ملنے کی خوشی الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔ ہائے تو پہلے کیوں نہیں مر گئی ری۔" اور پھر جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے اس لئے وہ بولا "پانچ ہزار پہلے مل جاتے تو میں تیرا دوا دارو کرالیتا۔"

دارو کا لفظ منہ پر آتے ہی اس کا منہ پھیکا پھیکا ہو گیا۔ اسے لگا جیسے اس کا نشہ ٹوٹ رہا ہو۔ اس لئے بیوی کی لاش کو اسی طرح زمین پر لٹا کر پھر اونچی آواز میں اس نے جیسے ہوا سے پوچھا 'ہائے! روپیہ آنے میں کتنی دیر ہے۔ کوئی تو بتائے۔

لیکن پیسہ آنے میں کوئی دیر نہیں تھی۔ گیسو کی ضرورت کے مد نظر ساری کاروائی بڑی تیزی سے ہوئی تھی۔ طے یہ ہوا تھا کہ ڈھائی ہزار روپے دلی کی بڑی سرکار دے گی اور ڈھائی ہزار اس صوبے کی سرکار دے گی جس میں گیسو رہتا ہے۔ اعلان میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ سارا روپیہ مدد کے طور پر دیا جائے گا۔ قرض کے طور پر نہیں۔ یعنی گیسو کو اس میں سے کچھ بھی واپس نہیں کرنا ہے۔

جب تک یہ پیسہ گیسو کے پاس پہنچے تب تک گیسو کے لئے اور کوئی چارہ نہیں کہ روئے اور آہیں بھرے اور انتظار کرے۔ ایسے میں جب پیسہ آنے کی امید ہوتی ہے تو وہ اپنی

مری ہوئی بیوی کی طرف بڑے دلار بھری نظر سے دیکھتا ہے۔ سوچتا ہے کہ یہ تو بڑی لکشمی نکلی۔ مری مری بھی اس کی قسمت کھول گئی۔ پانچ ہزار پتہ نہیں کتنے ہوتے ہیں سسر۔ اتنا پیسہ تو عمر بھر کے لئے شراب پینے کے لئے کافی ہونا چاہئے۔ کون جانے کتنی شراب آئے گی۔ میں سارے پیسے کی شراب خرید کر اپنی کوٹھری میں رکھ لوں گا۔ لیکن اتنی جگہ کہاں ہے وہاں۔ بوتل تو شیشے کی ہوتی ہے کہیں ٹوٹ ٹاٹ گئیں تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔ نہیں میں یہ نقصان نہیں ہونے دوں گا۔ تھوڑی تھوڑی شراب خریدوں گا۔ دو دو چار چار بوتل۔ لیکن خریدوں گا تو تب جب پیسہ ملے گا۔ اور پیسہ سسر آ ہی نہیں رہا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر اٹھ کر گاؤں کی طرف آنے والی پگڈنڈی کی طرف دیکھا۔ دور دور تک جب اسے کوئی بھی آتا ہوا دکھائی نہ دیا تو اس نے سوچا۔ کہیں یہ سب جھوٹ ہی نہ ہو۔ یہ پنچ اور سرپنچ میرا تماشہ ہی نہ دیکھ رہے ہوں۔ ایک تو کمبخت بہو مر گئی۔ اوپر سے یہ سب لوگ میرا مذاق اڑا رہے ہیں کہ سرکار کریا کرم کرنے کیلئے پانچ ہزار بھیج رہی ہے۔ کیوں بھیج رہی ہے پہلے تو کبھی بھیجا نہیں کسی کو۔ پھر مجھی کو کیوں بھیج رہی ہے۔ اور اگر بھیج ہی رہی ہے تو پانچ کے دس بھیج دے۔ پانچ ہزار اور مل جائیں تو میں بھی مرنے کو تیار ہوں۔ ہاں تو میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ بہو کے مرنے پر پانچ ہزار کیوں بھیج ہری ہے۔ بہو میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ لگے میں بابو لگے ہیں۔ مادھو بول پڑا۔ ایک بار دھنیا جب میلے میں گئی تھی کنگھی پٹی کر کے اور لال پھولوں والی دھوتی پہن کر تو ایک شہری بابو کتنی دیر اس کے پیچھے پیچھے گھومتا رہا تھا۔ ویسے اب تو سسر مری ہوئی بھی اچھی لگ رہی تھی مجھے۔

لیکن سرکار کو بتایا کس نے کہ دھنیا مر گئی ہے۔ پنچ نے نہیں بتایا۔ سرپنچ نے نہیں بتایا۔ گاؤں والوں میں سے کسی نے نہیں بتایا۔ تو کیا جانے وہی بابو دھنیا کا پیچھا کرتا رہا ہو۔ اور اسی نے سرکار کو بتایا ہو۔ پھر بھی پتہ تو کیا جائے۔ اس خیال سے وہ اٹھا اور وہاں پہنچ گیا جہاں سرپنچ زمین پر بیٹھا گاؤں کے لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔

"کیوں سرپنچ سرکار کو بتایا کس نے کہ دھنیا مر گئی ہے۔

پنچ اور سر پنچ سب لوگ ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ سب چپ تھے۔

گیسو ویسے کا ویسا کھڑا خاموش نظروں سے اپنے سوال کے جواب کی امید کر رہا تھا اور من ہی من سوچ رہا تھا۔ پتہ نہیں سسر کس نے سرکار کو بتا دیا اور کیوں بتا دیا۔

ایسے میں جب گیسو کو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو اس کا دماغ گھوم جاتا ہے۔ اور دماغ جب گھوم جاتا ہے تو اسے لگتا ہے جیسے اس کا نشہ ٹوٹ رہا ہو۔ اور جب نشہ ٹوٹ رہا ہو تو اس کا انگ انگ درد کرنے لگتا ہے۔ اب کی اپنے انگوں میں اس نے درد محسوس کیا تو اس کا دل چاہا کہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔ ابھی اس نے رونے والا منہ بنایا ہی تھا کہ کسی نے کہا:

"میرے خیال میں یہ پریم چند کا کام ہے۔ وہی اس طرح کی باتیں لکھتا رہتا ہے۔

کون پریم چند؟ پاس بیٹھے ہوئے کسی آدمی نے ہی سوال کر دیا۔

ہوں۔ کوئی کایستھ بچہ ہے۔ اس کا اصلی نام دھنپت رائے کہت ہیں۔ لیکن پریم چند کے نام سے اس طرح کی باتیں لکھ کر پتہ نہیں کہاں کہاں بھیجتا رہتا ہے۔" یہ بات پتہ نہیں کس نے کہی۔

بے چارے گیسو کے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔ نام دھنپت رائے ہے تو سسر وہ پریم چند کیسے ہو گیا۔ اس کا دماغ پوری طرح چکر کھا گیا اور وہ دہاڑ مار کر رو پڑا۔ "ہائے میری دھنیا۔ ای پیرم چند کو ہے ری جو تیری گاتھا لکھ لکھ کر سرکار کو بھیجتا ہے۔

ابھی وہ پتہ نہیں اور کیا کیا کہتا کہ کوئی گھڑ سوار پگڈنڈی پر آتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے کوئی ہرکارہ ہاتھ میں بستہ پکڑے تیز تیز چلتا آ رہا تھا۔

سب گاؤں والوں کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ اور کسی کے منہ سے نکلا۔ سرکار کا آدمی پیسہ لے کر آ گیا۔

جیسے ہرکارہ گیسو کی مری ہوئی بہو کے کریا کرم کے لئے نہیں اس کے بیٹے مادھو کی

شادی کے لئے پیسہ لا رہا ہو۔ اسکا دل اندر ہی اندر ہنس پڑا۔ لیکن یہ موقع ہنسنے کا نہیں تھا۔ اسے سرکار کے آدمی کے سامنے رونے کا ڈھونگ رچانا تھا۔ اس لئے اس نے دہاڑ ماری۔ ''ہائے ری دھنیا تو ہمیں چھوڑ کر کس دیس کو سدھار گئی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پورا پوار ڈھونگ نہیں کر پایا۔ پیسہ ملنے کا اظہار ہو ہی گیا'' دیکھ ری دھنیا تو کتنی خوش قسمت ہے سرکار تیرے کریا کرم کے لئے پیسہ لے کر آ رہی ہے۔'' اور پھر وہ دھائیں دھائیں کر کے رو پڑا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی۔ لیکن آنسو بھری آنکھوں سے وہ سرکار کی طرف دیکھتا رہا جو گاؤں کے بنچوں اور سرپنچ کے بیچ گھرا اپنے جھولے سے کچھ کاغذ نکال رہا تھا۔

گیسو کو بلا کر ایک ٹکٹ لگے کاغذ پر سب کے سامنے انگوٹھا لگوایا گیا۔ پھر کفن دفن کی تیاری ہوئی۔ سرکار دو دو گز سفید کپڑوں کے دو ٹکڑے اپنے ساتھ لائے تھے۔ ایک کو لاش کے نیچے بچھایا گیا اور دوسرا اس کے اوپر۔ پھر لاش کو مولی کے دھاگے سے باندھ دیا گیا اور اسے شمسان میں لے جا کر اس کا داہ سنسکار کر دیا گیا۔۔ پھر سارے گاؤں والے شمسان سے واپس آئے تو گیسو کے گھر کے سامنے سب کو بٹھا کر ایک ایک بتاشے سے سب کا منہ جوٹھا کروا کر پانی پلا دیا گیا اور گیسو سے کہا کہ وہ تنکا توڑ کر اپنے سر کے اوپر سے پیچھے کی طرف پھینکے اور سب گاؤں والوں کے آگے ہاتھ جوڑ دے۔

گیسو کو یہ سب کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسنے یہ سب کچھ ایسے کیا جیسے مرا ہوا آدمی کر رہا ہو۔ اس کا دھیان تو اس بات میں لگا ہوا تھا کہ سرکار اسے پانچ ہزار روپیہ کب دیتی ہے۔ سارے دھرم کرم کرتے ہوئے وہ کنکھیوں سے باہر سے آئی سرکار کی طرف دیکھتا رہا کہ وہ کہیں چلی تو نہیں گئی ہے۔

سارے گاؤں والوں کے چلے جانے کے بعد صرف گاؤں کے پنچ اور سرپنچ رہ گئے یا پھر باہر سے آئی ہوئی سرکار۔ گیسو کو تو بس اسی سے مطلب تھا۔

تبھی سرکار نے جھولے میں ہاتھ ڈالا اور ایک ایک کے نوٹوں کی سو سو والی پانچ گڈیاں نکال کر گیسو کے ہاتھ میں رکھ دیں۔ گیسو کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ دل ہی دل میں

اس نے مرنے والی بہو کو دعائیں دیں کہ اسے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر ایک ساتھ اتنے پیسے دیکھنے کو ملے۔ گیسو نوٹوں کی گڈیوں کو اپنی ہتھیلی میں پکڑے سرکار کی طرف مشکور نظروں سے دیکھ ہی رہا تھا کہ سرپنچ نے آگے بڑھ کر گیسو سے کہا:

"ارے دیکھتا کیا ہے۔ سرکار کفن کا کپڑا اپنے پیسے سے لائے تھے۔ ان کی رقم تو لوٹا دے۔" یہ کہتے ہوئے سرپنچ نے نوٹوں کی ایک گڈی اٹھائی اور سرکار کو دے دی۔

گیسو کا دل بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں کتنے کم ہو گئے۔ چلو چار گڈی تو بچی ہیں۔" اس نے سوچا۔

تبھی سرپنچ نے ایک گڈی اٹھائی "یہ شمشان کی لکڑیوں کے پیسے" اور اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

تو بھی گاؤں والوں کو بھوج کرانے کا خرچہ لے لے۔" اس نے دوسرے پنچ کی طرف اشارہ کیا۔ اسنے بھی ایک گڈی اٹھالی۔

اب گیسو کے پاس دو گڈیاں بچی تھیں۔ سرپنچ نے گیسو کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔" دیکھو۔ سکھ دکھ آنی جانی چیز ہے۔ موت پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ تو پھر بھی خوش قسمت ہے کہ سرکار تیری مدد کو آگئی۔ نہیں تو تمہاری بہو کی لاش تمہاری جھونپڑی میں پڑی سڑتی رہتی۔ تمہیں اس کے لئے سرکار کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔

گیسو منہ سے تو کچھ نہ بول پایا۔ پھر بھی اس نے سرکار کی طرف یوں دیکھا جیسے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہو۔

"ارے بٹ بٹ کیا دیکھ رہا ہے۔ اس میں سے ایک گڈی سرکار کو آنے جانے کے خرچ کے لئے دے دے۔ پھر بھی ضرورت پڑنے پر کام آئیں گے۔ اور اسنے خود ہی اٹھ کر ایک گڈی اٹھا کر سرکار کو دے دی" اور پھر گیسو کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "اب اس گڈی کو جلدی سے جیب میں رکھ لو اور سنو۔ سارے پیسے کی شراب نہ پی جانا۔ یاد رکھو۔ نربدا جی پھول پرواہ کرنے جانا ہے۔ وہاں بھی کچھ خرچہ پانی تو ہو گا ہی۔

گیسو نربدا میں پھول پرواہ کر کے لوٹتا ہوا مجھ سے ٹکرا گیا اور پوچھنے لگا۔ ''بابو پانچ ہزار کتنے ہووت ہیں۔''

''ڈھائی سو بیسی'' میں نے حساب لگا کر بتایا۔

اب بیسی کے آگے کی گنتی ہو تو گیسو جیسے لوگوں کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اس لئے اس نے اپنی جیب سے سو کی گڈی نکالی۔ ابھی تک اسنے اس میں سے کچھ نہیں نکالا تھا۔ اور وہ گاؤں سے پیدل ہی نربدا تک چلا آیا تھا۔ ایک ایک کی سو کی گڈی دیکھ کر میں نے کہا کہ ایسی پچاس گڈیاں ہوں تو پانچ ہزار ہوتا ہے۔

پھر اس کو حساب میں بوکھلائے دیکھ کر میں نے بتایا۔ تمہاری گڈی میں پانچ بیسیاں ہوتی ہیں اس لئے ایسی پچاس گڈیاں ہوں تو تب جا کر.....

لیکن ان سسروں نے تو مجھے پانچ ہزار کے نام پر صرف پانچ گڈیاں ہی دی تھیں۔

میں نے دیکھا۔ یہ کہتے ہوئے گیسو کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا جیسے اس نے پوری بوتل پی رکھی ہو یا پھر اسے شراب کی شدید طلب ہو رہی ہو۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔ تم بتا سکتے ہو کہ یہ دھنو کہاں رہتا ہے۔

''دھنو۔ کون دھنو؟''

''ارے وہی جون میرے جیسے لوگوں کے کفن دفن کے لئے سرکار کو لکھتا رہتا ہے۔

''میں نے کہا۔ تم پریم چند کی بات تو نہیں کر رہے؟''

''ہاں۔ ہاں۔ وہی۔ سنا ہے سرکار دربار کو لکھنے کے لئے اس نے اپنا نام بدل لیا ہے۔

''کیوں۔ اس سے کیا کام پڑ گیا؟''

''ارے یہی پوچھے کا ہے کہ اس نے سرکار کو پانچ ہزار کے لئے لکھا تھا یا.....''

''لکھا تو پانچ ہزار کے لئے ہی تھا۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟''

آج کل پریم چند خود نہیں لکھتے۔ ان کے لکھائے پڑھائے چیلے لکھتے ہیں۔ یہ خط میں نے لکھا تھا۔

''تو پھر یہ پانچ ہزار کا پانچ سو کیسے رہ گیا؟''

بات یہ ہے گیسو۔ سمندر سے چھلنی میں پانی بھر کر ریگستان کی طرف لے جانے کی کوشش کی جائے تو باقی کیا بچے گا۔ تم تو جانتے ہی ہو۔ چھلنی میں بہت چھید ہوتے ہیں۔

گیسو کا جیسے سارا نشہ ہرن ہو گیا ہو۔ جیسے وہ بے ہوشی کے عالم سے ہوش میں آرہا ہو۔ وہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اٹھا اور اس نے میرا گلا پکڑ لیا، تب تو ایک چھید تم بھی ہو سکتے ہو۔ بتاؤ تمہیں کتنا ملا۔

میں گیسو کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اسنے میرا گلا چھوڑا تو میں نے اس کے آگے شراب کی پوری بوتل رکھ دی۔ غصہ نہیں کرتے۔ لو، شراب پیو۔

لیکن اس نے شراب نہیں پی۔ بوتل کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اور غصے میں اٹھ کر یہ کہتے ہوئے چلا گیا کہ اب تو یہ سارے چھید بند کر کے ہی شراب کو ہاتھ لگاؤں گا۔

میرے کمرے سے ایک نیا گیسو باہر جا رہا تھا۔

گیسو کے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے تو بس ایسے ہی گیسو سے جھوٹ بول دیا تھا۔ آخر وہ خط سرکار کو لکھا تو پھر کس نے لکھا۔ یہ پتہ کرنا چاہیے۔

بعد میں پتہ یہ چلا کہ منشی پریم چند کی کہانی کفن پڑھ کر ہی سرکار نے حکم دیا تھا کہ مرنے والے کے کفن دفن کا انتظام سرکار کی طرف سے کر دیا جائے۔ روپیہ بھی منظور کر دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس پر عمل اب ہو پایا۔

اور سرکار کو گیسو کو ڈھونڈنے میں دقت یوں پیش نہیں آئی کیوں کہ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ گیسو جیسے لوگ ہمارے ملک کے ہر گاؤں میں آسانی سے مل جاتے ہیں۔

✓

"نور محمد کی بہشت"

نور محمد کے لئے ساری دنیا جموں کے ہرے بھرے میدانی علاقے سے لے کر گل کی سر سبز پہاڑیوں تک ہی محدود تھی۔

وہ گرمیوں میں اپنا ریوڑ لے کر کبھی چناب اور کبھی سندھ کے کنارے کنارے چلتے ہوئے کرگل کی اونچی آسمان کو چھوتی ہوئی، پہاڑیوں تک لے جاتا ہے اور پھر سردیاں آنے سے پہلے پہلے واپس میدانی علاقے میں اتر آتا ہے۔

اپنے اس علاقے کے چپے چپے کے تمام نشیب و فراز سے وہ پوری طرح واقف ہے اور اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ لیکن اس علاقے سے باہر جو دنیا آباد ہے اس سے نور محمد بالکل ناآشنا ہے۔

ایک بار نور محمد کو کسی نے بتایا کہ آگرے میں ایک بڑی خوبصورت عمارت ہے تاج محل، جو سفید سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ اسے ایک بادشاہ نے اپنی بیگم کی یاد میں بنوایا تھا۔ بتانے والے نے نور محمد کو یہ بھی بتایا تھا کہ دنیا بھر میں ایسی خوبصورت

عمارت اور کوئی نہیں ہے۔ اس لئے لوگ اسے دور دور سے دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔

نور محمد کے لئے مگر اس میں کوئی دلچسپی والی بات نہیں تھی، اس لئے وہ اس سیلانی کی بات کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دے رہا تھا۔

تبھی سیلانی نے بتایا کہ چاندنی راتوں میں تاج محل تو تاج محل، اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے ہری بھری گھاس سے بھرے ہوئے لان بھی بڑے خوبصورت ہو جاتے ہیں اور لوگ اس نرم نرم گھاس پر بیٹھ کر ساری ساری رات گزار دیتے ہیں۔

ہری ہری گھاس کی بات سن کر نور محمد کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔

''اگر وہاں ہری گھاس بھی موجود ہے تب تو اپنے ریوڑ کے ساتھ وہاں جایا جا سکتا ہے''

''وہاں تمہیں ریوڑ چرانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔

سیلانی کی یہ بات سن کر نور محمد کی آنکھیں بجھ گئیں اور اس کے لئے تاج محل ایک بے معنی سی چیز ہو گیا۔

اس رات نور محمد نے ایک سپنا دیکھا۔ سپنے میں سفید رنگ کی ایک خوبصورت عمارت تھی جس کے چاروں طرف ہری گھاس کے میدان پھیلے ہوئے تھے ۔ وہاں اس کی بھیڑ بکریاں بڑے اطمینان سے گھاس چر رہی تھیں۔ اور وہ خود کسی پیڑ کے نیچے کھڑا عمارت کی طرف نہیں بلکہ بھیڑ بکریوں کو اتنی اچھی گھاس کھاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

سپنے میں حاصل کی ہوئی اس خوشی کی یاد کو برقرار رکھنے کیلئے نور محمد اگلے دن جس پہاڑی پر ریوڑ چرانے گیا اس کا نام اس نے تاج محل رکھ دیا۔ اس طرح تاج محل آگرے کی زمین سے پکشی کی طرح پنکھ لگا کر اڑا اور نور محمد کی دنیا میں آ کر بس گیا۔

اب ایک مرتبہ باہر کی دنیا کا نور محمد کی دنیا میں آنا شروع ہوا تو پھر یہ سلسلہ متواتر جاری رہا۔ نور محمد نے کسی پہاڑی کا نام اجنتا رکھ دیا تو کسی کا ایلورا۔ کوئی پہاڑی دلی

بن گیا جو ملک کا دار الخلافہ ہے اور کسی پہاڑ کا نام ممبئی ہو گیا، جہاں چلتی پھرتی تصوریوں والی فلمیں بنائی جاتی ہیں۔

آہستہ آہستہ نور محمد نے اپنی جانکاری کے مطابق باہر کی ساری دنیا کو اٹھا کر اپنی دھرتی پر لا بسایا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ نور محمد نے اپنی چھوٹی سی دنیا کو ہی اتنا بڑا اتنا چوڑا بنا لیا کہ باہر کی ساری دنیا اس میں رہنے کے لئے چلی آئی۔ سارے ریگستان، سارے سمندر، دنیا کے سارے ملک اور رنگ و نسل کے آدمی۔ شاید اسی لئے اب نور محمد اس دنیا کو چھوڑ کر اور کہیں جانا نہیں چاہتا۔ یہ دنیا اسے بڑی پیاری لگتی ہے جس میں وہ اپنے ریوڑ کی بھیڑ بکریوں کے پیچھے چلتے چلتے اس کی ہر پگڈنڈی ہر راستے ہر موڑ اور اونچ نیچ سے واقف ہے۔ اسے تو یہ تک معلوم تھا کہ فلاں پیڑ پچھلی دفعہ پودا ہی تھا اور اب کی پودا پیڑ بن گیا ہو گا اور اس پر بور بھی آگیا ہو گا ۔ پیڑوں، راستوں یا پہاڑوں کی چٹانوں کی تو بات ہی چھوڑیئے کئی جنگلی جانوروں اور اڑنے والے پکشیوں سے اس کی ذاتی جان پہچان سی ہو گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ پہاڑ کی فلاں گپھا میں ریچھ رہتا ہے اور اس کی ریچھنی نے اب کی بچے ضرور دیئے ہوں گے۔

نور محمد چاہے چناب کے کنارے بیٹھا ہو یا کسی پہاڑ کی گھاٹی میں کسی بڑی چٹان پر بیٹھا بانسری بجا رہا ہو، اس کا ذہن جہاں جانا چاہتا، دنیا کے جس حصے کو دیکھنے کا اس کا من کرتا وہی دنیا آن کی آن میں اس کی آنکھوں کے سامنے آموجود ہوتی۔ سمندر کی طرف دھیان جاتا تو سمندر میں جوار بھاٹا کی پہاڑ جیسی اونچی چھلیں اٹھنے لگتیں۔ نور محمد محسوس کرتا جیسے اس کے چاروں طرف پانی کی دیواریں کھڑی ہو گئی ہوں۔ اس وقت اسے زمین کہیں دکھائی نہ دیتی پانی میں بڑی بڑی مچھلیاں اور دوسرے جانور تیرتے ہوئے دکھائی دیتے تو وہ بہت دیر تک انہیں اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے دیکھتا ہوا لطف اندوز ہوتا رہتا۔ تبھی اچانک پانی کی ایک اونچی چھل آتی اور وہیں کہیں آکر گرتی جہاں اس کی بھیڑ بکریاں چر رہی ہوتیں۔ وہ جلدی سے نظر اٹھا کر دیکھتا۔ اپنی

بھیڑ بکریوں کو سمندر کی چھل سے محفوظ دیکھ کر وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا۔

اسی طرح کبھی کبھی ریگستان اس کے قریب آکر پھیل جاتا۔ تیز تیز ہوائیں چلنے لگتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ریت کا ایک بڑا سا تودہ ایک جگہ سے اڑ کر دوسری جگہ جا بیٹھتا۔ نور محمد اس وقت بھی گھوم کر اپنے ریوڑ کی طرف دیکھتا اور اسے صحیح سلامت پاکر اس کی جان میں جان آتی۔

ایسے موقعوں پر جب وہ شام کو اپنا ریوڑ لے کر اس گھاس پر پہنچتا جہاں اس کا سارا کارواں پڑاؤ ڈالے ہوتا تو دور سے جلتے ہوئے الاؤ کی روشنی کو دیکھ کر اسے ایسے لگتا جیسے وہ آگ اس کے وجود کے اندر روشن ہوا ٹھی ہو اور اپنے آپ کو جسم کے آر پار دیکھتے ہوئے اسے بڑی خوشی ہوتی اور کوئی لوک گیت اس کے ہونٹوں پر خود بخود بول بن کر پھوٹ پڑتا۔

ایک رات نور محمد کو عجیب و غریب سپنا آیا۔ وہ کیا دیکھتا ہے کہ دو فرشتے اس کے پاس آئے اور اسے لے کر انجانی سمتوں کی طرف لے چلے۔ اُسے اچھی طرح یاد ہے وہ ان فرشتوں کے دوش پر سوار اونچا ہی اونچا اٹھتا جارہا تھا۔ جہاں جاکر انہوں نے اسے اُتارا وہاں ہر طرف ہری مخملی گھاس کے فرش بچھے تھے۔ جہاں تک اس کی نظر جارہی تھی ہری گھاس ہی گھاس تھی۔ بیچ میں ایک دودھ کی ندی بھی بہہ رہی تھی اور اونچے اونچے پیڑوں کے ٹھنڈے سائے تو بڑے ہی خوشگوار تھے۔ قریب ہی کہیں سے میٹھے انوٹھے سنگیت کی مدھر آواز کانوں میں پڑ رہی تھی۔ یہ سب کچھ حیرانی سے دیکھتے ہوئے نور محمد نے پوچھ ہی لیا۔

''ہم کہاں ہیں۔ یہ کون سی دھرتی ہے؟''

''یہ بہشت ہے''۔ فرشتوں نے جواب دیا۔

''یہاں خدا رہتا ہے؟'' نور محمد نے پوچھا۔

''ہاں یہاں خدا رہتا ہے اور اب ہم لوگ خدا ہی کے پاس جارہے ہیں''۔

نور محمد زمین پر جھکا اور سجدے میں گر گیا۔ سجدے میں گرے گرے اس نے ہاتھوں سے اس نرم نرم گھاس کو چھو کر دیکھا تو اسے اپنے ریوڑ کی یاد آ گئی، اور وہ فوراً سجدے سے اٹھ کر پیچھے کی طرف مڑا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' فرشتے نے پوچھا۔

''اپنا ریوڑ لانے''۔

''یہاں ریوڑ لانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی''

''پھر یہ بہشت میرے کس کام کی''؟ نور محمد کے منہ سے نکلا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا سپنا ٹوٹ گیا۔ اس کی نیند کھل گئی۔

اگلے دن کسی پہاڑ پر ریوڑ چراتے ہوئے نور محمد کا دھیان پچھلی رات دیکھے ہوئے بہشت کے سپنے کی طرف چلا گیا۔ اس کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ سامنے ایک ٹک دیکھ رہا تھا کہ اس پہاڑ کی گود میں بہتے ہوئے نالے کے پانی پر اس کی نظر جم گئی۔ اسے لگا جیسے چھوٹی سی وہ ندی بہشت کی دودھ کی نہر سے ملتی جلتی ہو۔ وہاں سے ہٹ کر اس کی نظر چاروں طرف گھاس کا دوشالہ اوڑھے ہوئے پہاڑوں پر گئی۔ ہر طرف ہریاول ہی ہریاول تھی۔ نور محمد کی آنکھوں میں کچھ چمک پیدا ہوئی اور وہ سوچنے لگا ہو نہ ہو، یہ پہاڑ پر اگے ہوئے پیڑ فرشتے اور خدا کے نیک سیرت بندے ہی ہیں۔ قریب ہی کہیں کوئی پہاڑی جھرنا بھی کچھ ایسا ہی مدھر سنگیت پیدا کر رہا تھا جیسا اس نے بہشت کی فضا میں دیکھا تھا۔

ارے یہ تو ویسی ہی بہشت ہے جیسی میں نے رات سپنے میں دیکھی تھی۔ اور اسے لگا جیسے اس پہاڑ کے کن کن میں خدا کا نور جھلک رہا ہو۔ اسے ہوا میں پیڑوں میں ندی میں پہاڑوں کی چٹانوں میں ہر طرف خدا ہی خدا دکھائی دے رہا تھا۔

خدا کی بہشت کو اپنی دھرتی پر اترا ہوا دیکھ کر نور محمد فوراً سجدے میں گر گیا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنے لگا جس نے اپنی بہشت میں اسے بھیڑ بکریاں چرانے کی اجازت دے دی تھی۔ ☆☆☆

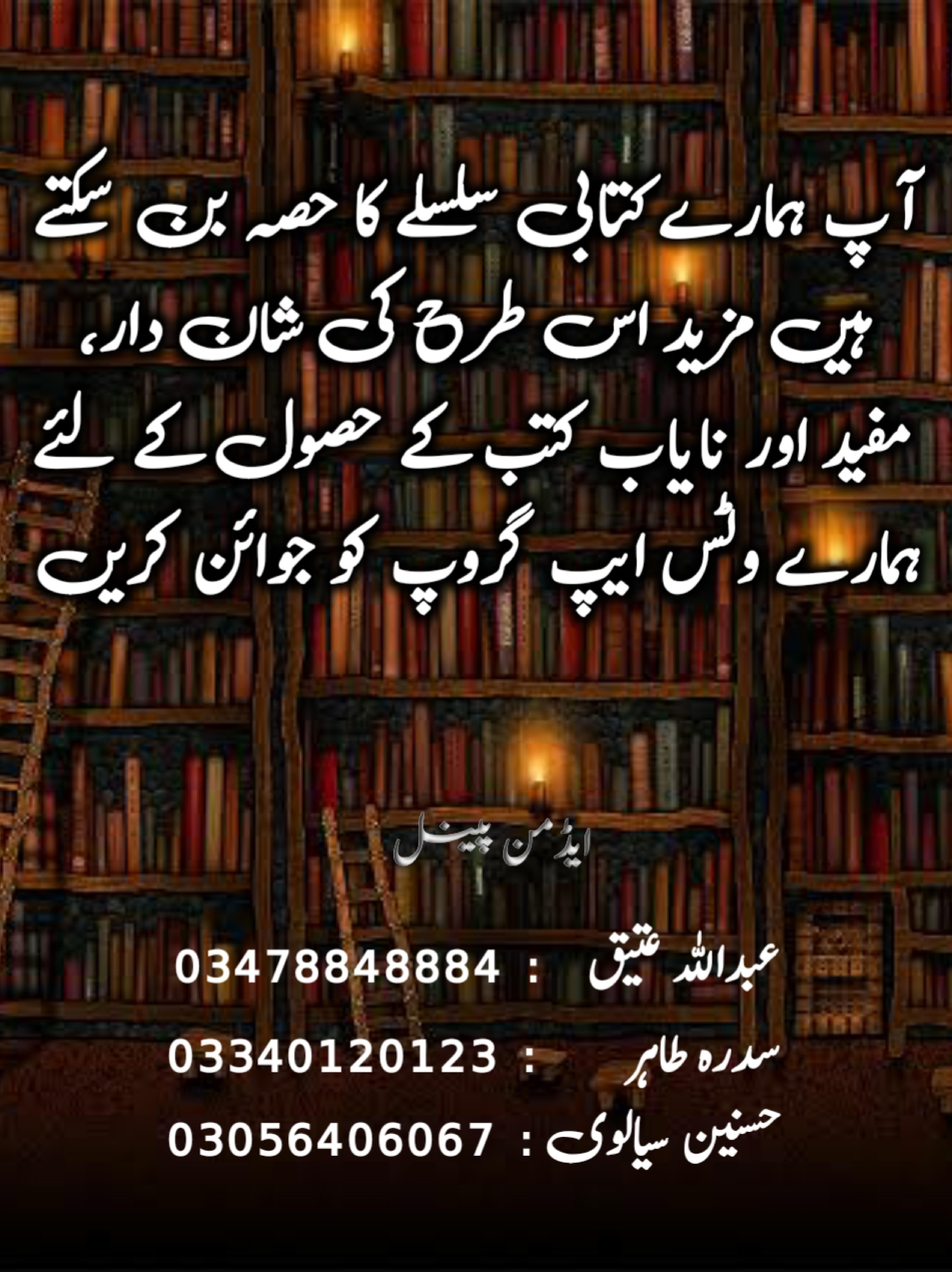
آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں
ایڈمن پینل
عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

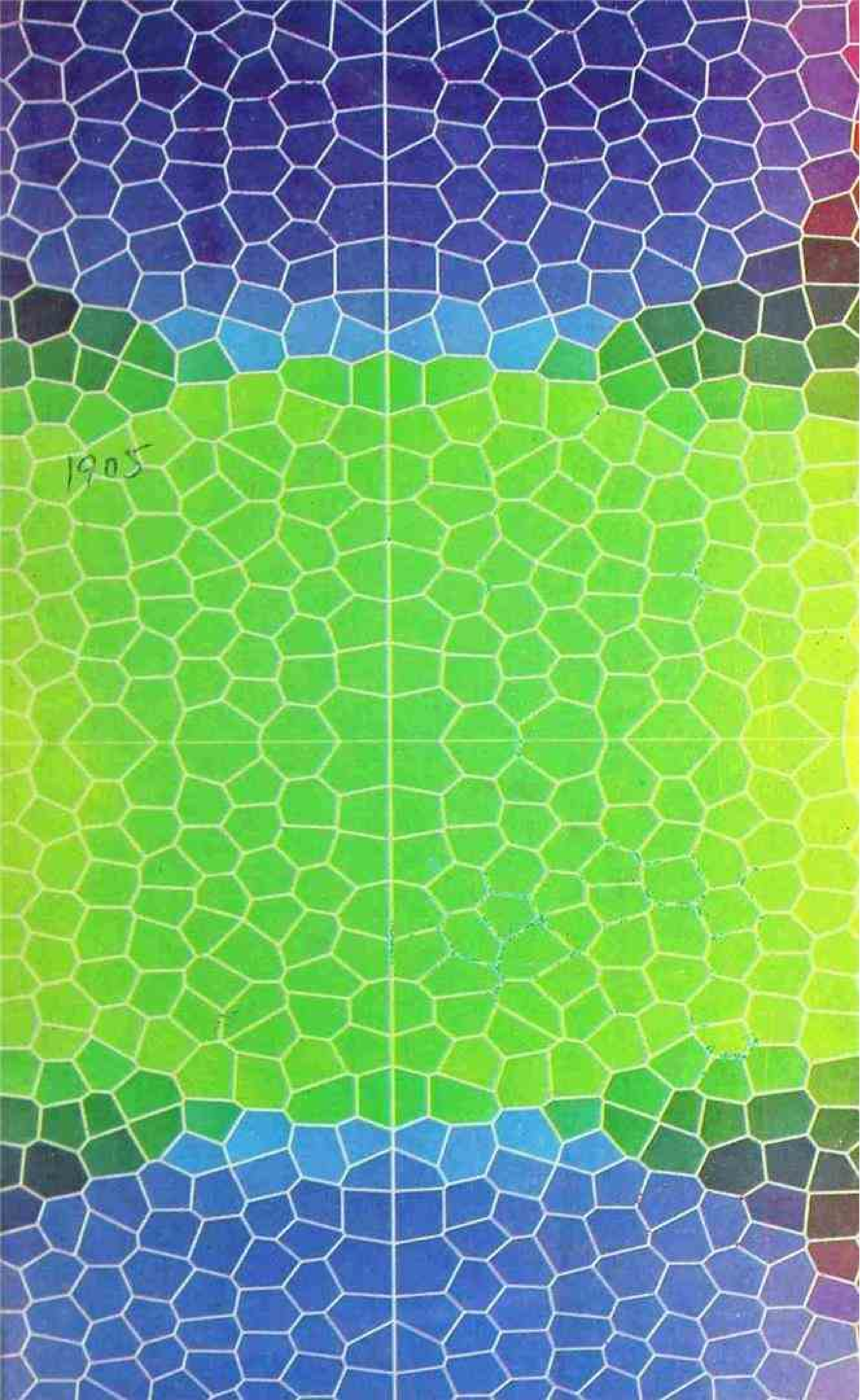
1905